

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

# سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2018

معاون  
معراج رسول

یوم آزادی مبارک  
میری اپنیان پاکستان

PakiBooks.Site



مدیر اعلیٰ  
عذرار رسول

مدیرہ  
نائب مدیر  
یمنی احمد  
اطھر حسین

مینجر اشتہارات  
محمد شہزاد خان  
0333-2256789

سرکولیشن مینجر  
سید منیر حسین  
0333-3285269

انشائیہ

جون ایلیا

07

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

08

سالوں پہلے لکھے گئے لفظوں کی  
اہمیت، جو آج بھی پورے اترتے ہیں  
سپنس کی مجلس مشاورت و دستارین کی تازہ  
شیریں باتیں گلے شکوے اور چٹا سوس مشورے

دھوکے باز

علی اختر

16

غیر ہم

تنویر ریاض

55

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار  
فرمانیہ کے سنی آموز اور عبرت آمیز واقعات  
سرخ رسانی میں معاون  
بن جانے والی ایک معمولی سی بات

رائگاں

مظہر سلیم ہاشمی

65

رنگ آسمان

ایاز رحیم

70

بریلی شاموں میں  
ایک خون آشام وروداد  
شرق مغرب کے عجیب استخرج اور تخیل پر مبنی  
کے عبرت آرا شاوٹوں میں لہریں لپکتے ستارے

نہلے پہلا

زبیر حسین

97

مقدس تصویر

شاہ زین رضوان

103

دھوکے بازوں کے آئینے میں روپ  
بدلتے مکاؤں کا دلچسپ قصہ  
بسنائی پاکیزگی کا پسیرا  
اوڑھے ایک چور کی کارست

انجائبر

ملک صفدر حیات

112

نرس

محمد الیاس

137

ایک اچھے ہوئے کیس اور  
بھٹکے ہوئے ترموں کا انجبا  
بدکرداری کی دلدل میں جکس  
جانے والی ایک نرس کی

قطعہ کہانی

منظر امام

139

مخفیل شعر سخن

قارئین

144

ہلکے جھلکے انداز میں زندگی کی حقیقت  
کو سمجھائی ایک پراثر تحریر  
آپ کے ہاتھوں ہی ایک نغمہ بن گئے  
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

بدعا

محمد فاروق انجم

147

وقت

حسام بٹ

160

کچھ حساس لمحوں کی گرفت میں  
قید ہونے والے لفظوں کا ماحبرا  
ایک عزم بازی کی بازی گری  
خیز واقعات پر مشتمل ایک طرباطیل داستان

بالآخر

ظفر اقبال ظفر

187

یتیم

ثمر عباس

193

موت سے خوفزدہ ایک سرریض  
کے کائنات تک خیالات کا اظہار  
کبھی نہ بچھڑنے والے رشتوں  
کی جدائی اور انوکھا ملاپ

حضرت موسیٰ

رضوانہ ساجد

203

شک

بابراعوان

215

مصر کی سرزمین پر فرعون  
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال  
ایک ایسا انداز پر جوش پولیس  
آفیسر کی باریک بین نگاہوں کا کمال

سنگین خاتمہ

نشور ہادی

230

کے گھر پر

ارادہ

\*

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل  
کرنے والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت اثر داستان  
دنیا بھرے ادھر اچھے لپٹے بھٹکے اقتیاس  
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کیلے



## سلا متی کسی راہ

صدیوں پہلے کتاب میں لکھا گیا۔  
 ”بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے، تاریکی ہو تو کیسی بری ہوگی۔“  
 چنانچہ اے شخص! اپنے بدن کے چراغ کو کام میں لا اور اپنے گرد و پیش پر نظر کر۔ دیکھ کہ زمانہ نئی بساط بچھاتا ہے اور نئے رنگ دکھاتا ہے اور اب جبکہ دشنام کی آندھیاں گزر چکیں اور چڑھی ہوئی کمائیں اتر چکیں، اپنی زبان کو اپنے دہن میں سلا دے اور کدورتوں کو دل سے بھلا دے۔

اور اے شخص! کیا تجھے یاد نہیں کہ لکھنے والے نے کتاب میں صدیوں پہلے لکھا تھا۔

”عیب جوئی نہ کر کہ تیری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔“

کیونکہ جس طرح تو عیب جوئی کرتا ہے، اسی طرح تیری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تو ناپتا ہے، اسی سے تیرے واسطے ناپا جائے گا۔

تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر بھی غور نہیں کرتا؟  
 اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا، میں تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟  
 اے شخص! آ..... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب ہم بہم ہوں تو ”ہم“ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہاں وہی ”ہم“ اپنی مڑھولیں، اپنی دشمنیوں کو نہ کریں۔ اپنے بھگڑوں کو اندھے کنوئیں میں دھکیلیں اور اپنے قفیوں کو گڑھے میں دفن کریں۔

اے شخص! آ..... کہ اب ہم اپنے تانکستانوں کی خبر لیں اور اپنی چراگا ہوں کو دیکھیں۔ ہم وہ سبیل ڈھونڈیں اور وہ راہ نکالیں کہ ہمارے کھیت فصلوں سے چھلک رہے ہوں اور ہمارے دسترخوان ہر نوع کے تر اور خشک میوؤں سے مہک رہے ہوں۔ ہماری پوشاک سونے کے تاروں سے کاڑھی جائے اور ہماری عورتیں لعل و گہر کی دمک سے شب چراغ ہوں۔ ہماری گلیوں میں خوشبوؤں کے کنڈرائڈیلے جائیں اور ہمارے محلوں میں خوشیاں بار پائیں۔

حکمت ہمارے ذہنوں میں جگہ بنائے اور خرد ہمارے فیصلوں کو راہ دکھائے، تاریکیاں ہماری بستیوں سے رخصت ہوں اور روشنیاں ہمارے قریوں کو جگمگائیں۔ ویرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی کو لبھائیں۔ لوٹنے والوں کے ڈیرے برباد ہوں اور انصاف کرنے والوں کے گھروں میں شادیاں بکسیں۔

امن ہمارے سروں پر آسمان بنے اور سلامتی ہمارے پیروں کے نیچے زمین ٹھہرے۔ ہمارے بچے بڑھاپے کی دہلیز کو لانگیں اور ہمارے جوان زندگی کو گھونٹ گھونٹ پئیں۔ ہماری کنواریاں اپنے گھروں کی ہوں اور ہماری بیاباہوں کے سہاگ سلامت رہیں۔

اے شخص! اب جبکہ تہمتوں کی چڑھی ہوئی ندیاں اتر چکیں اور طنر کے سارے تیر کند ہو چکے۔ آ..... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب تو اور میں بہم ہوں تو ”ہم“ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اے شخص! آ..... کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ پر چلیں اور ہمارے بعد کی نسلیں اور ان کے بعد ان کی نسلیں.....!





السلام علیکم! 2018ء کا فلوریب شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ لیجئے جناب وقت کی تیز رفتاری دیکھیے تین لسوں پر محیط تاریخ رقم کرتے ہوئے ہم اکہتر واں یوم آزادی منارہے ہیں۔ تمام اہالیان وطن کو جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو مگر جب اس طویل عرصے کی ترقی کا گراف دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنا وقت صرف نفسا نفسی کی نذر کر دیا اور یہ دھرتی جو ہماری مادری ملت ہے اس کی بقا اور روشن نام کے حوالے سے ہم اپنا حق صحیح طرح سے ادا نہ کر سکے۔ ہمیں بابائے قوم کا مآثر عظیم سے شرمندگی محسوس کرتی چاہیے کہ ان کے دیے ہوئے اس تحفے کی ہم پیار سے قدر نہ کر پائے۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اگر ہمیں اپنی کوتاہیوں اور نادانیوں کا احساس اور ادراک ہو جائے اور ہم ازالہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں تو کوئی شک نہیں یہی ملک دنیا کے نقشے پر ایک بھرپور اور کامیاب وطن کے طور پر جانا جائے۔ الحمد للہ اب بھی ہم کسی سے پیچھے نہیں تاہم اپنی خامیوں پر ہمیں خودی نظر پڑنی کی بھی اشد ضرورت ہے۔ پرچے کی اشاعت کے دوران ان ایکشن مہم پورے زور و شور کے ساتھ اپنے اختتامی مراحل کی جانب گامزن ہے۔ یہ تو وقت اور حالات ہی بتائیں گے کہ حکومت کس جاٹ کا شاخسانہ ہوگی یا مسافر و طاقت کا منبع۔ جو کچھ ہمیں نظر آ رہا ہے وہ ”کبھی کی اینٹ، کبھی کاروڑا، بھان بھٹی نے کنبہ جوڑا“ کی عملی تفسیر بن کر سامنے نہ آجائے۔ بہر حال اللہ سے اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔ ایکشن کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہوتا ہے کہ تمام قائدین کو کم از کم ان دنوں بڑی دردمندی کے ساتھ عوام کے بنیادی مسائل کا ادراک یہ بخونی ہو جاتا ہے جن کا اعتراض وہ اپنی ایکشن مہم کے دوران جگہ جگہ تقاریر اور تقاریر میں کرتے نظر آتے ہیں۔ اب یہ اور بات کہ سلیکشن کے بعد ان کا ان مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ بہت اچھا لگ رہا ہے آج کل جب لوگ اپنے بنیادی حقوق کی بات بلا خوف و خطر کرتے نظر آ رہے ہیں۔ تعلیم دو... دوٹ لو... پانی دو، بجلی دو... دوٹ لو... اور ووٹ کو عزت دو... کوئی صحت کے متعلق بات کر رہا ہے۔ کمال کے لوگ ہیں، کمال کی جملے بازی ہے اور بہت ہی باکمال وہ اشتہارات ہیں جو آج کل لاکھوں روپیہ لگا کر تیار کر کے میڈیا پر بار بار اشتہارات کے حوالے سے دیے جا رہے ہیں۔ اس وقت کوئی ڈراما اتنا اچھا نہیں لگ رہا جتنے اچھے یہ اشتہار سرگرمیوں کو اجاگر کرنے والے اشتہارات لگ رہے ہیں۔ مگر عوام کے مسائل کا حل صرف مسائل کی نشاندہی میں نہیں بلکہ اشتہارات کے بعد ان کی طرف بھرپور توجہ دینے میں مضمر ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یوں تو بجلی کے ٹھکے کی بے حس کے جھٹکے پورے ملک میں لگتے رہتے ہیں لیکن گزشتہ دنوں کراچی کے عوام کے لیے بجلی مزید اکہتر پیسے کی یونٹ منگنی کرنے کی منظور دے دی گئی ہے۔ دیکھیے اس ضمن میں کیا ہوتا ہے تو گویا یہی حقیقت ہے کہ چہروں کی تبدیلی سے نہیں اذہان کی تبدیلی سے معاشرہ میں انقلاب آتے ہیں امید ہے کہ اگلا شمارہ آنے تک سیاسی بساط کے حوالے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہوگا۔ قوم سے کیے گئے وعدے او وعدے پورے کرنے کے انتظامات ہوتے ہیں یا انہیں ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر کے خالصتاً ذاتی مفاد کے نظریات پر کام کرنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دنوں عاجزی کا مومنہ نظر آنے والے یہ خاکسار آنے والے دنوں میں عوام کے درد کا دوا کیسے بنتے ہیں۔ اچھے امیدیں اور اچھے خوابوں کا سندیسہ لے کر ذرا اب چلتے ہیں اپنی اس بزمِ دوستان کی جانب جہاں پیار اور خلوص کی سوغاتیں۔

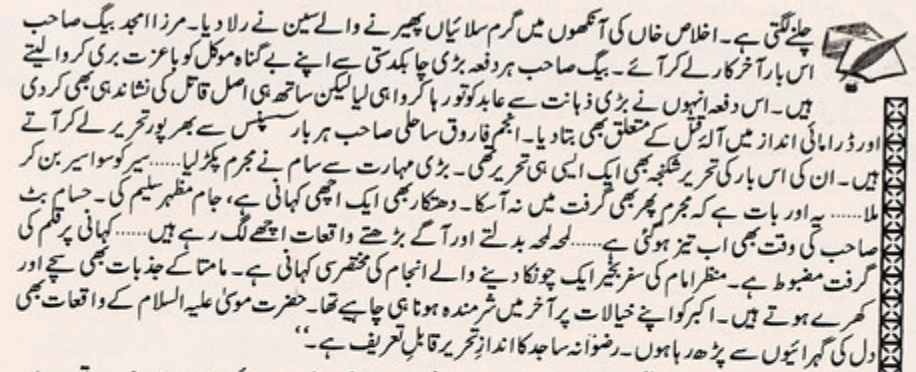
۱۰ محمد رفاقت، واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں ”میر اسلام قبول ہوا اور گزری ہوئی عید کی مبارک قبول ہو۔ رسالہ آتے ہی بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنی رائے دینے کی بھی جلدی ہوتی ہے کہ کہیں محفل میں شامل نہ ہونے والوں میں نہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کریں کہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہ گرم موسم کے دن وہ بھی روزے سے ہیں تو داد دیتا ہوں کہ ان لوگوں کو کہ روزوں میں سخت گرم دن اور سب سے بڑھ کر کھانا نہ ہونا، یہ کراچی والوں کی ہی ہمت ہے۔ اللہ ان کے روزے قبول کرے۔ آمین۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی کہانی نا اتفاقی، چاند نیابی کے متعلق تھی اور اس سے

اس وقت کے حالات بھی معلوم ہوئے، بہت اچھی کہانی ہے۔ اللہ ان کے قلم کو اور روانی عطا کرے۔ آمین۔ دوسری کہانیوں میں چور چائے شور، فریب آرزو، آخری باب، دھکار، باریک بین، سنگین خاتمہ، خوب کہانیاں ہیں۔ ویلہ محمد الیاس صاحب نے خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ کوئی بھی پیش خراب نہیں ہوتا، یہ سچ ہے۔ سفر بخیر میں منظر امام نے ایک منفرد کہانی پیش کی ہے۔ کچھ ایسی صورتیں ہوتی ہیں جن کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا، نہ ہی دل نکال سکتا ہے۔ پراسرار محافظ میں نادیہ نور صاحبہ نے قدرت کی مہربانی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ جب اللہ مدد کرنا چاہتا ہے تو کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیتا ہے۔ محفل شعر و سخن بھی اچھے شعروں سے سجی ہوئی تھی۔ آتے ہیں خط کی طرہ آپ میرا خط شائع کر دیتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سب لکھنے والوں کو میرا سلام قبول ہو۔ عبدالرؤف، چلکی ہیر، محمد شاہد بانواز، ”نئے لکھنے والے“، محمد صفدر، زرین خان آفریدی، رمضان پاشا، ادیس احمد خان، فضل، محمد میر سارگر، خلیق ربانی انجم، محمد ہمایوں تولی، طارق خان، محمد خواجہ اور ناہید یوسف سب نے سسپنس کی روش میں اپنا کیا۔ سب کو میری طرف سے بہت بہت عید مبارک قبول ہو۔ اس دفعہ ریاض بٹ..... کا خط محفل میں نہ تھا۔ ریاض صاحب سے گزارش ہے کہ وقت نکال کر خط ضرور لکھا کریں۔ آپ کا شعر پسند آیا۔“

۱۴ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ اس بار سنس عین موقع پر مارکیٹ میں آگیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ تین چھینوں کے بعد 19 تاریخ کو چرچہ بازار میں آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ (عیدی جو دینا بھی بھر کیے پر چرچہ لیٹ ہوتا) جولائی 2018ء کا سنس کا سرورق کافی پرکشش تھا۔ ذاکر بھائی نے بڑا اچھا ناسٹل بنایا، پوچھتا چاہتا ہوں کہ کیا ذاکر بھائی ابھی تک علیل ہیں یا رو بہ صحت ہو گئے ہیں؟ جنوں صاحب کا انشا بہت ہی پرمغز تھا، اسے سمجھنے کے لیے خاص دماغ کی ضرورت ہے اور اب کہانیوں پر تمبرہ۔ زویا اعجاز کی کہانی آخری باب بہت خوب تھی۔ ٹاپ کلاس کہانی کار کوچھی پیچھے چھوڑ دیا۔ شاباش زویا اعجاز..... رنگ آسمان بہت خوب، ایک کہانی میں دو کہانیاں چلانا ہر کہانی کار کا کام نہیں۔ اسے آرر اپنوت زندہ باد..... غریب آرزو و نہایت بور۔ کہانی وسیلہ کافی دلچپ تھی۔ آخر کار بیک صاحب کی کہانی ہمیشہ کی طرح ہی تھی، مگر زیر نظر کہانی میں ایک نئی جدت سامنے آئی۔ برف کا جگھر، کیا خوب..... انگلیف، تجسس اور سنس سے بھر پور کہانی تھی۔ لطف آگیا۔ دھکار کہانی اچھی تھی۔ حسام بٹ کا وقت بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے بٹ صاحب کی عمر بھی بڑی ہو جائے اور ہاں وہ جو باریک بین تھانا اس نے بھی بہت متاثر کیا۔ سفر بنجر اس کہانی کا عنوان امام خاں نے رکھتے تو اچھا تھا۔ پراسرار محافظ اس کہانی کو قتل تسلیم نہیں کرتی۔ (ہوئے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے جناب) سنگین خاتمہ پر تمبرہ اگلے ماہ..... اشعار کی محفل کے تمام ہی اشعار قابلِ داد تھے۔“

۱۰ ریاض بٹ، حسن ابدال سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ”ماہ جولائی کا عید کی میٹھی میٹھی خوشبو میں مہکا شمارہ 20 جون کو بے قرار لگا ہوں کے سامنے آیا۔ خوبصورت سرورق کا حامل شمارہ یک اسٹال پر چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمدرخ ہمیشہ کی طرح سوچ کے نئے درکھول رہا ہے۔ کچھ باتیں سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں اور اثر رکھتی ہیں۔ ایک ایک لفظ موتی میں تولنے کے قابل ہے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں قدم رکھا تو اپنا خط نہ پا کر انتہائی دکھ ہوا اور یہ دکھ اس بات کو یاد کر کے دو گنا ہو گیا کہ خط نمبر 22 مئی کو بخار میں پتے ہوئے لیٹر بکس تک پہنچا ہوا تھا۔ اس طرح لیٹ پہنچنے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ بہر حال سہنس سے تقریباً 35 سالہ رفاقت نے جوش مارا اور یہ خط لکھنے بیٹھ گئے۔ (بڑے دل کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں) محفل میں عبدالجبار رومی اس بار کرسی صدارت لے اڑے۔ ویل ڈن اور سہار کپا قبول کریں۔ خط کا ہر لفظ بول رہا ہے۔ خوبصورت اور مدلل تبصرہ ہے۔ طبیعی بہر کا خط بھی اچھے انداز میں لکھا، اس بار آپ کا خط بہت مختصر ہے۔ شاید نرین چھوٹنے کا ڈر تھا۔ خیر جو لکھا اچھا لکھا۔ محمد شاد نواز خوش آمدید محفل میں آئندہ بھی آتے رہیے گا۔ محمد صفدر معاویہ آپ کے خیالات اچھے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی بولی کون سنتا ہے؟ زہرین خان آفریدی اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلارہی ہیں۔ رمضان پاشا آپ کی ریکور انٹری اچھی لگتی ہے۔ اور یس احمد خان کا تبصرہ بھی جاندار ہے۔ ویسے صفحہ 4 کم کرنے والی بات ہمیں بھی اچھی نہیں لگ رہی۔ (کیا کریں مجبوری ہے) فضل عباس، بابر عباس آپ نے بڑا اچھا کیا کہ پرانے لوگوں کو آواز دے لی۔ ان کو اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر حاضری لگوانی چاہیے۔ بانی لوگوں کے خطوط بھی اچھے ہیں۔ اب بڑھتے ہیں اصل تبصرے کی طرف یعنی کہانیوں کی طرف۔ اس بار پھر تاریخی کہانی ناٹقانی ڈائلر ساجد امجد لے کر آئے۔ ڈائلر صاحب کیا خوب لکھتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے فلم سی

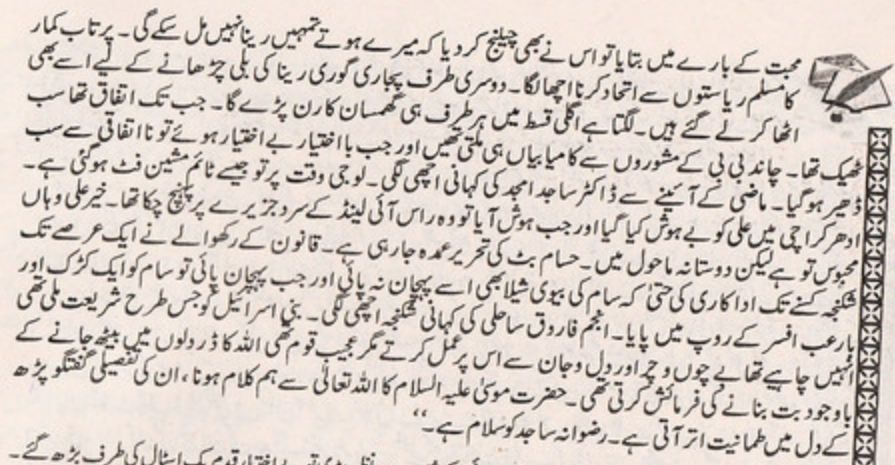




✽ ایمانے زار شاہ، اسلام آباد سے لکھتی ہیں ”جولائی کے سہنس کا انتظار 20 جون کو تمام شدہ ہوا اور جیسے ہی شاعر نے ہاتھوں میں کامیاب لینڈنگ کی تو فوراً اسے ٹائل کو دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ سمجھ آنے پر محفل کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اتنی خوشی سے ہر ماتبرہ کر کے میل کرتے ہیں تو انتظار و امید میں بقیہ ماہ گزارنا مشکل لگتا ہے لیکن تب دل ٹوٹ جاتا ہے جب آپ کی ای میل سرے سے غائب ہو۔ عبدالبجاری دہلوی پھر سے سب سے آگے کر سی سنبھالے نظر آئے۔ بہت بہت مبارک..... اتنا طویل و عریض تبرہ کیسے لکھ لیتے ہیں؟ ہمارے ہاتھ تو چند الفاظ لکھ کر جواب دے جاتے ہیں..... باہر عباس صاحب آپ جیسے جنات کو دکھ کر بھٹے مانس انسان یقیناً ڈر ہی جاتے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بھی کسی چڑیل زادی سے کم نہیں اس لیے اپنی خوشی بھی سے باہر نکل آئیں۔ چلی ہیرو اور زرین خان کے تبرے بھی خوب رہے۔ یہی دوتو صنفِ نازک ہیں جنہیں دیکھ کر ہر ماہ بھی اس اوکھلی میں سر دے دیتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے وقت کا مطالعہ کیا..... کوسپارڈو پر قسط رہی..... یقین کریں اس ایجنشن و تحریک کے انتظار میں بیٹھیں مگر کھوٹ پیے اسی لیے پھل میٹھا ہی ملا..... علی کو نہیں..... صرف ہم معصوم قارئین کو..... علی راں آئی لینڈ تو آپ پہنچ گئے لیکن ہڈیوں میں برف ہمارے جم رہی ہے..... اگر آپ اپنی مہم جو طبیعت سے باز نہ آئے تو فوراً سٹ بائٹ کا شکار ہو کر ذہن ہوجائیں گے.....! پٹنا کے منظر سے نپٹے پر سکھ کا سانس لیا۔ قسط کا اختتام بھی سہنس سے پھر پورا رہا۔ رنگِ آسمان ست رنگی کہانی ہے..... تال میل جوڑنے

عبدالغبار رومی انصاری کی آمد پورے والا سے ”عید مبارک، پر لطف لمحات میں خوش کن خیالوں میں ہستی مسکرائی خوبصورت لڑکی بہت ہی پیاری لگی۔ یوں سراپا نائل بے حد اچھا لگا۔ انسانیت زامانوں میں زندہ ہے اور رہے گی۔ ہمدرد دیکھیے اور ہمدردی جو بھی انسانیت کی قدر کرے۔ خوشی کے لمحات میں کچھ دیر غلوں کو بھلانا بھی اچھا ہے۔ وطن کے دیگر لوگ حالات میں دل تو رشتا ہے پر سب کا مل کے محفل سنا بھی اچھا ہے۔ اپنا نامہ اور صدارت دیکھ کر دل مطمئن ہو گیا اور ہستی مسکرائی چلی ہیر کا تمبر بھی مستار کن رہا۔ محمد رفاقت دل مطمئن نہیں اور تمبر مختصر؟ خیر ہمدرد نواز کی بھی خوب رہی پہلی جسامت محمد صفدر معاویہ کا تمبر بھی عمدہ رہا۔ زرین آفریدی گرل کا اترا نا بھی تو ادا ہے، شاید یہی ادا سب سے جدا ہے۔ واؤ رمضان پاشا! اور اس احمد خان تو عمدہ ہیں پر باربر عباس کو تو دیکھیں کبھی تو لڑکی تو بھی ماشہ امجد زبیر ساگر، طیف رانی انجم بھی خوب محفل زینت بنے ہیں۔ محمد ہمایوں تولی اور طارق خان بھی عمدہ تمبرے میں سب کے دوست بنے ہیں۔ محمد خواجہ کو کنگی ہر بار کی طرح زبردست رہی تمبرہ نگاری سخت گرمی میں گھری، ماہد یوسف کی بھی عمدہ رہی مہمانداری اور رانا جواد، بشری افضل، طاہرہ فخر اکو عرصہ ہوا آئے، کب لگا رہے ہیں اپنی باری؟ جس سے محبت ہو اسے واقعی منتظر نہیں کیا جاسکتا، پر نوشتا ہے اور زید کی محبت بھری زندگی میں زہر محل گیا زندگی میں نئے موڑ بھی آئیں گے۔ اب نشور ہادی کی کہانی کا سنگین خاتمہ کیونکر ہوگا یہ تو اگلی قسط میں پتا چلے گا..... عمدہ کہانی۔ پولیس سے زیادہ تجربہ رکھنے والے باریک بین ذہنین کو آزمانے لگے کہ زیادہ سے زیادہ اس نفل کیسے ہوں اور پھر جھوٹ موٹ کے قاتل سے بھی ایک لڑکی کا قتل سرزد ہو گیا۔ زبیر حسین کی کہانی باریک بین اچھی رہی۔ منظر امام کی دلچسپ کہانی میں اکبر کو ایک مالدار اور خوبصورت بیوی کے بجائے پیاری سی ماں مل گئی۔ سفر کچھ ٹھن ٹھن تو لگا لیکن بچہ گزر گیا۔ مختصر کہانی اچھی لگی۔ اچھے برے حالات انسان کی زندگی میں آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح آزمائش سے گزرتے بیگ صاحب کے موکل عابد تو رہا ہو گئے اور جرم کے ٹھنڈے میں کستا ہوا رؤف احمد پانی کے بنے آلے سے خدیجہ کو قتل کرنے کی وجہ سے دھرا لیا۔ آخر کار میں بیگ صاحب کی حیران کن تیاری اور جرح نے میں کارخ موڑ دیا، عمدہ کہانی۔ ذوی اعجاز کی کہانی آخری باب اخلاق احمد کے گرد گھومتی ٹھیک رہی۔ بچپن سے کوالفات نہ کرنے کی صورت میں بھیا کے صورت حال سے گزرنا پڑا۔ رنگ آسمان میں شوکت نے گارشا کو اپنی





کے دل میں طمانیت آتر آتی ہے۔ رضوانہ ساجد کو سلام ہے۔

۞ عہد یوسف کی پیش قدمی، اسلام آباد سے ”جولائی کے شمارے پر نظر پڑی تو بے اختیار قدم بک اسٹال کی طرف بڑھ گئے۔ حالانکہ پہلے ہی ڈیڑھ سو شاپر ہاتھ میں تھا مے چل رہے تھے مگر سپنس کی کشش نے ہمیں ساری شقت بھلا دی۔ جلدی سے سپنس حاصل کیا اور گھر کی راہ لی۔ ٹائل بہت پیارا لگا۔ خاتون کی معصومیت اور مسکراہٹ نے ہمیں اثر نکٹ کیا۔ خیر فہرست پر نگاہ دوڑائی اور سب سے پہلے منظر امام کی تحریر کو پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تبصرے سے پہلے تمام قارئین کو ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے ارکان کو عید مبارک، جی تو منظر امام کی سفر بیخبر پڑھی۔ واہ..... کیا جذبہ کی تحریر تھی۔ کہانی کے اینڈ پر آکھوں میں آسوا آگئے۔ واقعی ایک ماں پر روپ میں اپنی اولاد کو ہی ڈھونڈتی رہتی ہے۔ منظر امام نے راڈ والا۔ کہانی پڑھنے کے کافی دیر بعد تک ہم غمزدہ رہے۔ پھر پانی پیا اور وہ بے جا رہ واقعی قائل بن گیا، بہت خوب اوقت میں وقت لگا یا مگر کچھ خاص مزہ نہ آیا۔ پھر اپنے آپ سے آرا بہت کے رنگ آسار کی طرف۔ کہانی میں تجویزی تیزی آتی ہے تاہم ہماری رائے کے مطابق کہانی وہ رنگ نہیں جتنا پارٹی جو ایک ملے جو بڑا چاہیے۔ معذرت کے ساتھ۔ خیر رضوانہ ساجد کی تحریر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پڑھا۔ روح کو سکون ملا۔ کیا فصاحت آمیز واقعات ہیں..... بجان اللہ! آخر ساجد احمد کی نا اتفاقی میں تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ واقعی اتفاق میں برکت ہے اور نا اتفاقی ہمیشہ زوال کا قاتل ہے۔ تبخیر ریاض کی چور چائے شور کچھ خاص پسند نہیں آتی۔ ابوالفرح ہمایوں کی غریب آرزو اچھی کہانی تھی۔ گو کہ سب غیہ حقیقی سا لگا مگر انداز بیان اچھا تھا۔ دابرٹ کو اپنی عروا میں مل گئی۔ وہ بارہا تجدد و شیباب کے لیے اس نے غلط آدی کا انتخاب کر لیا۔ ویلٹن۔ زویا اعجاز کی آخری باب اچھی بلکہ بہترین کہانی تھی۔ بعض فحش قسمت ایسے ہی انسان کو نا کامی اور بدنامی کی طرف لے جا رہے۔ اخلاق اور زرقا کی محبت دیر سے سامنے آتی تاہم انہوں نے اپنی اپنی محبت کا اعتراف کر لیا۔ محمد الیاس کی ویلہ بھی میاں بنے۔ رشتے پر کبھی گئی اچھی تحریر تھی۔ نشور ہادی کی سنگین خاتمہ پڑھی۔ کہانی کچھ اچھی نہیں لگی۔ اچانک طلاق کا مطالبہ؟ پھر ڈر کر لیں..... وہ بھی ایسا کہ لوگوں کی جان لے ڈالنا، حقیقت سے دور کہانی لگی۔ نا دیہ نور کی پراسرار محافہ اچھی کہانی تھی۔ منظر سلیم دھکا کہانی تو اچھی تھی مگر راشد کے کھیلنے کے لیے کہے گئے الفاظ انتہائی کھلیے گئے۔ نہ ہی کوئی عورت دھکا ر ہوتی ہے نہ ہی اسے دھکا سامان..... یہ سب اپنی اپنی ذہنی سطح ہے کہ انسان کس طرح سوچے۔ عورت تو قابل احترام ہے۔ اس کے بارے میں اس طرح سوچنا اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ سامنے والے کی سوچ کبھی ہے۔ شاعری اچھی لگی۔ مرزا احمد بیگ کی آخر کار بس شیک تھی۔ خاص توجہ سے نہ پڑھ سکے۔ انجم فاروق کی کھینچہ بھی اچھی کہانی تھی۔ سام نے آخر میں خود پر چڑھایا ہوا ناول اتارا تو اس کی بیوی جارج دونوں دنک رہ گئے۔ مجموعی طور پر رسالہ اچھا تھا۔“

جارج دونوں دیکھ رہے تھے۔ بمبئی حور پر سارا دل چڑھا ہوا تھا۔

”عبداللہ معین کا شکوہ حیدر آباد سے ”سب سے پہلے تو ہماری طرف سے ادارہ وقار مبین کو عید مبارک - تاہم میں شکوہ ہے کہ ہم نے 3 ماہ میں تو اسے اور نام پر خط پوسٹ کیے مگر آپ نے ہمارے خط کو محفل میں شامل نہ کیا۔ ہمیں ابھی بھی ہوا کمزیر سوچ کر کشادہ آپ کو خط ہی نہ ملے ہوں، ممبر گھر گئے۔ اس دفعہ بھر کوشش کر رہے ہیں، دیکھتے ہیں محفل میں جگہ مل پاتی ہے کہ نہیں۔ خیر جون ایلانکا انشاء یہ پڑھ کر واقعی دل سے داد نکلی۔ سستی دور نہیں ہے اس میں۔ بر لفظ موفی کی طرح، حقیقت کا عکاس ہے۔ اس کے بعد“

۲۰۱۹ء

وقت کی طرف دوڑ لگائی۔ یہ کیا.....؟ علی کراچی سے ڈائریکٹ اتنی دور دراز آئی لینڈ پر پہنچا دیا گیا۔ کہانی تو اچھی ہے مگر ستم کا تعین نہیں ہو پا رہا کہ اوٹ کس کروٹ پیچھے گا اور پیر و صاحب کی مزاج کی رنگینی باطل اچھی نہیں لگ رہی۔ جدھر منہ اٹھتا ہے ادھر جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ پھر شارو سے محبت اور انیسیت کا دعویٰ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ خیر دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ منظر امام کی سفر خیر کہانی بہت بہت لاجواب رہی۔ اکبر کی سوچ بجلی تاہم جب ایک ماں کا روپ سامنے آیا تو اکبر سرتاپا لرز گیا۔ خود کو ملامت بھی کی۔ ویلڈن منظر امام صاحب۔ کہانی نے انھوں میں ہی مہر دی۔ واقعی ایک ماں کے لیے اولاد کی محبت زبردست ہوتی ہے اور اولاد کے نہ ہونے پر بھی وہ اپنے دل کو ٹپا دلا سے دیتی رہتی ہے اور اولادوں میں اسے شامتی ہے۔ نہ زیر حسن کی باریک بین فحاش مسک اسٹوری تھی۔ پرفیکٹسٹ کا گروپ..... ان کی سوچ، ان کا انداز بیان..... واؤ! کیا خوب ڈراما چایا مگر بے چارہ و کلین قافل بن گیا اور اپنی جان بچانے کے چکر میں ایک لڑکی کا قتل کر بیٹھا۔ بہت منفرد اینڈ یا تھا کہانی کا۔ بہت پسند آئی۔ ڈائریکٹر ساجد امجد کی نا اتفاقی پڑی۔ واقعی اتفاق کا کیا بیوں کا سبب بنتا ہے اور نا اتفاق سے تو ناکامی اور اختیار و اقتدار غرض ہر چیز چھن جاتی ہے۔ تاریخی سلسلہ اچھی کاوش ہے جس سے ہم پر اپنی تاریخ کے چھپے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور سبق بھی ملتا ہے۔ تنویر یاس کی چور چائے شور بس سوسوری۔ شور ہادی کی نگین خاتمہ کچھ عجیب سی کہانی لگی۔ زید کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہونا کچھ غیر فطری سا لگا۔ مانا کہ اسے نفسیاتی مسئلہ مگر معروف ادارے میں جاب کرتے ہوئے یہ سب ہونا سمجھ سے باہر ہے۔ جس کے ساتھ نفسیاتی مسائل ہوتے ہیں وہ روٹین کے ہر کام میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ خیر یہ تو رائٹر کی مرضی کہ وہ اپنے کردار کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ کہانی میں دم نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہم شوق سے پڑھتے ہیں۔ رضوانہ ساجد کی تحریر معلومات میں انسانے کا سبب اور راجہ انجمنی کا ذریعہ بنتی ہے۔ رضوانہ ساجد کولڈ سے ڈھیروں دعا لیں۔ ابوالفتح ہمایوں کی فریب آرزو کو کوہ حقیقت سے دوڑھتی تاہم کہانی اچھی لگی۔ رابرٹ نے اپنا شباب پایا یا مگر جب اسے دوبارہ شباب پانے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت پڑی تو ولیم نے رابرٹ کا قصہ پاک کر کے اس کی دولت تھمتھانے کا منصوبہ بنایا۔ ذوی اعجاز کی آخری باب بس ٹھیک رہی۔ کہانی میں اخلاق کے ساتھ جو ہوا، وہ کچھ زیادہ دکھایا گیا۔ اخلاق ہر جگہ پھشتار ہا اور نیک نامی ہر حرف آتا رہا مگر کسی نے اس کی سچائی جاننے کی کوشش نہ کی۔ خیر، رابرٹ صاحب جیسے چاہیں، واقعات کی ترتیب کریں۔ دھکار کہانی میں خاتون کے لیے مرد کے الفاظ تو نہیں گئے۔ ویلڈن کہانی بس ٹھیک رہی۔ مرزا امجد بیگ کی آخر کار میں سب سے اونکھا ”آلہ نقل“ لگا۔ کافی ایٹک سا لگا۔ برف کا ٹکڑا ویلڈن۔ نا دیو رکی پراسرار محافذ بھی اچھی کہانی تھی۔ انجم فاروق ساحلی کی ٹکٹہ نائل کہانی تھی۔ رنگ آسمان پہلے سے کافی بہتر ہوئی ہے اور اس کا ٹیپو بھی تیز ہے۔“

❦ زیرِ امان سلطان کی اردو بازار، کراچی میں شاندار حاضری..... ”ماہِ نعلِ گرل دیکھ کر جانے کیوں زبیدہ آپا کے ٹوکے یاد آ گئے جو اکثر وہ رنگ گودا کرنے کے لیے بتایا کرتی تھیں۔ چلیں کوئی بات نہیں، اس بار سانولی سلونی ہی کسی مگر کپڑوں کا کھری اچھا سا کر لیتے جو سانولی رنگت پر سوت کا تہو۔ بہر حال دل کو سمجھا سمجھا کر ذرا آگے بڑھے اور جون الیٹیا کی پرنگر اور پر مغز خرپر پڑھ کر دل کو کچھ شافی کی اور ساتھ ہی تھوڑا سا مال بھی کر ہم کیس اتنی گہری باتوں پر توجہ نہیں دے پاتے۔ بہت ہی خوبصورت بات کہی جون صاحب نے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ رہتی ہے۔ آگے بڑھے تو سجاد صاحب کی اتفاق سے نا اتفاق پڑی۔ اب سجاد صاحب کا انداز بیان بھی خاصا بدل گیا ہے۔ اس بار کہانی میں مرکزیت کا فقدان تھا۔ مختلف واقعات تھے۔ بہر حال معلومات کے حساب سے تو ابھی ریں مگر زیادہ مزہ نہیں آیا۔ تو ریں یا س کی چور حائے شور، مغربی معاشرے کی جاہلایوں کو نمایاں کر دیا۔ اے۔ اے۔ اے۔“

ہو گیا۔ ابوالفتح ہمایوں کی کہانی فریب آرزو نے تھوڑی دیر سوچنے پر بھجود کر دیا۔  
ہو جان تو اتنا رہے اور اس پر بھی بڑھا نہ آنے نہ مگر وائے ری قسمت کہ ایسا کب  
خوش ہو گیا۔ ویلڈن۔ رنگ آسمان کے رنگ اب دھیرے دھیرے ٹکھرتے جا رہے  
کے تانے بانے بن رہا ہے۔ اب دیکھیے آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ کسے اپنے مفقود مہر  
باب زو یا اعجاز کے خیالات کی روانی..... ہمیں کچھ تو سمجھ آئی اور کچھ سمجھ نہیں آئی  
اسے سارے ظلم اس پر ہوئے مگر خاموشی کا نقل نہ ٹوٹ سکا۔ آخر کیوں یہ تو کس  
کی انجیر میں جکڑی ہوئی ہے یہی کی زندگی گزار رہی ہو..... بچی زو یا بچی! ہمیں کس  
رہے۔ محمد الیاس کی وسیلہ ہے تو کچھ کچھ ہمارے ساموں اور چاچو کی زندگی کا کس دکھ  
آواز میں تو آئی ہی رہتی ہیں۔ لیکن بہتر بن جاتے ہیں وہ لوگ جو دوست بن کر صا





دیتے ہیں۔ مرزا احمد بیگ کی آخر کار پرچی تو احساس ہوا کہ عورت ذات کے بل کو بھٹا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انجی عورتوں میں سے ایک تھی۔ مگر قانون کے رکھوالے اگر صحیح معنوں میں اپنے فرائض ادا کرنے کی ٹھان لیں تو  
 کسی میں مجال نہیں کہ کسی بھی طرح پر جرائم کی آبیاری ہو سکے۔ انجمن قادیان قادیان کی گھنڈے تو چوڑا کر دیا۔ سپنس کی کہانیوں کی یہی  
 انفرادیت ہے کہ اس میں تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہر کہانی کا اپنا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ مجرم چاہے کتنا ہی شاطر ہو، اپنے انجام کو کھینچ ہی جاتا  
 ہے۔ محفل شعر و سخن کا ہر شعر معیاری اور با معنی ثابت ہوا۔ بہت خوب۔ جام مظہر سلیم کی تحریر دھکار نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دھکار اور  
 عمارت کے ساتھ کسی کا بھی جینا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ ویلڈن۔ وقت میں علی کی کارکناریوں نے اب رفتار بڑی ہے مگر اس کے باوجود  
 کہانی آگے بڑھنے کے بجائے ٹھہری ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ پیلز حسام صاحب! کہانی کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں۔ صرف ایک ہی  
 دائرے میں قید نہ رکھا کریں پوری قسط کو۔ منظر امام کی سفر بخیر بھی بہت اچھی لگی۔ کچھ لوگ ظاہری شخصیت سے وہ نہیں لگتے جو اندر سے ہوتے  
 ہیں۔ وہ بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ بہت خوب رہی۔ رضوانہ ساجد کے قلم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی معلومات میں اضافے کا سبب ہے۔  
 نادیہ نوری پر اسرار محافظہ بھی اگرچہ مشکل سے ہمہ ہوتی مگر دلچسپ کہانی لگی۔ عین خاتمہ پہلا حصہ پڑھا چاہا تو جاکر مگر دھار ہے لہذا مکمل تبصرہ  
 اس کے مکمل ہونے پر کریں گے۔

حسین علی کی پہلی کوشش سکھر سے ”سپنس ڈائجسٹ“ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر ہمیں مطالعے کا شوق نہیں تھا  
 اس لیے جو لوگ (ہمارے دوست احباب) سپنس پڑھتے تھے، ہم ان کو بہت نوکتے تھے کہ وہ کیسے آنکھیں گاڑ گاڑ کے کھٹکھٹوں  
 مطالعہ کر لیتے ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ دوسرے شہر رشتے داروں میں بہ سبب شادی جانا پڑ گیا۔ ہمارا کام کا مسئلہ تھا لہذا ہم مکہ  
 پر ہی ٹھہر گئے۔ رات میں جب کام سے فارغ ہو کر کھانا کھا کے فارغ ہوئے تو بورت کا احساس ہوا اب اچانک ہماری نظر سپنس  
 ڈائجسٹ پر پڑ گئی۔ ہم نے سوچا چلو تھوڑی دیر پڑھ کے دیکھتے ہیں کہ اس میں ایسا کیا ہے کہ دوست احباب اس کے من گاتے رہتے  
 ہیں۔ لیکن جی، ڈائجسٹ کھولا تو نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر پڑی۔ پڑھنا شروع کیا۔ روح تک معطر ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا  
 ایک ایک کر کے کہانیاں پڑھنا شروع کیں۔ سفر بخیر پڑھی۔ واہ جی! کیا اسٹوری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا حساب کچھ ہماری نظروں کے  
 سامنے چل رہا ہے۔ لا جواب کہانی تھی۔ ابوالفرح کی فریب آرزو پڑھی۔ عہد شباب کی واپسی پر جی اچھی تحریر تھی۔ بس پھر کیا تھا،  
 جلدی سے اٹھے اور اپنے لیے ایک کپ چائے بنا کر ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑ لیا اور عرق ریزی سے ورق گردانی شروع کر دی۔ جون  
 جوں پڑھتے جا رہے تھے، دلچسپی کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔ ہتھ پتا چلا کہ سب سپنس کے دیوانے کیوں ہیں۔ ٹھیک وجہ یہ کہ ہم نے  
 پہلی ہی مرتبہ کاغذ قلم لے کر آپ کو خط لکھ ڈالا۔ یوں تو سلسلے وار کہانیاں ہم سچ سے پڑھ رہے ہیں مگر پھر بھی پڑھ کے مزہ آ رہا ہے۔ سلسلے  
 وار کہانیوں میں پہلے وقت پڑھی۔ ہیر و صاحب کافی ڈھین ہیں اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی منطقی ضرورت لگاتے ہیں۔ کہانی اچھی لگی۔  
 ویلڈن حسام بہت صاحب۔ اسٹوری کافی جاندار ہے۔ اس کے بعد اے آر راجپوت کی رنگ آساں پڑھنا شروع کی۔ ہندوؤں کی  
 سازشی ذہنیت کا تو سب کو پتا ہے۔ کہانی میں بھی ہندوؤں کی سازشیں اور خفیہ طور پر لڑکیوں کی بی بی چاٹنا اور اقتدار کی ہوس..... غرض  
 ہر چیز کی خوبصورتی سے منظر کشی کی گئی ہے۔ گورے بہن بھائی کافی عیار ہیں جو ہمیشہ سے انگریزوں کا خاصہ رہا ہے۔ شو کی کو اس کی  
 محبوبہ سے دور کرنے کے لیے دونوں بہن بھائی سرگرم عمل ہیں۔ ادھر انگریزوں نے کوہ ثمالیہ کی ریاستوں پر چڑھائی کر دی ہے۔  
 مجاہدین کا گروپ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔ کہانی پڑھ کے تمام پورے دور ہو گئی۔ نشور ہادی کی عین خاتمہ پڑھی مگر  
 انہماک سے نہ پڑھ سکے۔ زویا اعجاز کی آخری باب بھی اچھی کہانی تھی۔ تاریخی کہانی نا اتفاق پڑھی اور کافی معلوماتی اور فصیح آئیز  
 لگی۔ واقعی جن قوموں میں اتفاق نہ ہو، وہ اپنا سب کچھ کھود دیتی ہیں۔ ویلڈن ساجد احمد۔ جام مظہر سلیم کی دھکار اچھی کہانی تھی مگر  
 عورت کے لیے اس طرح کے الفاظ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ محفل شعر و سخن نے بھی خوب مخطوط کیا۔ اشعار کا انتخاب معیاری تھا۔ زبیر  
 حسن کی باریک بین زبردست آئیڈیائی بہترین کہانی تھی۔ بیچارہ ڈکٹین پیکر میں پڑ گیا اور مجرم بن بیٹھا۔ نادیہ نوری پر اسرار محافظہ بھی  
 اچھی رہی۔ کہانی میں اسرار جیس تھا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ تویر ریاض کی چور چائے شور، مجھ الیاس کی وسیلہ اور انجمن قادیان قادیان کی  
 گھنڈے کہانیاں بس ٹھیک رہیں۔ یقین چاہیے ایک نشست میں تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں اور سپنس کے گرد یہ ہو گئے ہیں۔ محفل مخطوط  
 بھی اچھی ہے۔ امید ہے ہمارا پہلا خط محفل میں ضرور شامل کیا جائے گا۔

کوئی گری کرچی سے محمد آذین رضوان کی دلچسپ گفتگو ”جولائی 2018ء کا شمار بہت جاندار لگ۔ سب سے پہلے عین خاتمہ کو  
 پڑھ ڈالا مگر کیا، آخر میں آکر باقی اگلے ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ بہت مشکل ہوتا ہے جب آگے پڑھنے کی خواہش ہو اور انتظار کرنے پر  
 مجبور کر دیا گیا ہو۔ خیر جناب! اب کیا کیا جاسکتا ہے جو مزاج یار میں آئے..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں واقعات پڑھ



کر احساس ہوتا ہے کہ ہم کتنی خوش قسمت امت میں سے ہیں..... اللہ کے تمام پیغمبروں نے اللہ کے پیغام کو انسانوں تک  
 پہنچایا مگر اللہ کے بندوں میں صبر و استقامت کی ہمیشہ کی رہی اور بنی اسرائیل نے تو عہد غشی میں ریکارڈ قائم کیا جبکہ اللہ تعالیٰ  
 کی سب سے زیادہ نوازشیں اسی قوم پر ہیں مگر انفس..... ہمارے لیے عبرت کے در کھلے ہیں۔ اللہ ہمیں نیک ہدایت دے  
 (آمین) اس ماہ کی سب سے بہترین مختصر کہانی پر اسرار محافظہ لگی۔ بہت دلچسپ رہی ویلڈن نادیہ نور۔ باریک بین زبیر حسن کی تحریر نے  
 بھی چوکا دیا۔ ماشاء اللہ نام تو نے ہر کام میں ٹھیک ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ہمیں دلچسپ کہانیوں سے نوازی رہیں گی۔ حسام بیگ کی  
 وقت نے بھی اس بار نکال کر دیا۔ بس ایک خامی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ ایک قسط صرف اپنے ہی ماحول تک محدود رہتی ہے اس میں  
 کچھ نیا نہیں ہوتا۔ جیسے کہ پچھلی قسط میں اگر دھکاری کتوں سے بچنے کے لیے جو ترکیب اختیاری تھی بس اسی کے بارے میں بات چیت  
 چلتی رہی۔ وہی لباس، پسینے کی بو اور اس سے بچنے کے لیے مختلف پرفیومز کا استعمال..... کچھ نیا نہیں تھا۔ اس سے پوریت کا احساس  
 ہونے لگتا ہے۔ مظہر سلیم کی تحریر دھکار نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ٹھیک ہے اگر شریک سفر اذیت کا باعث بن جائے تو ہر انسان کو اپنی  
 زندگی کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حق ہے اگر اس لڑکی نے بھی ایسا قدم اٹھایا تھا تو کیا تمام عمر کے لیے دھکاری ہوئی عورت  
 کہلائے گی۔ بس یہی موڈ ہے سوچنے کا..... آخر کار بیگ صاحب کا دینگ انداز اور دلچسپ دلائل ہمیشہ عدالت میں سنسنی پیدا کرنے کا  
 باعث بن جاتے ہیں۔ رنگ آساں اب کچھ کچھ پور کر کے لگی ہے۔ ابھی تک مکمل کہانی کا مقصد سامنے نہیں آیا۔ بڑا ٹھنک انداز تحریر  
 ہے۔ کرداروں کی بھر مار ہے جس کی وجہ سے واقعات یا درکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی میں کٹیفون ہونے لگتی ہے۔ اس بار  
 ایک نیا نام ابوالفرح ہمایوں فریب آرزو کے نام سے انتہائی عجیب اور منفرد کہانی لائے۔ ہزاروں خواہشوں کے باوجود بھلا کوئی بڑا ہاپے  
 کی دلہیز سے واپس پلٹ کر بچپن اور پھر جوانی کی طرف کیسے جاسکتا ہے۔ بہر حال محفل ایک کہانی بھی کرا کھائے کیا۔ فریڈیک جولائی کا  
 پرچہ بہت جاندار اور شاندار لگا۔“ (سپنس سے آپ کی محبت اور پسندیدگی کا بے حد شکر ہے)

ناصر خان کی آمد کوئٹہ سے ”سپنس ڈائجسٹ“ کا دیدار ہوا تو کچھ جان میں جان آئی۔ ٹائٹل گرل کی خوبصورت مسکراہٹ  
 میں کھوے گئے۔ چہرے پر بھونچا تھا۔ ذاکر صاحب نے بہت اچھا ٹائٹل دیا اس دفعہ پھر خطوط کی محفل میں پہنچے اور تمام دوستوں  
 کے خطوط پڑھے۔ سوچا ہم بھی خط لکھیں، کیا پتا ہمیں بھی محفل میں جگہ مل جائے۔ خیر خط لکھ رہے ہیں آگے دیکھیں قسمت۔ ہمیں شدت  
 سے وقت کا انتظار ہوتا ہے۔ کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ علی ہر آواز میں پورا اثر رہا ہے۔ اب اسے اس آئی لینڈ پہنچا دیا گیا ہے۔  
 دیکھیں وہاں کیا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اے آر راجپوت کی رنگ آساں بھی نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہماری  
 رائے سے گزارش ہے کہ شو کی اور رینا کی شادی کروادیں۔ ان کے ایک ہونے سے کہانی کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جائے گا۔  
 نشور ہادی کی عین خاتمہ کے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پڑھا۔ رضوانہ ساجد کے لیے ڈھروں دعا میں۔  
 مرزا احمد بیگ کی آخر کار بہت ہی زبردست رہی۔ گل کا آلہ نہایت منفرد رہا۔ بہت جدا جدا لگا۔ انجمن قادیان قادیان کی گھنڈے بھی اچھی کہانی  
 تھی۔ منظر امام صاحب نے اس دفعہ دریا دیا۔ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کیسے تڑپتی ہے اور دوسرے چہروں میں اپنی اولاد کا چہرہ  
 تلاش کرتی ہے۔ اکبر بھی ایڈ میں ندامت سے شرمسار ہوا اور ماں کے جذبات دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ بہت خوب منظر صاحب۔ اس ماہ  
 کی چھوٹی کہانیوں میں سب سے بہت اسٹوری باریک بین رہی۔ فریکٹسٹ گروپ نے ڈکٹین کو خوب ابلوایا اور بالآخر اسے  
 پھینک دیا۔ کیا منفرد کہانی تھی۔ زبیر صاحب کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارکبادی جام مظہر سلیم کی دھکار بھی بہترین کہانی تھی۔ ڈاکٹر  
 ساجد احمد کی نا اتفاق بھی بہترین رہی۔ ٹھیک ہی بات ہے کہ اتفاق میں برکت ہے۔ چاندنی بی کے انجام پر دکھ ہوا۔ حالانکہ وہ غلط  
 نہیں تھی۔ چور چائے شور کچھ خاص رنگ نہ بھاسا۔ بورت کہانی تھی۔ ابوالفرح ہمایوں کی فریب آرزو زبردست رہی۔ دوبارہ سے  
 شباب پانے کی جستجو میں غلط محفل کا انتخاب کر لیا۔ رائٹر کا انداز بیان زبردست تھا۔ زویا اعجاز کی آخری باب کچھ خاص اچھی نہیں لگی۔  
 اخلاق کے ساتھ اتنا بھگیا مگر وہ اپنی سچائی ثابت نہ کر سکا..... حیرت ہے اور تو اور اس کے اہل خانہ نے بھی اس کے کردار کو نہ  
 سمجھا۔ کہانی کچھ غیر حقیقی سی لگی۔ اصل زندگی میں ایسے واقعات نہیں ہوتے شاید۔ کہانی کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس پر حقیقت کا  
 گماں ہو۔ خیر ہمارا مقصد مثبت تنقید ہے۔ زویا اعجاز صاحبہ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ انتائیہ ہمیشہ کی طرح ہمیں سوچنے کا ایک نیا زاویہ  
 دے گیا۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔  
 نادیہ خان، پشاور۔ نرغھم، کراچی۔ سنبل، حیدرآباد۔ مکان علی، سکھر۔ محمد رئیس، کراچی۔ عدنان سلیم، سرگودھا۔ نور الدین،  
 میرپور خاص۔ طارق خان، کوئٹہ۔ اویس کمال، حیدرآباد۔ اسامہ خان، نواب شاہ۔ اشعر علی، ملتان۔ عمران احمد چیموٹ۔



# دھوکے باز

علی اختر

دور کوئی بھی ہو... اختیارات میں رستا  
کشی اور محبت میں مکروفریب اپنی مثال آپ  
بنتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر واقعات بھی انتہائی گئے  
دنوں کی داستان رقم کر رہے ہیں جب انسان تہذیب  
و تمدن کے لحاظ سے بہت پیچھے تھا، سیکھنے کے مراحل  
سے گزرتے ہوئے عقل و شعور کی منازل طے کرتے ہوئے نئے  
معاشرے کی تشکیل و تزئین میں مصروف عمل تھا۔ ملک  
فارس جہاں جنگ و جدل سے برسرِ پیکار لوگ عجیب  
و غریب مذاہب اور دیگر معاشرتی رسوم میں جکڑے ہوئے  
انتہائی سخت قوانین کے زیرِ عتاب ایک مشکل زندگی گزارنے کے  
عادی تھے... وہاں عشق و محبت کی ایسی دلدوز داستانیں بھی  
ماضی کے ان صفحات پر لکھ دی گئیں جو آنے والی نسلوں کے لیے نہ  
صرف دلچسپی و حیرت کا باعث بنیں بلکہ ہمیشہ سبق آموز بھی رہیں  
گی۔ انہی میں سے ایک دھوکے باز عاشق کی محبت کا عبرت اثرانجام۔

ماضی کا آئینہ۔ اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

تین ریاستیں مل کر اہل فارس کی فوجوں کی امداد کو پہنچ جاتی  
تھیں اور سب مل کر یونانی حملہ آوروں کو شکست دے دیتی  
تھیں۔ اس دور میں ملک فارس بے پناہ فوجی طاقت کا حامل  
تھا۔ ارد گرد کی ساری ریاستیں اس کی فوجی قوت سے خوفزدہ  
رہتی تھیں۔ اس بار بھی ملک فارس کی فوجوں میں اس کا خاص

یونانی افواج نے 401 قبل مسیح ملک فارس کی  
ریاستوں کی موجودہ اور غار شاہ کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے ان پر  
حملہ کر دیا۔ اس وقت یونان بھی ملک فارس کی طرح چھوٹی  
چھوٹی ریاستوں میں بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کئی بار ایسی  
جنگیں یونانی ریاستوں میں برپا ہوتی تھیں تو کوئی ایک یا دو

PakiBooks.Site





## مکافاتِ عمل

جو رشتے جہیں تکلیف دیں ان سے دوری اختیار کرو۔ وہ خود لوٹ آئیں گے مگر اس وقت جب تمہارے دل سے اتر چکے ہوں گے کیونکہ وہ تمہاری قدر سے نہیں بلکہ پچھتاوے سے لوٹتے ہیں۔ جس کی دی ہوئی تکلیف سے تم آج دور رہو، وہ کل تمہارے پچھتاوے میں روئے گا۔

(شیخ عبدالقادر جیلانی)

مرسلہ۔ ریاضِ بٹ، حسن ابدال

جسید کے زمانے سے پہلے ملک فارس کے میدان جنگ میں لائچی اور پتھروں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے تلوار اور تیر ایجاد کیے۔ کھیتی باڑی، سوت کاٹنے کا فن ایجاد کیا جس سے کپڑے بننے کا رواج پیدا ہوا۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ جسید ہی وہ بادشاہ تھا جس نے دنیا میں آگ کی تعلیم و تشریح شروع کی اور اپنی رعایا کو بھی اس کی تعلیم و تکریم کی جانب رغبت دلائی۔ اس کے مطابق آگ روشنی میں سورج اور ستاروں سے مشابہ ہے اور چونکہ نور کو ظلمت پر بہر حال ترجیح ہے اس لیے نور قابلِ تعظیم ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے ناموں کی مناسبت سے قربت الہی کے حصول کے لیے نوری اشیا کی پرستش شروع کر دی۔ مذہب صابئین کو ماننے والوں کو حیرانی اور اس سے انحراف کرنے والوں کو کیماری کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شہر بھی تھا جو ملک فارس میں موجود تھا اور مسمیٰ یا پھر چین کے کچھ

کے نقشے میں بدحال ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتا اور لڑنا جھگڑنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ یہ کیورٹ ہی تھا جس نے لوگوں کو سکون اور خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے کی ہدایت کی چنانچہ انہوں نے مکمل طور پر کیورٹ کی ہدایات پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ کیورٹ بھی وقتاً فوقتاً اپنی حکیمانہ تقاریر کے ذریعے اہل فارس کے احوال کو درست کرتا رہا۔ اس نے نہ صرف گاؤں اور شہروں میں رہنے کے طریقے عوام کو سکھائے بلکہ اس کے زمانے میں شہر سازی کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ اس نے داماد اور بیٹے شہروں کی بنیاد رکھی۔ کیورٹ کا لقب پیشِ داد تھا۔ اسی وجہ سے جو بادشاہ اس خاندان میں گزرے ہیں انہیں پیشِ داد یاں کہتے ہیں۔ کیورٹ کی عمر کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے سو سال عمر پائی۔ اس کی مدتِ حکومت چالیس سال بتائی جاتی ہے۔ کیورٹ جب مرا تو اس وقت ملک فارس کی سرحدیں ہندوستان تک پہنچی ہوئی تھیں۔

کیورٹ کے بعد ظہورٹ ملک فارس کے تخت پر بیٹھا۔ وہ سائبر کا باشندہ تھا۔ اس کے زمانے میں ایک شخص ظاہر ہوا جس نے صابئہ مذہب کی بنیاد رکھی جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔ اس مذہب کے بانی کا یہ کہنا تھا کہ مکمل بزرگی، بلندی اور عزت و وقار کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی مسلسل اصلاح اگر کچھ ہے تو بلندی حیات میں ہے۔ ان ستاروں کے اثرات اہل دنیا پر ہوتے ہیں۔ سمندروں کی پیدائش اور ان کی غطیانی بھی انہی کے زیرِ اثر ہے۔ کچھ ضعیف الاعتقاد لوگ اس کے پیروکار ہو گئے۔

جب ظہورٹ کو قتل کر دیا گیا تو اس کا بھائی جسید تختِ فارس پر بیٹھ گیا۔ اصلً فارسی تھا۔ اس کے زمانے میں سرزمینِ فارس پر کثرت سے طوفان آئے۔ اس نے شہرِ اصرخر کی رکھی اور اپنے زمانے میں شہر شیراز سے 35 میل کے پر ایک سرے تعمیر کی جس کا نام تختِ جسید رکھا۔ اس زمانے میں علم موسیقی کی بنیاد رکھی گئی اور شراب بھی زمانے میں سب سے پہلے تیار ہوئی۔ اس نے پہلے وقت کو سال شمسی سے شمار کرنے کا طریقہ اپنا۔ جسید ہی تھا جس نے اپنے ملک فارس میں طوفانوں سے نجات ملنے پر سب سے پہلے رواج دیا جو آج تک چلا آرہا ہے۔ اس نے دیا اور بے شمار عمارتیں بنوائیں۔ اس نے کئی شہر بھی آباد کیے۔ وہ اپنے آپ کو برتر کہلوانا پسند کرتا تھا۔

میں آیا تو ان میں باہمی اختلافات، فساد اور لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ جنہیں منانے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے کیورٹ سے رجوع کیا اور اسے قوم کا سردار۔ یعنی بادشاہ تسلیم کر کے..... اسے تاج پہنادیا۔ لہذا فارس میں وہی پہلا شخص تھا جس نے تاج پہنا۔ اس نے قوم کے لباس میں مناسب ترامیم کیں۔ ملک کا نظام درست کیا اور سماجی و معاشی معاملات کو ایک نچ پر ڈالا اور دوسرے معاملات کو ایک عدل و انصاف فراہم کیا۔ جب اس طرح قوم کی اصلاح کا کام اس کے حسبِ مشائے لگا تو ایک روز اس کے دربار میں ایک خطیب نے اٹھ کر کہا۔

”بادشاہ سلامت! ہم خدا کی نعمتوں کا جتنا بھی شکر ادا کریں، وہ کم ہے۔ اس نے ہمیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہماری قوم ایک عرصے تک ویرانوں میں بھٹکتی رہی۔ ہم جانوروں کے غول کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے ہمیں رہنے کو جگہ عطا کی۔ ہمیں اپنی بھوک مٹانے کو غلہ دیا مگر اب بھی میرے خیال میں ایک چیز کی کمی ہے۔ اگر وہ پوری ہو جائے تو بلاشبہ ہم ایک نہ مٹنے والی قوم بن سکتے ہیں۔“

کیورٹ اس کی طرف فوراً متوجہ ہوا اور پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

”قوم کی سماجی و معاشی اصلاح کسی حد تک ہو چکی ہے اور باقی آئندہ ہوتی رہے گی لیکن ہمارے ہاں اب بھی ایک ایسی شے کی کمی ہے۔“ یہ کہہ کر خطیب خاموش ہو گیا تو کیورٹ نے جھپٹی سے بولا۔

”میرے محرم بات کھل کر کرو۔ میں نے اپنی دانست میں قوم کو راہِ راست اور انصاف و عدل پر لانے کے تمام حربے استعمال کر لیے اور مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ میری قوم نے میری باتوں کو پذیرائی بخشی اور میرے کہنے کو ہمیشہ پورا کیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟“ کیورٹ نے پوچھا۔

”جس چیز کی کمی رہ گئی ہے، وہ ایک باقاعدہ فکری ہے۔ کسی ملک کی حفاظت اور اس کے دفاع کے لیے لشکر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“ اتنا کہہ کر خطیب بیٹھ گیا۔ کیورٹ نے خطیب کی رائے سن کر اہل دربار سے خطیب کی پیش کردہ تجویز سے متعلق پوچھا تو اہل دربار نے اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ کیورٹ نے پہلی بار فارس میں لشکر کی تنظیم کی ابتدا کی۔ اہل فارس شروع سے ہی اصلً خانہ بدوش تھے اور ہمیشہ سے بے پروا رہے تھے۔ اس لیے جب وہ بھی درباری کھانے کے لیے بیٹھے تو بڑا شور مچا کرتے۔ اکثر شراب

گھوسواروں کا دستہ شامل تھا جسے پارٹین شوش کہا جاتا تھا۔ گھوسواروں کی جنگ جاری تھی کہ اچانک ملک فارس کے اس خاص فوجی دستے کے پاؤں اکھڑ گئے یا یہ ان کی جنگی حکمت عملی کی کوئی نئی چال تھی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس دستے کے سارے سواروں نے ایک دم سر پٹ بھاگتے گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ایک طرف کر لیں اور دونوں پاؤں ایک ہی رکاب پر رکھتے ہوئے اپنے چہرے دوبارہ یونانی فوجوں کی طرف موڑ لیے۔ انہوں نے گھوڑوں کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ اپنے پیروں سے گھوڑوں کو ایڑھ لگاتے ہوئے وہ پیچھے کی طرف ایک ہاتھ میں کمان لے کر دوسرے ہاتھ سے اپنی کمانوں سے تیروں کی بوچھاڑ یونانی فوجوں پر کرنے لگے۔ یونانی افواج کے لیے لڑائی کا یہ منفرد اور انوکھا طریقہ تھا جس نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ ملک فارس کے اسی دستے کی شہرت اور ان کے لڑنے کا انداز اس وقت بہت مشہور تھا، مزے کی بات یہ تھی کہ اس جنگ میں ملک فارس کا مشہور سپہ سالار سمبولیس اور اس کی بیوی بڈی براس بھی دوسری خواتین کے ساتھ مردوں کے برابر جنگ میں شریک تھیں اور وہ بھی مردوں کی طرح گھوڑوں پر بیٹھی تیروں کی بارش مخالف سپاہ پر برسا رہی تھیں۔ ملک فارس کے یہ وہی خانہ بدوش تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ 1500 قبلِ مسیح میں جو بھوک اور سردی سے تنگ آکر وسط ایشیا کے مرغزاروں سے آوارہ گردی کرتے ہوئے ملک فارس میں آن بے تھے اور ان کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں جا گزیں ہو چکا تھا۔ یہ لوگ خود کو آریا کہلاتے تھے۔ یہ مختلف گروہوں کی شکل میں ملک فارس کے ادھر ادھر کے علاقوں میں بکھر گئے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے سرداروں کے ناموں پر الگ الگ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنائی تھیں۔ ان میں میدین پارتھی ناختری۔ سعدی خوارزمی، مراعی اور پارسی شامل تھے۔ ان گروہوں کے سردار ہی ان کے بادشاہ یا حکمران تھے۔ اس وقت یہاں زرتشت اور صابئہ مذہب پھیلا ہوا تھا جو مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے۔ آگ، پانی، ہوا، طوفان، چاند سورج اور ستارے ان کے خالق اور پائین ہار تھے۔

ملک فارس اس وقت بہت بلند پایہ تہذیب و تمدن، مائے ناز معاشرت اور گران قدر تاریخ کا ملک جانا جاتا تھا۔ ان کا پہلا بادشاہ کیورٹ تھا جو کہ بلحاظِ عمر اپنے معاصرین میں سب سے بڑا تھا۔ اس وقت تک اہل فارس کا کوئی باقاعدہ فکری طور پر جب مختلف ریاستوں کا وجود



اور محرامیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اہل فارس کو بت پرستی اور ستاروں کے ساتھ پانی، مٹی، ہوا، روشنی، آگ کی عبادت کرتے جب ہمیں نذر میں تو ہندوستان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے بت پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کی تلقین کی۔ اسے ہندی اور چینی مہاتما بدھ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ سرزمین ہند سے پہلے سندھ کی طرف گیا پھر محفوظ جگہوں سے ہوتے ہوئے جب سرزمین فارس میں پہنچا تو اس وقت وہاں کا حکمران طہورث تھا مگر یہاں بھی تاریخ دانوں میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت فارس پر جشید کی حکومت تھی۔

☆☆☆

ضحاک ملک فارس کے بادشاہ جشید کا پوتا تھا جسے بیورا سب بھی کہا جاتا تھا مگر اہل عرب اسے ضحاک کہتے ہیں۔ اسی نے جشید کو قتل کیا تھا۔ جشید کے دور اقتدار ہی میں بغاوتوں اور سرکشی کی انتہا ہو چکی تھی۔ ضحاک وہ بادشاہ تھا جسے کیورٹ کی تربیت یافتہ قوم ملی اور جس کو جشید کی فہم و فراست نے ایک عظیم قوم بنا ڈالا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی والدہ کوئی عربی عورت تھی۔ ضحاک مذہب صائبہ (ستارہ پرستوں) کے حامیوں میں سے تھا اور مظاہر فطرت کا پیروں تھا۔

جب رعایا میں سے کوئی بادشاہ وقت کے پاس..... جاتا تو اپنے منہ کو رو مال سے ضرور ڈھانپ کر جاتا تھا کہ منہ سے نکلنے والی ہوا کی آلودگی بادشاہ وقت کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے نزدیک جب آدمی بیمار ہو جاتا تو وہ کسی مدد کے علاوہ کسی شفقت اور خصوصی توجہ کا حق نہ رہتا تھا بلکہ وہ قابل نفرت ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک بیماری اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ اس شخص پر بری قوت نے قابو پایا ہے۔ اس لیے قریبی رشتے دار بھی اسے نظر انداز کر دیتے اور اسے زندگی کی ضروریات سے بھی محروم کر دیا جاتا۔ کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں حاکم وقت کی نیت اور اس کے کام میں محنت و کاوش کرتے ہوئے وقت لگتا تھا۔ یہی اہل فارس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اہل فارس کو ترقی کی ان منازل تک پہنچانے میں کیورٹ اور اس کے بعد جشید نے اپنی اپنی دانست موجب جتنا حصہ ڈالا تھا، اس کے سارے مؤرخ محرف تھے۔ کیورٹ نے اپنی بگڑی ہوئی اور آوارہ قوم کو سنوارنے اور سدھارنے میں بے حد محنت کی۔ اس نے آداب طعام کے بارے میں نہ صرف عملی اقدامات اٹھائے بلکہ نفس و جسم کے معاملے میں اپنی حکیمانہ نظائر

سے انہیں درست سمت بھی دی۔ اس کے بعد طہورث کے عہد تک آتے آتے فارس کی سرحدیں ہندوستان تک پھیل چکی تھیں۔ اب نہ صرف ملک فارس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر بلکہ یونان کی بکھری ہوئی کمزور ریاستوں کے بادشاہ بھی فارس کی حکومت اور ان کے ہتھیاروں سے خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ طہورث کا دور حکومت جب اپنے اختتام کو پہنچا تو اس کا بھائی جشید تخت فارس پر بیٹھا۔ اس نے ملک فارس میں مختلف صنعتوں کو فروغ دیا۔ ملک فارس کے گھر گھر میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے مختلف عمارتیں بنوائیں اور کثرت سے شہر بسائے۔ اس نے اپنے لیے شہر اصطر سے قریب ایک نیا شہر بنایا جس میں نہایت خوب صورت اور عالی شان ہیروے جوہرات سے ستون بنوائے گئے جن کے درمیان ایک بہت بڑا تخت اپنے لیے بنوایا۔ اس تخت کی ایک خوب یہ تھی کہ ایک تو یہ اپنی اونچائی اور چوڑائی کے لحاظ سے بہت اونچا اور بڑا تھا۔ دوسرے اس کی پشت پر اس نے فرشتے کے بڑے بڑے پر بنوائے۔ چونکہ یہ لوگ فرشتوں کو بھی پوجتے تھے اس لیے اس شہر میں ہر آنے والا سب سے پہلے اس تخت کو سلام کرنے ضرور آتا۔ اس طرح وہ بگھتا تھا کہ جب تک وہ یہاں حاضری نہیں دے گا، اس وقت تک وہ گناہوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کو تخت جشید کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کے نشانات ابھی تک باقی ہیں۔

جشید کی شاندار سلطنت کے خاتمے پر اس کا پوتا ضحاک تخت پر بیٹھا۔ اس کا درست نام بیورا سب تھا۔ اس کی والدہ کا نام آک تھا مگر اہل عرب اسے ضحاک کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ حقیقت یمن کا رہنے والا تھا لیکن اس نے یمن کو فارس کے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ یہ انتہائی ظالم اور سفاک انسان تھا۔ ملک فارس کی تباہی و بربادی جس قدر اس کے دور میں ہوئی، نہ تو اس سے پہلے بھی ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے بعد کسی نے اہل فارس پر اس قدر مظالم ڈھائے۔ اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ جشید کو بھی اسی نے قتل کر دیا۔ یہی وہ بادشاہ تھا جس نے ملک فارس میں سب سے پہلے نہ صرف مجرموں بلکہ عام لوگوں کو ان کے جرائم پر پھانسی دینا شروع کی اور لوگوں کو قید کر کے کوڑے مارنا شروع کیے۔ لوگ اس سے ہر وقت خوفزدہ اور ہراساں رہتے تھے۔ بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جس کے بارے میں چاہتا، مقدمہ چلائے بغیر یا کوئی جرم ثابت کیے بغیر موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا بلکہ ایسی سزا سنانے کا اختیار

بادشاہ کی ماں اور اس کی بڑی ملکہ کو بھی حاصل تھا۔ کسی عام شہری بلکہ کسی امیر و رئیس کو بھی یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے اس ظالمانہ فعل پر صدمائے احتجاج ہی بلند کر سکے بلکہ عوام کو ہر حال میں بادشاہ کے آگے سر جھکانا ہے اور اس کے منہ سے نکلنے والا ہر جملہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضحاک نے اپنی حکمرانی کی دھماک بٹھانے کے لیے سنے سے نیا حیرت انگیز استعمال کیا تاکہ اس کی دہشت عوام پر قائم رہ سکے۔ بادشاہ کی قوت کا دار و مدار اس کی جنگی افواج اور طاقت پر ہوتا تھا۔ اہل فارس کے لیے بادشاہ کا حکم تھا کہ ملک کا ہر شہری جس کی عمر پندرہ اور پچاس سال کے درمیان ہوتی، اس پر لازماً تھا کہ وہ فوجی خدمات ادا کرے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک باپ نے اپنے چار بیٹے میدان جنگ میں بھیج دیے۔ ان میں سے ایک بھائی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے پانچویں بھائی کو اجازت دی جائے کہ وہ بوڑھے والدین کی خدمت کرنے اور کھیتی باڑی کرنے کے لیے ان کے پاس رہ جائے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے پانچویں بھائی کے جسم کو دو حصوں میں کاٹ دیا جائے اور جس طرف سے فوجوں نے گزرتا ہے، اس راستے پر اس کے جسم کا اوپر والا حصہ اور دوسری طرف نیچے والا حصہ رکھ دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ اس کی اس ظالمانہ اور سنگدلانہ حرکت پر کسی کو پلینڈہیدگی کی جرأت نہ ہوئی اور فوجی بیٹہ اپنی دھمیں بجاتا ہوا اس دھڑکھڑکایں مارتا ہوا گزرتا رہا اور عام لوگ بادشاہ سلامت زندہ باد کے فلک شکاف نعرے لگاتے رہے۔

جشید کے بعد آنے والے ملک فارس کے تمام حکمرانوں نے رعایا کی طرف سے توجہ ہٹا کے خود کو عیاشیوں میں ڈوب دیا تھا۔ ان کے احوال آمرانہ ہو گئے تھے۔ فتوحات تو کجا اب اپنی ہی سلطنت میں انتشار پسندی کے علاوہ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ دربار اور درباری امور پر تفتیش کے سارے اختانات موجود تھے۔ شاہی تخت ہال کے سرے پر پردے کے پیچھے رکھا جاتا تھا۔ سلطنت کے اعلیٰ عہدیدار، وزراء اور امراء پردے سے ایک مقررہ فاصلے پر بیٹھتے تھے۔ درباریوں کی جماعت اور دوسرے ممتاز لوگوں کے درمیان ایک لوہے کا جنگلا حائل رہتا تھا۔ چانک پر وہ اٹھتا تھا اور شہنشاہ تخت پر بیٹھا رشم و کنوایں کے نیچے کا سہارا لگائے سونے اور ریشمی تاروں سے بنا ہوا لباس پہنے جلوہ گر ہوتا تھا۔ تاج سونے اور چاندی کا بنا ہوا اور زمرہ، یاقوت اور موتیوں سے مرصع

تھا۔ بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے لٹکا رہتا تھا۔ یہ زنجیر اہل قدر بار یک تھیں کہ جب تک کوئی شخص تخت کے قریب آ کر نہ دیکھتا اسے نظر نہ آتی تھیں۔ اگر کوئی دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا تھا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے لیکن حقیقت میں تاج اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سراں کو نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس کا وزن تقریباً اڑھائی من کے قریب تھا۔

جو شخص بھی فارس کے ان بادشاہوں کے حضور حاضر ہوتا تھا، اس کو یہاں کے قدیم دستور کے مطابق سامنے آ کر سجدہ کرنا پڑتا تھا۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان فرق کو اور بھی کئی طریقوں سے ظاہر کیا جاتا مثلاً جس روز بادشاہ اپنے جسم سے فاسد خون یا بیماری کی حالت میں جو کھیں لگواتا یا کوئی دوا کھاتا تو لوگوں میں منادی کر دیا جاتی تاکہ تمام درباری اور اہل تخت میں سے کوئی اور ایسا کام نہ کرے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی اور اس دن دینی علاج کرے گا تو پھر بادشاہ پر اس دوا کا اثر ٹھٹھ جائے گا۔

ان کی مخصوص مجالس میں بھی یہ احتیاط برتی جاتی اور پردہ داری رکھی جاتی۔ جب بادشاہ عیاشیوں میں یا شراب نوشی میں مشغول ہوتا اس وقت بھی اس کے اور بادشاہ کے ساتھیوں اور درباریوں کے درمیان پردہ لٹکا رہتا اور ایک خاص درباری جسے خرم باش کہا جاتا جولا زما کی فوجی جرنیل کا بیٹا ہوتا، وہ حاضر ہوتا اور ایک شخص کو حکم دیتا کہ وہ بلند جگہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے..... "اے زبان۔ اپنے سر کی حفاظت کر یعنی آداب شاہی کو ہمیشہ سامنے رکھ کیونکہ تو آج بادشاہ کے دربار میں بیٹھا ہوا ہے۔"

وہ یہ اعلان بلند آواز میں کرتا تاکہ عیاشی میں مصروف اور شریک ہونے والا ہر شخص اس اعلان کو سن لے اور ساتھیوں میں سے کسی کو یہ مجال نہ لگھی کہ وہ زبان سے بات کرے۔ وہ اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنا مدعا سمجھاتے تھے۔

اس شانہ جادہ و جلال اور ان حقیقتی تدابیر کے باوجود بادشاہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا اور اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں اس کے دشمن اس کو قتل نہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے کئی خواب گاہیں بنائی ہوئی تھیں۔ کسی شخص کو اس بات کا علم نہ ہوتا تھا کہ بادشاہ آج کہاں سو رہا ہے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ کے مخصوص کمرے میں اس کی اجازت کے بغیر اس کا اپنا بیٹا بھی داخل نہ ہو سکتا تھا۔



کہا جاتا تھا کہ ایک روز بادشاہ کا بیٹا جس کی عمر تیرہ سال تھی، کو بادشاہ نے ایسی جگہ پر دیکھا جہاں اس کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ آیا دربان نے تمہیں یہاں آتے دیکھا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا۔ ”ہاں..... اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔“

تب بادشاہ نے غصے سے اسے حکم دیا۔ ”جاؤ اسے تیس کوڑے مارو اور اسے دربار کی ملازمت سے نکال دو۔“ ضحاک کے حرم میں بے شمار بیویوں کے علاوہ کئی ہزار لونڈیاں تھیں جو اس کی خدمت کرتیں اور قص و سرودی ٹھٹھیں سجاتی تھیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار خدمت گار تھے۔ آٹھ ہزار پانچ سو گھوڑے سواری کے لیے سات سو ساٹھ ہاتھی، بارہ ہزار خیر سامان لانے اور لے جانے کے لیے، جواہرات اور سونے کے قیمتی برتن ہر وقت اس کے ساتھ جنگ اور دوسرے سفر میں.... رہتے تھے۔ بادشاہ اپنے ارد گرد کی دوسری ریاستوں کے ساتھ جنگوں اور جھڑپوں میں لگا ہوا تھا۔ اسے اپنے عیاش ساتھیوں اور درباریوں سے چمکارا نہ ملتا تھا اور اپنے عرصہ حکومت میں اس نے اپنے عوام کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستوں کے بادشاہوں نے بھی عوام پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

مجرموں کو انتہائی اذیت ناک سزا دی جاتی جبکہ ایک نہایت عام سزا جو خصوصاً باغی شہزادوں کو دی جاتی تھی، یہ تھی کہ آنکھوں میں گرم سلاخی پھروا کر یا کھولتے ہوئے آنکھوں میں ڈلو کر اندھا کر دیا جاتا تھا۔ زندہ آدمیوں کی ساری یا آدمی کھال کھینچوا دینے کا بھی دستور تھا۔ جو لوگ عیسائی مذہب قبول کرتے ان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی جاتی۔ بھی کانوں میں پھینکا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ بھی زبان بچھ کر نکال لی جاتی تھی۔

سب سے زیادہ دہشت ناک عذاب کی 9 موتیں تھیں جس کی صورت یہ تھی کہ جلد سب سے پہلے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹا جاتا تھا۔ اس کے بعد پاؤں کی، پھر گلہ نیوں تک ہاتھ کاٹ ڈالتا تھا اور تختوں تک پاؤں۔ اس کے بعد پھر کہنیں تک ہاتھیں کاٹتا اور گھٹنوں تک پنڈلیاں، پھر ناک اور کان کاٹتا تھا اور سب سے آخر میں گردن تک سر کاٹا۔ اپنے سیاسی اور مذہبی مخالفین کو اس قسم کی لرزہ خیز سزائیں دینا ضحاک کا آنے دن کا معمول تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ضحاک کو اپنے دیوتاؤں اور امرا و مذاہن کا تاریکی کا بھی کوئی خوف نہ تھا۔ لوگ جانے اور

انجانے میں اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ جب اس کی حکومت کو آٹھ سو سال گزرے تو قدرت کی طرف سے ایک سزا اسے ملی..... اچانک اس کے کندھوں کے ابھرے ہوئے گوشت پر زخم آ گئے۔ جن کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں رہنے لگا تھا۔ اس نے طرح طرح کے علاج کروائے۔ ملک فارس کے بہترین حکماء سے علاج کروایا مگر زخم ابھی ہونے کے بجائے زیادہ تکلیف دینے لگا۔

جب وہ ہر طرح کے علاج کروا کر تنگ آ گیا تو اچانک ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ ان زخموں کا علاج انسانوں کے مغزوں سے کیا جائے تو اسے آرام آ سکتا ہے۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اگلی رات اسے پھر ایسا ہی خواب آیا۔ چنانچہ اس نے خواب میں دی گئی ہدایت کے مطابق شای جلا کو حکم دیا کہ وہ کسی انسان کا مغز نکال کر اسے دے۔ جلا نے بادشاہ کا حکم سنانا فوراً ایک عام بے گناہ نوجوان کو پکڑ کر لے آیا۔ اسے قتل کر کے اس کے دماغ سے مغز نکال کر بادشاہ کے زخمی کندھوں پر لگا دیا۔ مغز کے کتنے ہی ضحاک کو اس طرح لگا، جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔ اس کے درد کو افادہ محسوس ہوا تو اس روز سے اس کا معمول ہو گیا کہ کبھی کوچوں سے دو آدمی روزانہ پکڑ کر لائے جاتے اور انہیں قتل کر کے ان کے مغز ضحاک کے زخموں پر رکھے جاتے تھے۔

☆☆☆

اصفہان بھی ملک فارس کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ انہی دنوں اصفہان کے حاکم کو جب انسانی مغزوں کے حصول کے لیے دو نوجوان نہ ملے تو اس نے ریاست کے ایک لوہار جس کا نام ”کاوہ“ تھا، کے دو بیٹوں کو پکڑ کر ضحاک کے دربار میں بھیج دیا۔ اہل فارس کو اس وقت تک ضحاک کی ان مذموم کارروائیوں کا پتا چل چکا تھا۔ ”کاوہ“ کے دونوں بیٹے جب چند روز تک نہ ملے تو اسے اس بات کا پتہ نہ لگتا کہ انہیں حکومتی کارندوں نے اغوا کر لیا ہے۔ پھر چند ہی روز بعد ان کے قتل کی خبر آ گئی۔ وہ غصے سے بھرا ہوا شہر آیا اور عوام کو ضحاک کے ظلم و ستم کے خلاف ابھارنے لگا۔ وہ اپنی دھوکئی کو ایک لمبی سی کلڑی سے باندھ کر فضا میں بلند کرتا۔ بیٹوں کے صدمے نے اسے پاگل کر ڈالا تھا۔ وہ جنونیوں کی طرح گلی گلی اور چوراہوں، رستوں پر سے گزرتا، دھوکئی کو فضا میں بلند کرتا اور آوازیں لگاتا۔

”لوگو..... یہ آزادی کا جھنڈا ہے۔ یہ لوگوں کا ضحاک

کے ظلم سے نجات کا راستہ ہے۔ جو لوگ ضحاک کے خونی پنجوں سے رہائی چاہتے ہیں وہ اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔“ پہلے تو لوگ اس کی باتیں سن کر ہنسنے اور مذاق کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جاتے مگر وہ کچے ارادے سے اپنے کام میں جتا رہا لیکن جب اصفہان کے گلی کوچوں میں کاوہ روزانہ کلڑی سے بندھی دھوکئی کو باندھے فضا میں بلند کرتا اور نعرے لگاتا گزرتے لگا، تب آہستہ آہستہ لوگوں نے اس کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ اب لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس کی باتیں سننے لگے تھے۔ تب اس نے کپڑے پر دھوکئی باندھی اور جھنڈے کی شکل دے دی۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس نے گلی گلی تو اس نے آہستہ آہستہ جھنڈے کو موتیوں اور بیش قیمت جواہرات سے سجانا شروع کر دیا۔ اس کے مطابق ”دور“ ایک عربی لفظ تھا جس کے معنی کو ہر اور موتی کے ہیں اور ”دش“ فارسی میں پگڑی کے شیلے کو کہا جاتا ہے۔ یوں اس کے جھنڈے کا نام ”دش کاویانی“ پڑ گیا یعنی ”کاوہ“ کا ہیرے موتیوں سے جڑا ہوا پگڑی کا شیلہ۔

کاوہ نے نہ صرف اس طرح فارس کے لوگوں کو اس جھنڈے..... تلے اکٹھا کرنا شروع کر دیا بلکہ کاوہ کی آواز اصفہان کی ریاست سے نکل کر ملک فارس کی آواز بن گئی۔ تب ضحاک کی آنکھیں کھلیں مگر اس وقت تک کاوہ کا بیٹا ہوا جھنڈا اہل فارس کا اتنا ہی نشان بن چکا تھا۔ کاوہ نے اپنا یہ اتنا ہی نشان اڑھائی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران بنایا تھا۔ اب وہ جہاں بھی جاتا، دش کاویانی اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ پھر کاوہ نے ایک اچھا خاصا لنگر تیار کر لیا اور ضحاک سے نکل گیا۔ اس نے اہل فارس کی مدد سے ضحاک کو شکست دی اور اپنی قوم کو آزادی دلائی۔ آزادی کے بعد جب فریدون انتہائی مدد و جہد کے بعد بڑی شائے تخت فارس پر بیٹھا، اس وقت تک کاوہ اتنی طاقت حاصل کر چکا تھا کہ فریدون نے کاوہ کو فوج کا سپہ سالار اعلیٰ بنادیا۔ کاوہ جہاں بھی لنگر لٹکتا رہتا، دش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی سب کا میا بیوں کے پیچھے اسی دش کاویانی کا ہاتھ ہے۔ اس نے تیس سال کے عرصے میں ملک فارس کو دشمنوں سے پاک کر دیا۔ جس کے صلے میں فریدون نے اسے اصفہان کا حاکم بنادیا۔ فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا، دش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ پھر یہ جھنڈا جب کھولا جاتا تو جواہرات کی چکاچوند سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ بہر حال دش کاویانی اب اہل فارس کا قومی پرچم جاتا تھا جسے اہل فارس کے سیاسی لوگوں کے ساتھ

## قبل مسیح

سن عیسوی سے نہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں قبل مسیح آتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردش ایام کو پیچھے کی طرف دھراتے ہیں۔ ان کو سمجھنا اور سمجھانے کے لیے ذہنی ”شیش آسن“ کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی دشوار ہے جتنا اگلے پہاڑے سنانا، اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہیے کہ تاریخ قبل میلاد مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔

اگرچہ مؤرخین کو شاک ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب بتایا جاتا ہے کہ مردم کی داغ بیل 753 قبل مسیح میں پڑی تو وہ سمجھنے سے ہاتھ اٹھا کر سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کیسے پتا چل گیا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں 753 سال باقی ہیں؟ ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ 753 ق۔ م کو ساتویں صدی شاعر کریں یا آٹھویں ق۔ مصل مسند استان دہا بلا نہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں، آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر 350 ق۔ م میں پیدا ہوا اور 323 ق۔ م میں فوت ہوا۔ تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرآ؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرے۔

## کافی فوائد

میری معلومات عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے آگئی ہوگی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسان سے براہ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشم تحفیل کو کسی طور پر باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے ارباب ذوق کی کمی نہیں جنہیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس



## ذرائع کامیابی

☆ مقصد جتنا بلند ہوتا ہے زیاہ وقتیں اس کی تکمیل میں اٹھانی پڑتی ہیں۔

☆ وہ فتوحات جو آسانی سے حاصل ہو جائیں، کم قیمت ہوتی ہیں۔ قابل قدر فتوحات وہ ہیں جو سخت مشکل کا نتیجہ ہوں۔

☆ کمزور انسان موقع کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن باہمت افراد خود موقع پیدا کر لیتے ہیں۔

☆ قربانی اور کامیابی لازم و ملزوم ہیں۔

☆ جفاکشی کے سمندر کی تیز موجوں سے بھری پڑی ہے۔

☆ زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جو برسوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اور ان کوں کے گزر جانے کے بعد ہم قیمت دے کر بھی انہیں دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔

☆ مشکلات کا سامنا کرنے کا نام زندگی اور ان پر غالب آجانے کا نام کامیابی ہے۔

☆ میں نے شہر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر کلکھا ہے۔ کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

☆ مسلسل۔ ریاضت، حسن ابدال

☆ پر پڑی جو بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کے سر پر چڑھ کر بولی۔

”کسی کو یوں بے چینی میں جتا کر کے خود آرام سے بیٹھنے ہو۔ تم کہتے بڑے جادوگر ہو۔“

☆ مترم آواز سنتے ہی اس نے منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور معاً اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ..... یہ تم ہو خوناٹی.....“

”ہاں تمہارے سحر کی قیدی خوناٹی.....“ خوناٹی نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

☆ اس بار ہنسنے کی باری سیامک کی تھی۔ ”جب سیاست کے بڑے بڑے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جائیں تو دل کے آتش کدے ٹھنڈے لگتے ہیں۔ تم نے خود ہی تو مجھے ذرا یاد تھا کہ یہاں معبدوں کے رئیس بہت ظالم ہیں۔“ سیامک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”یہاں کے مرد تو اس قدر بزدل نہیں ہیں۔ ہماری میڈیا والوں کی تو عورتیں اس قدر بہادر ہیں کہ وہ جنگوں میں

”اپنے جانوروں کو ادھر سے نکال لو۔ ابھی ستر (سورج) نکلنے والا ہے۔ عبادت کا وقت ہونے والا ہے۔ معبد کا کوئی رئیس ادھر سے گزرا تو تمہارے ساتھ مجھ پر بھی مصیبت آجائے گی۔ میں تو جا رہی ہوں.....“ یہ کہہ کر خوناٹی اٹھ کر چلی گئی تو سیامک کی اونچی آواز اسے اپنے پیچھے سے سنائی دی۔

”خوناٹی! میں کل پھر آؤں گا..... تم آؤ گی؟“

☆ خوناٹی اپنے پیچھے دیکھ کر بے تحاشہ ہنسنے لگی، اس کی ہنسی کی آواز دیر تک سیامک کو سنائی دیتی رہی۔

☆ اسی شام جب وہ گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف تھی، اسے کئی بار ایسے لگا جیسے سیامک اس کے ارد گرد ہی کہیں پھر رہا ہو۔ اس نے ہر بار اس سوچ کو جھٹکنا چاہا مگر وہ روپ بدل بدل کر اس کے دماغ میں ارتعاش پیدا کرنے لگی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

☆ زندگی میں پہلی بار ایک بے چینی سی اس کو لاحق ہو چکی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے سیامک نے اس پر جادو یا منتر کر ڈالا ہو کیونکہ اس زمانے میں جادو اور منتر پر ان کا پکا اعتقاد تھا اور جادو کے ساتھ ساتھ علم نجوم پر بڑا بھروسہ کیا جاتا تھا۔

☆ تو کیا سیامک بھی کوئی جادوگر یا ساحر ہے جس نے اس کی سوچوں کو جادو کے زور سے بدل کر رکھ دیا ہو، رات بھر اسے یہی خواب آتے رہے کہ وہ رات نندی کے کنارے سیامک کے منٹوں پر سر رکھے اس کے ساتھ میٹھی میٹھی اور پیار بھری باتیں کر رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے صبح وہ سورج نکلنے سے پہلے رات نندی پر پہنچ چکی تھی۔ اب بڑی شدت کے ساتھ وہ سیامک کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے جیسے دن نکلتا جا رہا تھا، اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

☆ آخر وہ انتظار کرتے کرتے زچ ہوئی اور سوچنے لگی اب تک تو اسے آجاتا چاہیے تھا۔ وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ اب سورج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ پہاڑیوں سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ وہ جب اپنے خیمے میں واپس آئی تو اس کے گھر والے سورج دیوتا کی عبادت میں مصروف تھے۔ وہ بھی ایک طرف ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی۔

☆ جب عبادت کر چکی تو ایک بار پھر اس کا رخ رات نندی کی طرف تھا۔ وہ بوجھل اور مایوس قدموں کے ساتھ نندی کے کنارے کنارے ایسے ہی دور تک نکل گئی پھر اچانک اس کی نظر رات نندی سے پرے پہاڑی کی ایک چٹان پر پڑی جہاں بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔

☆ یہ یقیناً سیامک کی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ تھا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔ تھوڑی دور جا کر اس کی نظر سیامک

ہو جاتی تھی۔ اس کا والد گھوڑوں اور گدھوں کی تجارت کا کام کرتا تھا اور اکثر کاشغہ کے بازار میں..... انہیں بیچنے اور خرید کاری کے لیے لے جاتا تھا۔ خوناٹی گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ گھر میں لگی ہوئی کھڈی پر اپنی بھیڑ بکریوں کی اون سے یا تو قائلین بنتی یا پھر ان کی اون کو ریشوں اور دھاکوں میں تبدیل کر کے اس سے انتہائی نفیس کپڑے بناتی۔ جب وہ ان کو بناتی تو پھر ان پر کشیدہ کاری بھی کرتی۔ اس نے کشیدہ کاری کا ہنر اپنی والدہ اور قبیلے کی دوسری عورتوں سے بڑی لگن اور محنت سے سیکھا تھا اور اب وہ اس میں مہارت حاصل کر چکی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح فارغ وقت میں بے جا کھیلنے کودنے کے بجائے قریب سے گزرنے والی رات نندی پر چلی جاتی اور اس میں سے گول گول چھوٹے بڑے پتھر پختی رہتی۔

☆ ان کے قریب ہی بہت دنوں سے ایک جتنی خاندان آہا تھا جس کا ایک خوب صورت بیٹا بھی رات نندی کے کنارے کنارے اپنی بھیڑ بکریاں چرانے آئے لگا تھا۔ اس کے خاندان کی عورتیں ہاتھ والی کھڈی پر کبل اور قائلین بنانے لگی تھیں۔ ان کے خاندان کا ایک بڑا آدمی برتنوں پر خوب صورت نقش و نگار بناتا تھا۔ جنہیں وہ بازار لے جا کر بیچ کر روزی روٹی کماتا تھا۔

☆ اس روز بھی وہ رات نندی پر چلی گول، بیٹے پتھر چن رہی تھی جب وہ لڑکا بھیڑ بکریوں کو پانی پلانے نڈی کے قریب آیا۔ کچھ دیر رکنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ خوناٹی اپنی ہی سوچوں میں مگن پتھر چن کر اپنے چڑے والی تھیلی میں ڈال رہی تھی۔

”اے لڑکی..... کیا کر رہی ہو؟“

”میرا نام خوناٹی ہے..... تمہیں کیا..... میں جو مرضی کروں۔“

”تم پانی میں ہاتھ ڈالے اسے ٹاپاک کر رہی ہو.....“ لڑکے نے جواب دیا۔

”مجھے روکنے سے پہلے خود اپنی طرف تو دیکھو..... تمہاری بھیڑ بکریاں صاف سحرے پانی میں منڈ ڈالے اسے گندا نہیں کر رہیں۔“ خوناٹی نے جیتے ہوئے کہا۔

”کہاں رہتی ہو.....؟“ لڑکے نے دوبارہ پوچھا۔

”یہیں کی ہوں..... پہاڑوں کے بیچ ہمارے خیمے لگے ہیں، تم کہو ہو، جو مجھ سے اس قدر پوچھ کچھ کر رہے ہو۔“

”میرا نام سیامک بن فروال ہے۔ ہم کچھ ہی دن پہلے ادھر آئے ہیں۔“

ساتھ اہل نر نے بھی دل و جان سے قبول کر لیا ہے۔

☆ ملک فارس میں میدس باقی قبائل سے زیادہ تہذیب یافتہ تھے۔ یہ پڑھنا لکھنا بھی جانتے تھے۔ انہوں نے 700 قبل مسیح اپنی سلطنت کی بنیاد میڈیا کے صوبے میں رکھی اور آکتابانہ (ہمدان) کو اپنا شاندار دار السلطنت بنایا۔ یہ

آشور یا والوں کے دشمنوں میں شامل تھے۔ دوصدیوں کے عرصے میں چھوٹی بڑی جھڑپوں کے بعد میدس (میڈیا) والوں نے اس آشوری سلطنت کو برادر کے رکھ دیا اور ان کے دار الحکومت نیوا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

☆ جنگی حالات میں جب میڈیا والوں نے نیوا کو تباہ و برباد کر دیا تو ملک فارس کے واقعات کا رخ بھی بدل گیا۔

☆ میڈیا خزر کے جنوب مغرب میں آذربائیجان کے پہاڑی علاقے میں آکر آباد ہو گئے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے سے

یہاں کی آب و ہوا نے ان پر بہت گہرا اثر ڈالا اور ان کے مردوں اور عورتوں کے رنگ قدرتی طور پر صاف ہو گئے۔ ان لوگوں کے قد لمبے اور جسم کی ساخت مضبوط تھی اور عورتوں کے بال ضرورت سے زیادہ لمبے ہونے لگے تھے۔ یہاں

تک کہ ان کی بعض عورتوں کے بال اس قدر لمبے ہو جاتے تھے کہ سنبالے نہ سنبھلتے تھے۔ ان ہی قبائل میں انیغور قبیلہ سرپرست تھا جس کی عورتیں انتہائی خوب صورت تھیں اور آج بھی حسن و خوبصورتی میں یہ عورتیں یکساں ہونے کے ساتھ ساتھ

اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کی نسل ”سامی“ تھی۔ ان کی تاریخ کا ایک چینی کھوج کار اور دانشور پوئی جاز ہنگ کے مطابق یہ افراد سامی نسل ہیں۔ یہ قبائل 5

قبیلوں میں بٹ کر سکیا تک کے علاقے میں جا کے مختلف سپہ سالاروں کے زیر نگیں ہو گئے مگر ملک فارس کو سالانہ لگان بھجوانے لگے تھے۔ تاریخ قدیم کے مطابق یہ پہلے عیسائیت کے پیروکار تھے۔ یہ اپنے رہن گن میں انتہائی نفیس اور محنت کش لوگ تھے جو خیموں میں رہتے تھے اور ان کے مرد بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے خاندانوں کی

انتہائی وفادار اور ہر کام میں ماہر تھیں۔

☆ خوناٹی بھی ایک ایسی ہی لڑکی تھی جو اپنے خاندان کے ساتھ انہی پہاڑیوں کے درمیان ایک خیمے میں رہائش پذیر تھی۔ یہ اپنے حسن اور خوب صورتی کے لحاظ سے پورے قبیلے میں اپنی مثال آپ تھی۔ خوناٹی کے سر کے بال بچپن سے ہی اس قدر لمبے تھے کہ جب اس کی والدہ اس کے سر میں لٹکھی کرتی تو وہ سلجھائے نہ سلیختے تھے اور اکثر اس کی

والدہ اس کے اتنے لمبے بالوں کی وجہ سے خود پریشان



## تانپورا اور تنبورا

پطرس بخاری صاحب نے ایک مرتبہ ریڈیو کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خاں کو تقریر کرنے کے لیے بلایا۔ مولانا تقریر ریکارڈ کروانے کے بعد پطرس بخاری صاحب کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو مولانا نے سوال کیا۔ ”پطرس! یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

پطرس نے ایک لمحہ سوچا اور بولے۔ ”مولانا! آپ کی عمر کیا ہوگی؟“

مولانا یہ سن کر گڑبڑا گئے اور بولے۔ ”میری کوئی پچھتر سال۔“

پطرس نے جواب سن کر کہا۔ ”مولانا! جب آپ نے پچھتر سال فرق جانے بغیر گزار دیے تو باقی دو چار سال بھی گزار لیجیے۔“

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

”لو۔۔۔۔۔ یہ کوئی مشکل بات ہے اور قید خانے تک آنے جانے پر کوئی ہم نوا کروں کے لیے کوئی پابندی ہے۔ میں آج ہی کوئی راہ نکال رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر نوکرانی توکل مہنی مگر سعدی کے من میں ایک جوت سی جگمگی۔

سعدی جانتی تھی کہ مخالفین کو قید رکھنے کے بعد انہیں کن کن اذیتوں سے گزارا جاتا ہے۔

”تو کیا اس خوب صورت انسان کو بھی انہی تکالیف سے گزارا جائے گا اور پھر اس قید کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

اس کا نتیجہ تو صرف موت ہی ہے۔ دوسری سوچ نے اسے جواب دیا پھر اس رات اسے بڑا ہی بھیا تک خواب دکھائی دیا۔ اسے لگا جیسے اس خوب صورت نوجوان کے دونوں ہاتھ اس کی پشت سے بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلی ہوئی ہیں اور ریاست کے سپاہی اسے قید خانے سے نکال کر لے جا رہے ہیں۔

”اسے کہاں لیے جا رہے ہو؟“ اس نے آگے بڑھ کر سپاہی سے سوال کیا۔

”تم کون ہو لڑکی۔۔۔۔۔ ہٹو ہمارے راستے سے اور ہمارا سفر کھوٹا نہ کرو۔“

ابھی وہ باپسی سے ایک طرف ہٹے کو تھی کہ ایک دوسرے سپاہی نے فوراً اسے ٹوکا۔

”اوپے ڈوق! کیا کر رہے ہو۔ تم اسے نہیں جانتے۔۔۔“

یہ بادشاہ وقت کی بیٹی سعدی ہے۔ دوسرے

کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس نے فوراً چہرہ کوئی سے کام لیتے ہوئے سعدی کی تقریبات شروع کر دیں۔

”میں نہیں جانتا کہ یمن کی شہزادی کو کیسے گوارا ہوا کہ ہم جیسے مظلوموں کی طرف انہوں نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ

بندہ پر تعجب آپ کی آمد کا ہے حد شکر گزار ہے۔ گو یہ آپ کے شایان شان نہیں کہ یوں کال کوٹھری میں آپ تشریف لائیں

مگر میں سمجھتا ہوں یہ آپ کی ہم جیسے لوگوں پر عنایت خسرانہ ہے۔“

شہزادی سعدی نے پہلی مرتبہ ایک انتہائی خوب صورت اور اپنے ہم عمر شخص کے منہ سے اپنی تعریف سنی تھی۔

عورت ہر دور میں اپنی تعریف سن کر اپنا آپ ہارنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ سعدی نے جب اس کے منہ سے اپنے متعلق ایسے الفاظ سنے تو وہ اس کی طرف ہل گئی۔ جب وہ اس سے ملاقات کے بعد واپس اپنے محل میں آئی تو تیز نے

دست بست ہو کر اس سے پوچھا۔

”کیوں شہزادی صاحبہ۔۔۔۔۔ آپ نے اس قیدی کو

کیسا پایا؟“

”تم نے جو کچھ مجھے سنایا اور جو کچھ مجھے اس کے متعلق آج تک بتاتی رہی ہے، وہ بلاشبہ اس سے کہیں بڑھ کر

ہے۔ ایسے شخص کو اس کال کوٹھری میں۔۔۔۔۔ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ کاش میں اس کے دل میں گھر بناتی اور اس کی مدد کے لیے کچھ کر سکتی مگر میرے والد کو تو ملک یمن کا ہر

شخص جانتا ہے کہ وہ کس قدر ظالم اور سخت آدمی ہے۔“ یہ کہہ کر سعدی خاموش ہو گئی۔

چالاک اور ہوشیار نوکرانسی باتوں کی تو کھوج میں ہوتے ہیں جہاں انہیں کوئی نرم گوشہ نظر آتا ہے۔ وہ فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

نوکرانی نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔

”اگر آپ ایک اور کرم فرمائی کریں جیسا کہ آپ کے دل میں بھی ہے کہ آپ اس قیدی کے لیے کچھ کر سکیں۔ میں

خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس طرح کے خوب صورت انسان کو قید میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں اس کے لیے آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ نوکرانی نے انکساری سے

جواب دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو پھر اس قیدی سے راہ درم بڑھانے کی کوشش کرو اور میری اس کے دل میں جگہ پیدا کرنے کی کوئی

راہ ڈھونڈو۔“ سعدی نے رک رک کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

یہ سوچ کر وہ دھڑام سے زمین پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ اسے ہوش میں لایا گیا تو اس کی آنکھوں میں مونے

مونے ہنسوتھے کسی بد بخت کے خوب صورت سپنے اس طرح بھی بنا آواز کے ٹوٹ سکتے ہیں۔ ان کی مذہبی رسوم میں پانی

اور مٹی کو آلودہ کرنا بہت بڑا جرم تھا۔۔۔۔۔ اور وہ جانتی تھی کہ ان جرائم کی سزا کیا ہوتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر ہی اس کی

آنکھوں کے ران نندی سے پانی بہہ رہا تھا اور اس کے سب گھر والے اس کی اس حالت سے پریشان تھے کیونکہ

ریاست کے نزدیک یہ ناقابل معافی جرائم تھے۔

☆☆☆

کیکادوس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عراق سے بلیغ نفل ہوا تھا اور اس طرح وہ فارس کا پہلا بادشاہ کہا

جاتا ہے جو عراق سے فرار ہو کر پہلے یمن پہنچا تھا۔ تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس سے پہلے جتنے بھی ملک فارس کے

حکمران ہوئے، ان کا تعلق ملک فارس کی اپنی ہی نسلوں سے تھا۔ اس طرح کیکادوس دوسرے ملک سے آکر فارس پر

حکمرانی کرنے والا پہلا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ کیکادوس اپنے ملک سے۔۔۔۔۔ یمن آیا۔ اس وقت یمن میں شر بن فریقس کی

حکومت تھی جو سیاسی طور پر اس کے خلاف تھا۔ جونہی کیکادوس کی اسے اطلاع ملی تو فوراً اسے گرفتار کر لیا اور

ایک تنگ وتار یک قید خانے میں۔۔۔۔۔ ڈال دیا۔ کیکادوس اپنے قہقارے اور رنگ روپ میں بے حد خوب صورت تھا۔

جب اس کی گرفتاری کی خبر ملک یمن میں عام ہوئی اور بڑھتے بڑھتے یہ خبر محلات میں پہنچی تو شہزادی سعدی کو بھی

اس کی خوب صورتی کی خبر ایک نوکرانی کے ذریعے پہنچی۔ اس وقت تو شاید سعدی اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیتی مگر وقتاً فوقتاً

اس کی باتوں نے سعدی کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں شر بن فریقس کو ٹبری کی کہ رستم بن دستان چار ہزار

سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر کیکادوس کی مدد کو آ رہا ہے۔ اب تک اپنی نوکرانی کی باتیں سن کر سعدی کو بھی کیکادوس کو

دیکھنے کی تمنا ہونے لگی تھی۔ اور ایک روز اس کینز نے سعدی کو بہانے سے قید خانے میں موجود کیکادوس سے ملانے کا

موقع ڈھونڈ لیا اور اسے قید خانے میں لے گئی۔ کیکادوس نہ صرف اپنے جسمانی حسن میں بے مثال تھا بلکہ وہ باتیں بھی

کمال کی کرتا تھا۔ وہ باتوں کے جال میں لوگوں کو پھانسنے کا ہنر جانتا تھا۔ ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کو اپنے سامنے

دیکھ کر اس کے مکار ذہن نے سوچا کہ اس عفتوبت خانے سے نکلنے کا بہترین راستہ شر بن فریقس کی بیٹی سعدی کے سوا اور

مردوں کے شانہ بشانہ شریک ہوتی ہیں۔ وہ تو گھوڑوں پر بھی پست کر کے نہیں بیٹھتیں اور نہ ہی تیروں کی بوچھاڑ کرتے گھبراتی ہیں۔ تم کیسے مرد ہو۔۔۔۔۔ میری باتوں سے ہی ڈر گئے۔ دیکھو آج تمہارے آنے سے ران نندی پر اڑنے والے خوب صورت

پرندے بھی کہتے اداس ہیں۔ وعدہ کرو، تم مجھے یہاں ضرور ملا کرو گے اور کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔“ خوشامی نے

جذبائی انداز میں جرات سے کہا۔

”ٹھیک ہے خوشامی میں کل تم سے ضرور ملوں گا۔“

سیامک نے کہا تو خوشامی دوبارہ اپنے خیمے میں واپس لوٹ آئی۔

اس کا باپ بازار سے اگلے روز دو پہر کو واپس پلٹا۔

وہ بہت خوش تھا کہ اسے کاروبار میں بہت زیادہ منافع ملا تھا۔ وہ خوشامی کے لیے بہت سے تحائف لے کر آیا تھا۔ اس کے آتے ہی خوشامی بڑی خوشی اور پیار سے اپنے والد کے

قرباب آئیشی۔

”جانتی ہو، یہ تحائف میں اپنی پیاری بیٹی خوشامی کے لیے لایا ہوں۔“ اس نے تحائف اپنی بیوی کے سامنے

رکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں، تمہیں تو بس بیٹی کے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔“

”یہ ہے ہی اتنی پیاری کہ واقعی مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“ اس کے باپ نے خوش ہوتے ہوئے جواب

دیا۔ پھر وہ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ خوشامی کو وقت کا پتا ہی نہ چلا۔

”ارے۔۔۔۔۔ یہ تو مجھے بتانا یاد ہی نہ رہا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو ریاست کے ہر کارے ایک نہایت خوب

صورت نوجوان کو پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ وہ نوجوان چیخ چلا رہا تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھے امور ازمدادی قسم یہ

مجھ پر الزام ہے۔ وہ اپنے آپ کو سپاہیوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سپاہیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا

تھا اور اسے کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ چلا رہے تھے۔ تم نے ہوا اور پانی کو پلید کیا۔ تم ران نندی

کے پاک پوتر پانی سے منہ دھو رہے تھے اور تمہاری بھیڑ بکریاں نندی میں منہ ڈالے ہوئے تھیں۔ تمہیں پاک اور

پوتر پانی کو یوں سرعام پلید کرنے پر گرفتار کیا جاتا ہے۔“

یہ بات سنتے ہی خوشامی کا رنگ سفید ہو گیا۔ کانٹو بدن میں لہو نہیں۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ نوجوان سیامک کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہی اس کے کہنے پر ران نندی پر آیا ہوگا۔



نے بتایا۔

”شہزادی صاحبہ! میں معافی مانگتا ہوں۔“ پھلے

”جلدی سے اسے لے جا کر اس کے دو کلوے کر کے انہیں چٹانوں کے پاس پھینک آؤ۔ درندے پرندے خود ہی کھا جائیں گے۔“ دوسرے نے جلدی سے کہا۔ اور سنو سٹرا (سورج) کی روشنی پھیلنے سے پہلے یہ کام کر دو۔ ورنہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی ناراضگی الگ دیکھنا پڑے گی۔“ اس نے نصیحت کی۔ اسے سنتے ہی پہلے نے اپنی کمر سے تلوار اتاری اور اسے سونت کر قیدی کی گردن مار دی۔ مقتول کی شدت کرب سے ایک جھنجھ بوند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سعدی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے جسم میں مارے خوف کے کچھیلی طاری ہو گئی تھی اور چہرہ ڈر سے بھیجا ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تفتی دیر تک اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتی رہی۔ تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چاہے کچھ بھی ہو، اس قیدی کو ضرور چھڑائے گی۔ اگلے روز اس نے پھر نوکرانی کو طلب کیا۔

”رات تو شہزادی صاحبہ مارے خوف کے مجھے نیند نہیں آئی۔ عجیب و غریب خواب آتے رہے۔“ نوکرانی نے بتایا۔

”میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔“ پھر کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ نوکرانی سے مخاطب ہوئی۔ ”کہو دوبارہ قیدی سے تمہاری ملاقات ہوئی۔“

”ہاں جی۔۔۔۔۔ ابھی کل ہی اس سے ملاقات ہوئی۔ کہہ رہا تھا تمہارے ساتھ والی نہیں آئی۔“ نوکرانی نے جواب دیا۔

”پھر۔۔۔۔۔“ سعدی نے بے تابی سے پوچھا۔

”میں نے اپنی طرف سے ادھر ادھر کی لگادی۔ آپ کسی وقت ہوا میں نا۔“ نوکرانی نے کہا۔

”جی تو میرا بھی کرتا ہے مگر اباجان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر ان کے کانوں میں ذرا بھی جھپک پڑی کہ ان کی لاڈلی بیٹی دشمن قیدی سے ملتی ہے تو ہم سب کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“ جنہیں پتا ہے وہ غصے کے بہت برے ہیں۔

”شہزادی صاحبہ! قیدی بھی تو بہت پرانا ہے۔ جیلوں میں اتنے قیدی پڑے ہیں، بادشاہ سلامت کو جب تک یا د نہ دلا یا جائے، اس وقت تک ان کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ کونسا قیدی قید خانے میں موجود ہے اور کونسا

نہیں۔“ کیکاؤس کو تقریباً 4 سال ہو چکے ہیں ہماری قید میں۔“ نوکرانی نے تفصیل سے جواب دیا۔

”یہ تمہیں کس نے بتایا؟“ سعدی نے پوچھا۔

”میں ملتی رہتی ہوں اس سے اور اپنا نام کیکاؤس بھی اسی نے خود بتایا تھا۔ یہ بھی کہ اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈالے تقریباً 4 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مجھے تو یہ بھی علم ہے کہ اس کو یہاں سے چھڑانے کے لیے رستم اپنا فوجی دستہ لے کر ہماری ریاست پر حملہ آور ہو رہا ہے۔“ نوکرانی نے رہی سہی تفصیل بھی سعدی کے گوش گزار کر دی۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ اگر ہم رستم کے حملہ آور ہونے سے پہلے کیکاؤس اور اس کے ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرادیں تو وہ اور اس کے ساتھی زندہ بچ جائیں گے۔“ سعدی نے ترکیب بتائی۔

”آپ کی بات تو شہیک ہے۔ اس طرح آپ کا پیار بھی بچ جائے گا۔“ نوکرانی نے مشورہ دیا۔

”مگر جیل کی جالی۔۔۔۔۔؟“ سعدی نے ایک اور سوال کیا۔

”وہ میں خود جیل کے داروغہ سے کسی نہ کسی طرح لے لوں گی۔“ نوکرانی بولی۔

”اس کے لیے کیکاؤس کو بھی تو اعتماد میں لینا ہوگا۔“ سعدی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آپ اس سے خود بات کر کے دیکھ لیں۔ اس طرح ایک تو آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے گی، دوسرا اسے آپ کی محبت کا یقین ہو جائے گا۔“ نوکرانی نے کہا تو سعدی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اسی روز سعدی نوکرانی کے ہمراہ کیکاؤس سے دوبارہ ملی تو اس نے اپنی یہ تجویز کیکاؤس کے سامنے رکھی۔

”یہ کیسے ممکن ہوگا؟ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔“ کیکاؤس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں کیکاؤس۔۔۔۔۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم یہ سارا کام خفیہ طور پر کریں گے۔ مجھے اس خفیہ راستے کا علم ہے جہاں سے میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نکالوا سکتی ہوں۔“ سعدی نے جواب دیا۔

”مگر سعدی! یہ تم کرسکتی؟ بہت مشکل اور اپنی جان پر کھیلنے والا کام ہے۔“ کیکاؤس نے اسے پکا کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل کرسکتی ہوں۔ میری محبت اس قدر بزدل بھی نہیں ہے۔ بس تم اور تمہارے ساتھی تیار رہنا۔ میں جس وقت بھی تمہیں اس کا اشارہ کروں گی، تم اور تمہارے ساتھی فوراً نکل جائیں گے۔“ سعدی نے جرات مندانہ لہجے میں کہا۔

اور اسے بھی محض اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ جس وقت سعدی کیکاؤس اور اس کے ساتھیوں کو ایک خفیہ راستے سے

دھوکے باز

نکال کر لے جا رہی تھی، اسی صبح رستم۔۔۔۔۔ ایک دوسرے راستے سے جو ریاست جستان سے جیل تک آتا تھا، اس سے ہوتا ہوا یمن کی ریاست تک آ گیا۔ اس نے آتے ہی یمن کا محاصرہ کر لیا اور شمر بن فریقس کو قتل کر دیا۔ واپسی پر وہ کیکاؤس کو ساتھ لے گیا۔ سعدی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے کیکاؤس کے کہنے پر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس کے وطن چھوڑ دیا۔

اپنے وطن پہنچ کر اس نے سعدی کی شادی اپنے بیٹے سیادش کے ساتھ کر دی۔ کیکاؤس چار سال کے بعد رستم کی مدد پر قید سے چھوٹ کر اپنے ملک واپس تو آ گیا مگر اپنی حمایتوں سے باز نہ آیا۔ اپنے ارد گرد کی ریاستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ دراصل وہ جلد از جلد اپنے ملک کو فارس کی طرح وسعت دینے کا خواہاں تھا۔ ملک فارس میں اس وقت افراسیاب بادشاہ تھا جس کے ساتھ اس کی بھی بھی نہیں بنی تھی۔ افراسیاب نے جب دیکھا کہ کیکاؤس اپنی چھیڑ چھاڑوں سے باز نہیں آتا تو اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کیکاؤس پر حملہ کر دیا۔ کیکاؤس نے ایک بار پھر رستم کو مدد کے لیے کہا۔ اس بار پھر رستم نے کیکاؤس کی بھرپور طریقے سے امداد کی اور رستم نے کیکاؤس کی طرف سے افراسیاب کا مقابلہ کر کے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ اس جنگ میں افراسیاب مارا گیا۔ پورے عالم میں اب یہ مشہور ہو چکا تھا کہ کیکاؤس رستم کے بغیر کچھ نہیں اور اس کی طاقت محض رستم کی وجہ سے ہے۔

ان ہی دنوں سعدی نے سیادش کے بیٹے کو جنم دیا جس کا نام کثیر درکھا گیا۔ آگے چل کر ہی کیکاؤس اور سیادش کے بعد سیادش اور سعدی کا بیٹا تخت فارس کا وارث ہوا۔ اس کے بعد لہر اسب جب تخت نشین ہوا تو ملک فارس کا پایہ تخت بلخ کو بنایا گیا۔

لہر اسب کے بعد اس کا بیٹا یستاسف ملک فارس کا بادشاہ ہوا تو اس نے بلخ ہی کو اپنا پایہ تخت بنائے رکھا۔

میدوں پر اس وقت ہتامن (ہتامنوں) کی حکومت تھی۔ انہوں نے دنیا میں پہلی بار لکھنے کے فن کو رواج دیا۔ ظروف سازی اور ان پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کی کھدائی بھی انہی کے دور میں شروع ہوئی۔ ان کے وقت کے تقری اور برتنی (پیتل) کے پیالے اور گھوڑوں کا ساز و سامان ملنے کے علاوہ معمار کی کے نمونے اور اصطر کے علاوہ سوسا کے

مخلات، بڑے بڑے ستون، شاندار میزبیاں سبگ تراشی کی آرائشی پٹیاں، بائل اور آشوریہ کے مخلات کی یاد دلاتے

ہیں۔ ان کے مخلات میں قطار اندر قطار ستونوں پر ہلکی سی چھت ہوئی تھی جن میں شہنشاہ ملک فارس اور سیرونی ممالک سے آنے والے سفیروں اور امیروں کو بٹھایا جاتا تھا۔

☆☆☆

فارس کے لوگوں کا مذہب فطرت پرستی تھا۔ آریہ قوم مظاہر پرستی کا شکار تھی۔ روشنی، شفاف آسمان، آہنگ ہوا میں، حیات بخش بارشیں ان سب کی مقدس چیزوں کی طرح پرستش کی جاتی تھیں جبکہ ظلمت اور قحط سالی کو ملعون دیو تصور کیا جاتا تھا۔ مظاہر پرستی کے ساتھ وہ ایچھے آباؤ اجداد کی ارواح کی بھی پوجا کرتے تھے۔ مذہبی پیشواؤں کی جماعت نے اہل فارس کے ذہنوں پر مکمل قبضہ کر رکھا تھا اور جادو وغیرہ کے ذریعے وہ دیوتاؤں کے نزدیک ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

اس مظاہر پرستی کے دور میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ یہ اہل فارس کے قدیم مذہب کا بانی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زرتشت چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ جب زرتشت نے ان شرکاذہ حرکات سے لوگوں کو روکا تو لوگوں نے زرتشت کی مخالفت اس لیے شروع کر دی کہ وہ انہیں ان کے قدیم خداؤں کی عبادت سے روکتا ہے۔

زرتشت آذربائیجان کے صوبے کا باشندہ تھا اور اس کی پیدائش یوریا جیل کے مغربی کنارے پر ایک قصبے میں ہوئی۔ اس قصبے کا نام بھی یوریا تھا۔ اس کا عہد شباب تنہائی اور غلوت گزینی میں بسر ہوا۔ اس وقت وہ ہمیشہ غور و فکر میں مصروف رہتا اس کے مطابق اسے خواب میں سات مرتبہ بشارتیں ہوئیں۔ لوگ اس کی باتوں کو فضول سمجھتے تھے اور خاص کر آگ کو پوجنے والے نہ صرف اس کی مخالفت کرتے تھے بلکہ اس کی باتوں کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ زرتشت نے لوگوں کو ایسے معجزات دکھائے جنہیں عقل قبول کر سکے

اور اس نے خاص اشیاء کے بارے میں جو باتیں کیں، ان پر لوگوں نے اس کے گرد اکٹھا ہونا شروع کر دیا۔ مثلاً زید اس دن مرے گا اور فلاں شخص فلاں روز بیمار پڑے گا یا فلاں دن فلاں وقت فلاں شخص کے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔

ایک دفعہ زرتشت کے باپ نے ایک مجلس میں اپنے وقت کے بہت بڑے کاہن اور جادوگر کو دعوت دی کیونکہ اس عہد میں شرک کے علاوہ جادو اور نجوم پرستی کا بھی بہت زور تھا۔ اس نے اس کاہن کو اپنے کمالات دکھانے کے لیے کہا۔ جب زرتشت کو معلوم ہوا تو اس نے سخت احتجاج کیا اور التجا کی کہ برے راستوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کی



پارتھیا بھی ملک فارس کے دوسرے صوبوں کی طرح ایک صوبہ تھا جو خراسان اور استراباد کی حدود میں واقع تھا لیکن ملک فارس کا ایک حصہ تھا اور پارتھیا کے رہنے والے ملک فارس کو خراج اور دوسرے مالی اخراجات ادا کرتے تھے۔ پارتھیا قوم نے اپنے باہمت اور بہادر شخص ارٹھک کی سرکردگی میں یونان کو شکست دی اور عہد آشکانیاں کی بنیاد رکھی۔ پارتھیا قوم بڑی ہی بہادر قوم تھی۔ یہ وہی قوم تھی جس کی عورتیں بھی جنگجو تھیں۔ یہ اپنے مردوں کی طرح کھوڑوں پر سواری کرتے ہوئے دونوں پاؤں ایک رکاب میں کر لیتیں اور کھوڑوں کو تیز رفتاری سے دوڑاتی تھیں۔ یہ ماہر تیر اندازوں کی طرح بھاگتے ہوئے کھوڑوں پر اپنا رخ بھی تبدیل کر لیتی تھیں اور دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ کرنے کے ہنر سے بھی واقف تھیں۔

ارٹھک کی قائدانہ اور فاتحانہ صلاحیتوں کے باعث پارتھیا والوں نے بڑی شان سے اپنی آزاد حکومت کی بنیاد رکھی اور بحر ان کی فتوحات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پارتھیا کے لوگ کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے، دیگر جاہل اقوام کی طرح وہ اپنے اسلاف کے عقیموں کی عبادت کرتے۔ یہ لوگ بھی ہنانشیوں کی طرح زرتشتیوں سے متاثر ہوئے اور دواہدی خداؤں مازداہرن کو ماننے لگے۔ ان کے نزدیک مزدا، نیکی کا خدا تھا اور اہرن شر کا دیوتا۔ ان کے ہاں پھر سورج اور چاند کی پرستش بھی شروع ہوئی۔ جادو اور منتروں پر ان کا راسخ اعتقاد تھا۔ دل ڈیوراں لکھتا ہے۔

”پارتھیا کے ہاں جادو اور علم نجوم پر بڑا بھروسہ کیا جاتا تھا اور کوئی اہم کام شروع کرنے سے پہلے نجومیوں سے مشورہ کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جب سورج طلوع ہوتا وہ اسی وقت کی عبادت کرتے اور سورج کو اس کے پرانے نام ”سزرا“ سے یاد کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے آگ کی پرستش سے منہ موڑنا شروع کر دیا اور سورج چاند وغیرہ... کی پوجا میں اتنے محو ہو گئے کہ بڑے بڑے آتش کدے شندے ہو گئے۔“

یوریشین خانہ بدوش پارٹھین سے زیادہ وحشی تھے۔ پارٹھین اور یوریشین کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ وحشی صرف پارٹھین کے قابو میں آتے تھے مگر بعض اوقات پارٹھین بھی ان سے دب جاتے تھے۔

رومی عالمگیر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ جب تک پارٹھیا والے ان کی راہ سے نہیں ہٹ

ہو جاتا ہے کیونکہ بیماری اس بات کی علامت ہے کہ اس پر بڑی قوت نے قابو پایا ہے۔ اس لیے قریبی رشتے دار بھی اس کو نظر انداز کر دیں۔

جب کوئی زرتشتی قریب المرگ ہو جاتا ہے تو روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے سینے پر رکھ دیتے ہیں اور ایک کتا اس کے قریب لایا جاتا ہے۔ اگر وہ کتا اس روٹی کے ٹکڑے کو کھالے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص مر گیا ہے۔ مرنے کے بعد اس کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مرنے والے کو زمین میں دفن نہیں کرتے کیونکہ اس طرح مٹی جو کہ ان کے نزدیک پاک ہے، وہ پلید ہو جاتی ہے۔ اس کو نذر آتش کر کے بھسم بھی نہیں کرتے کیونکہ آگ ان کی معبود ہے۔ وہ اس کی آلائشوں سے ناپاک ہو جاتی ہے۔ وہ لاش کو ایک گہرے کنوئیں جس کو وہ دھمہ کہتے ہیں، اس میں لٹکا دیتے ہیں۔ گوشت خور پرندے کو، چیلپیں، اور گد بچھٹ جھپٹ کر اس کا گوشت نوح لیتے ہیں۔

ایک انگریز تاریخ دان ٹریور کی تحقیق کے مطابق جب زرتشت کی وفات ہوئی تو..... وہ مظاہر فطرت جن کی عبادت کو زرتشت نے بالکل ختم کر دیا تھا، وہ پھر واپس لائے گئے تھے اور امور مزدا کے ساتھ ساتھ ان کی بھی پوجا کی جانے لگی تھی۔ توحید خالص کے عقیدے کو اہل فارس نے آہستہ آہستہ ترک کر دیا اور قوم نے اپنی عبادت گاہوں میں پرانے بتوں کو بھی سجا کر رکھ لیا۔ شرک اور کفر کے جس بھنور سے زرتشت نے اپنی قوم کو نکالا تھا، وہ پھر بھنور میں پھنس گئے تھے۔

اسی دوران کوروش اعظم نے میڈیا والوں کو شکست دے کر اپنے جد ابجد ہمناس کی بنیاد رکھی۔ 331 قبل مسیح میں ہمناس (ہنانشیوں) کی سلطنت اپنے اقصیٰ کو پہنچی اور ان کی جگہ ملک فارس آشکانیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ آشکانی لوگ خانہ بدوش تھے اور ان کے قبیلے روس اور چین کی سرحدوں کے قریب میدانوں میں گھومتے رہا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ بھی ہنانشیوں کی طرح پارسی (فارسی) نسل سے تھے لیکن یہ ان سے زیادہ مذہب اور... اپنے طویل عہد حکومت میں اصلاً خانہ بدوش ہی رہے۔ جو ہنانشی ان دنوں اپنے وطن سے..... دور نکل کر جنوب شرق میں آباد ہوئے، اس صوبے کو ہنانشی پرتھو (پرسو، پہلو) کہتے تھے۔ رومن انہیں پارٹھیا والے (پہلوئی) کہتے تھے۔ پارٹھیا والوں اور یونان میں شروع دن سے ہی دشمنی رہی۔

☆☆☆

دیکھ رہا ہوں کہ حضور نہ تو درباری امور میں دلچسپی لے رہے ہیں اور نہ ہی کھانا پکھا رہے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میری طرح آپ کا ہر وفادار اس بات پر بہت رنجیدہ اور پریشان ہے۔“ ہجران نے تفصیل سے بتایا۔

”میں خود نہیں جانتا کہ اس کا کیا سبب ہے، لیکن اچھے چیتے مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ زرتشت.... کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے کہ وہ کسی پر اپنی مرضی اور اپنا فیصلہ نہیں چھوڑتا..... اور زبردستی کسی کو اپنے نئے دین کی طرف نہیں بلاتا۔“

کچھ دیر کے توقف کے بعد بادشاہ دوبارہ بولا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ وہ جگہ کہہ رہا ہے۔ بس یہی غم اور فکر مجھے نہ تو کچھ کھانے دیتا ہے اور نہ ہی کسی کام میں میراں لگتا ہے۔“ بادشاہ جب خاموش ہوا تو درباریان بولا۔

”بادشاہ سلامت! اس کی باتیں تو میرے بھی جی کو لگتی ہیں مگر اس کی تمام باتیں درست بھی نہیں ہیں، پھر اس کی تعلیم میں اس قدر الجھاؤ اور پیچیدگی ہے۔“ درباریان نے جواب دیا۔

”بات تو تمہاری بھی مجھے درست لگتی ہے مگر اس کے باوجود اس کی باتوں میں جو سچائی مجھے نظر آئی، شاید تم بھی اس تک نہ پہنچ سکو۔“ بادشاہ نے یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیا۔

زرتشت دھیرے دھیرے اپنی تعلیمات جاری رکھے ہوئے تھا۔ پہلے دس سالوں میں اس کے حلقہ عقیدت میں صرف ایک شخص داخل ہوا۔ جب وہ صوبہ خراسان کے شہر کھار میں گشتا سپ سے ملنے آیا اور اس کے سامنے اپنی تعلیمات کو رکھا تو اس بادشاہ کے وزیر کے دواڑے اور درباریان سے مکالمے کے بعد اس کی اپنی ملکہ اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے لیکن اس کے نئے دین کو ترقی اور عروج اس وقت حاصل ہوا جب بادشاہ گشتا سپ خود اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔

جب زرتشت کا دین اس کی سوچ کے مطابق \* اس قدر جلدی نہ پھیل پایا تب جوئی علماء نے ”ژند“ کے نام سے اس کی تفسیر لکھی اور اس کی شرح کو بھی عوام کیسے کیا۔ زرتشت کی تعلیمات میں یہ بھی تھا کہ آگ کی حرمت عبادت کرانے والے پر ہوتی پر بھی لازم ہے۔ وہ جب قربان گاہ پر مذہبی رسوم ادا کرنے لگے تو اپنے منہ پر کپڑا باندھ کر رکھے تاکہ اس کی سانس سے آگ آلودہ نہ ہو۔

ان کے نزدیک جب انسان بیمار ہو جائے تو وہ کسی خصوصی توجہ اور شفقت کا مستحق نہیں رہتا بلکہ وہ قابل نفرت

پرستش کی جائے کیونکہ وہی تمام انسانوں کا رب، قاضی الحاجات ہے۔ جادوگر نے زرتشت کو اپنے جادو کی قوت سے ڈراتا پایا۔ مگر زرتشت نے کہا کہ تیرا جھوٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرے پاس تمہاری ان تمام باتوں کا توڑ موجود ہے۔ جس سے میں لوگوں کو اپنی سچائی کا یقین دلاتا ہوں۔

اہل فارس شروع سے ہی خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے تھے جس میں کوئی نظام تھا، نہ اخلاق۔ اگر کسی شہنشاہ نے اس کی تربیت کی بھی تو کچھ عرصے بعد وہ سب کچھ بھلا کر دوبارہ اپنی اسی آبائی زندگی کی طرف پلٹ گئے۔ اہل فارس نے زرتشت کو اپنی اذیتیں دیں کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چیخ اٹھا اور خدا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے خدا سے کہا کہ میں ملک میں جاؤں، کس طرف کا رخ کروں۔ میرے عزیز واقرباء نے میری بات سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔

بالآخر زرتشت اس کے بعد بلخ کی طرف روانہ ہوا اور بڑی مشکلات سے بادشاہ کے دربار تک اسے رسائی حاصل ہوئی۔ دین زرتشت کے دشمنوں نے بڑی کوشش کی کہ اس کی آواز بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ کئی دنوں کی تنگ و دو کے بعد ایک دن بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔ زرتشت نے اور امور خدا کی عبادت کی طرف بادشاہ گشتا سپ کو دعوت دی۔

بادشاہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا لیکن اس کے دربار میں موجود پروہت، کاہن اور جادوگر اتنی جلدی اپنے آبائی دین سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ تین دن تک دونوں اطراف سے دلائل دیے جاتے رہے۔ جادوگروں، پروہتوں اور کاہنوں کی دلیلیں بڑی گنجلک اور پیچ دار تھیں جبکہ ان کے مقابلے میں زرتشت کی تعلیم نہایت سادہ دلائل پر مبنی تھی۔ بالآخر زرتشت کو ان پر فتح نصیب ہو گئی اور درباریوں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ اب انہوں نے زرتشت کے خلاف خفیہ سازشیں شروع کر دیں اور زرتشت کو قید میں ڈلوادیا مگر بادشاہ کے دل سے زرتشت کے دلائل اور تعلیمات کو نہ نکال سکے۔ ایک روز قید خانے کے نگران نے دربار میں جب تمام درباری جاچکے تو بادشاہ گشتا سپ سے کہا۔

”جہاں پناہ! اگر جاں بخشی کی جائے تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بڑے دنوں سے یہ بات میری روح کو بھینچوڑ رہی ہے۔“ نگران بولا۔

”ہاں..... ہاں کہو.....“ گشتا سپ نے جواب دیا۔

”میں کتنے دنوں سے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے



استراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفر اور دانشور و حکماء پیدا ہوئے۔ اسی دھڑلے باز پر فلسفہ پیدا ہوا مگر یہاں کی ایک ریاست-انتھن میں چاندی کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر شدید مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ ان سے زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ارسطو جو بذات خود ایک فلسفی تھا، وہ غلام کی یوں تعریف کرتا نظر آتا ہے۔

”مزدور ایک ایسا آلہ ہے جس میں جان ہو۔ یہ ایک مشین ہے، جس میں جان ڈال دی گئی ہے اور وہ تمام انسانی احساسات و شعور سے محروم ہے۔“

ایک دوسرا فلسفی افلاطون اسے پیچھے چھوڑتا ہوا یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

”اگر عوام الناس اور اہل فکر کے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور مقررہ وقت پر وہ پیدا نہ ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ بچہ جو جسمانی طور پر ناقص ہو، وہ لڑکا جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں، وہ کمزور مرد جس سے کوئی نفع نہیں وہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید نہیں (ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے) کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ اس مثالی شہر کے باشندوں کی تعداد اس سطح سے اوپر نہ ہو جن کی سعادت مندی کی ذمہ داری اٹھائی جاسکتی ہے۔“

یونان کا سب سے پہلا بادشاہ فلیکس تھا جسے گھوڑے پالنے کا شوق تھا بلکہ وہ ان کا عاشق تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام یاس اور بعض نے فلیکس بتایا ہے جو زیادہ مشہور ہے۔ اس نے سات سال تک یونان پر حکومت کی اور اسی کے بیٹے کا نام سکندر تھا۔

☆☆☆

سکندر کا باپ فلیکس ریاست مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ مشرق میں بابل سے اٹھ کر بحیرہ نضر کے مصر، شام، عراق اور فلسطین کے علاوہ مغرب کے دور دراز علاقوں پر فوجی حملوں اور ان کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت سے قبل یونانی ملک فارس کو سلا نہ خراج ادا کیا کرتے تھے جس میں بے شمار قیمتی تحائف کے علاوہ مرغی کے انڈوں کی شکل میں ڈھلے ہوئے اتنے ہی وزنی، ہنر شدہ سونے کے سکے بھی ہوتے تھے اور اس خراج کے ساتھ اظہار اطاعت کا مراسلہ بھی ہوتا تھا لیکن فلیکس کے بیٹے سکندر نے تخت پر بیٹھے ہی پہلے اپنے ارد گرد کی چھوٹی ریاستوں پر حملے کر کے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کیا۔

اگرچہ بہت مشکل مرحلہ تھا کہ وہ اپنی محدود آمدنی سے اپنا اور ہال بچوں کا پیٹ پالیں یا قرضہ ادا کریں۔ جب وہ مقررہ عید پر قرض نہ ادا کر سکتے تو ان کی جائیداد ان سے چھین لی جاتی اور بعض اوقات انہیں اپنی شخصی آزادی سے بھی محروم ہونا پڑتا۔ اس لیے غریب لوگ بڑی بے اطمینانی کا شکار تھے۔ اس کے علاوہ یونان کی دو مشہور ریاستیں انتھن اور سارنا تھیں۔ سارنا کے اصلی باشندے جو یونان کی پوری آبادی کا پانچ سے دس فیصد تھے، یہی طبقہ حکمران تھا۔ فوج بھی انہی کے جوانوں پر مشتمل تھی۔ وہ صرف یونان پر حکومت کرتے تھے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ سارنا کے شہریوں کو فوجی تربیت بڑی سختی سے دی جاتی تھی، جو لوگ فوجی تربیت حاصل کرنے سے معذور یا صحت کے لحاظ سے کمزور ہوتے یا جسمانی اعتبار سے عیب دار ہوتے، انہیں حکمران طبقے کی طرف سے اجازت تھی کہ ان کو ایک غاری یا پہاڑوں کے درمیان کسی ویرانے میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ سردی سے خود بخود مر جائیں یا کوئی درندہ انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ بھی ممکنات میں سے تھا کہ کوئی رحم دل غلام انہیں اپنالے۔ سات سال کی عمر میں بچے کی تربیت شروع ہوجاتی تھی۔ ان بچوں کو والدین سے الگ ہونا پڑتا۔ انہیں جسمانی ورزشوں کے ایک سخت امتحان سے گزرنا پڑتا۔ جب الوطنی دیکھیں کہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں پڑھنا اور گانا سکھایا جاتا۔ زیادہ زور جسمانی طور پر رکھتیاں لڑنے، دوڑنے اور جنگ میں اسلحے کے استعمال پر دیا جاتا تھا۔ انہیں چوری کے طریقے بھی سکھائے جاتے اور انہیں باقاعدہ اس بات کی تربیت دی جاتی کہ وہ چوری کرتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو گرفتاری سے بچائیں اور اگر کوئی بچہ گرفتار ہو جائے تو وہ اقبال جرم نہ کرے۔

اہل یونان لڑکیوں کو بھی حکومت کی نگرانی میں نہایت سخت ورزشوں سے گزارتے تھے اور باقاعدہ ان کے لیے ورزشوں کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ وہ صحت مند مائیں بن سکیں۔ یوں وہ بھی مردوں کی طرح فولادی اعصاب کی مالک بن جاتیں۔ وہ اپنے بچوں کو جنگ کے لیے بھیجتیں تو نصیحت کرتیں کہ دیکھو جنگ سے اپنی ڈھال لے کر لوٹنا یا اس پر تمہاری لاش آنی چاہیے۔ اہل سارنا نے زندگی کے منگلی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا جس کی بنا پر اقتصادی طور سے وہ ہمیشہ پسماندگی کا شکار رہے۔

یہ یونان ہی کی سرزمین تھی جہاں ابولفر فارابی،

تسلیم کر لیا اور نظام حکومت میں ترمیم کر دی گئی۔ مملکت روما کے عوامی نمائندوں کو یہ شکایت تھی کہ سلطنت کا قانون تحریری طور پر نہیں لکھا گیا اس لیے وہ اپنے حقوق کا پورا تحفظ نہیں کر سکتے۔ اس شکایت کے پیش نظر ایک خاص کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ جس نے پہلی مرتبہ 449 قبل مسیح میں رومی قانون کو تحریری شکل میں مرتب کیا۔ اس تحریری قانون کو ”بارہ تختیاں“ کہتے تھے کیونکہ یہ لکڑی کی بارہ تختیوں پر کندہ کر لیا گیا تھا۔

مگر ان اصلاحات کے باوجود ان کی وسیع و عریض سلطنت میں وقت کے ساتھ ہر طرح کی انتظامی اور معاشرتی خرابیاں رونما ہونے لگیں۔ ظاہری طور پر اگرچہ جمہوری حکومت اپنے تمام اداروں کے ساتھ قائم تھی لیکن اس کے یہ ادارے رفتہ رفتہ بے اثر ہوتے چلے گئے اور ان میں نہ یہ قوت رہی کہ بیرونی حملہ آوروں کی یلغار کے سامنے بند باندھ سکیں اور نہ اتنا دم خرما کہ وہ اندرون ملک بے چینی کی آغوشے والی لہروں کو قابو میں لاسکیں۔

پارتھیا نے بھی ملک روما کے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور روم پر چڑھائی کر کے اس کے بہترین جرنل کیرے کو شکست دی۔ رومیوں کے متعلق تاریخ دان کہتے ہیں کہ وہ یونانیوں کے جانشین ہیں کیونکہ ان کے سیاسی معاشرتی اور معاشی نظریات بڑی حد تک یونانی حکماء کے نظریات سے متاثر ہیں۔ یونان کا خطہ بحر روم کے شمالی ساحل پر واقع ہے اور یہ مختلف پہاڑی سلسلوں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان وادیاں ہیں جہاں آمد و رفت کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے باعث ایک متحدہ حکومت قائم کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونان کا خطہ بے شمار چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں پر مشتمل تھا جو کہ اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں کافی حد تک آزاد تھیں۔ زراعت صرف پہاڑوں کے درمیان وادیوں میں ہو سکتی تھی۔ اہل یونان بمشکل گزر اوقات کر سکتے تھے۔ سکندر اعظم کے زمانے تک ان لوگوں کی یہی کیفیت رہی۔ آبادی کی ضرورت مقامی چشموں سے پوری ہوتی تھی مگر ان چشموں پانی اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا جس سے پورے طور پر کاشتکار کی جاسکے۔ یونان کی ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ بھی تھی جس کے زرعی کسانوں کی زندگی کم آمدنی وجہ سے اور بھی اجیرن تھی۔ اس لیے وہ اپنے دولت مہسایوں سے قرض لینے پر مجبور تھے۔ قرض خواہ ہونے کے باعث انہیں قرض دینے، کم آمدنی کی وجہ سے مقررہ سود

جاتے، وہ اپنی اس خواہش کو بھی پورا نہ کر پائیں گے کیونکہ تین صدیوں سے یہ دونوں سلطنتیں آپس میں برسرِ پیکار تھیں۔ وہ بھی بار آپس میں ٹکرائیں تھیں مگر حتیٰ طور پر نتیجہ کسی کے حق میں نہیں نکلا تھا۔ روم کے فرماں روا اب اس بات کو تسلیم کرنے لگے تھے کہ جب تک پارتھیا والے ان کی راہ میں رکاوٹ بنے رہیں گے، وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ پارتھیا والے نہ صرف حصولِ اقتدار میں اہل روما کے حریف تھے بلکہ تجارت میں بھی وہ ان کے مد مقابل تھے۔ چین کا ریٹھ ملک فارس سے ہو کر روما پہنچ سکتا تھا۔ پارتھیا والے اپنی ضرورت پوری کیے بغیر مغرب کی طرف چینی ریشم پہنچنے ہی نہ دیتے تھے اور برآمد کی ہوئی چیز کی بڑی قیمت وصول کرتے تھے۔ پارتھیا والوں کو اگرچہ اپنے تیر انداز... فوجیوں کا دھم تھا تو دوسری طرف روما کے جمہوری حکمرانوں نے اپنی فوج میں فولادی نظم و نسق برقرار رکھا ہوا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح لیکہ یونانی تاریخ دان پولی بیس لکھتا ہے۔

”جمہوریت کے ابتدائی سالوں میں روما کے تمام شہریوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ فوجی خدمات سرانجام دیں۔ ان رومی سپاہیوں میں سے پہرے کی حالت میں جو سپاہی سو جاتے، ان کے خلاف کارروائی کے لیے فوجی عدالت کا اجلاس طلب کر لیا جاتا اور جو سپاہی مجرم ثابت ہوتا، اس پر سنگ باری کر کے اسے وہیں ختم کر دیا جاتا اور جو کسی وجہ سے زندہ بچ جاتے، ان کو گھروں میں واپس آنے کی اجازت نہ تھی اور خاندان کا کوئی فرد حکومت کے خوف سے انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رومی فوج میں رات کے وقت چوکیداری کے تقاضے بڑے اہتمام سے پورے کیے جاتے تھے۔ اس لیے رومی فوج کی کامیابیاں کشادہ دلانہ انعام و اکرام اور وحشیانہ سزاؤں پر موقوف تھیں۔ اسی بنا پر یہ جمہوری مملکت آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ برطانیہ سے مصر تک اور ماریطینیا سے آرمینیا تک رومیوں کا سلطانی پرچم لہرانے لگا اور اس وسیع و عریض مملکت کے باشندے اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے کہ وہ رومی شہری ہیں۔“

ابتدائی رومی جمہوریت کی حکومت، حکومتِ عدیدہ تھی (چند لوگوں پر مشتمل) یعنی اولی گارچی کیونکہ امراء کا ایک چھوٹا سا طبقہ تمام کلیدی سرکاری عہدوں پر مسلط تھا۔ عوامی نمائندوں کو طبقہ امراء کی اجارہ داری پسند نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ رومیوں نے عملی مصلحت پسندی کے پیش نظر عوامی نمائندوں کے مطالبات کو



ان فتوحات کی وجہ سے اس کا حوصلہ بڑھا تو اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے کی خاطر پوری دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت فارس میں دارا ابن دارا کی حکومت تھی۔ جس نے فارس کی مختلف ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد ایک بار پھر ملک فارس کو عظیم الشان کامیابیوں سے روشناس کروایا تھا۔ سکندر نے فارس کی اس پرانی رسم کو توڑتے ہوئے خراج دینے سے انکار کر دیا۔ جب دارا ابن دارا نے پہلی رسم کو دوبارہ سے جاری کرنے کا تقاضا کیا تو سکندر نے اسے لکھ بھیجا کہ وہ مرنے جو پہلے سونے کے انڈے دیا کرتی تھی، وہ مرنے لگی ہے۔

جب دارا کو یہ جواب ملا تو اس نے مقدونیہ پر فوج کشی کی دھمکی دی مگر سکندر نے 324 قبل مسیح میں ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ فارس پر حملہ کر دیا اور خراسان سمیت سارے فارس کو روند ڈالا۔ اس وقت سکندر کی فوج میں بحری بیڑے کے علاوہ چالیس ہزار جوان تھے۔ اس نے فارس کو فتح کرنے کے بعد دارا ابن دارا کو قتل کر دیا اور اس کی بیٹی روشتک سے شادی کر لی۔ اس شادی کے پیچھے بھی سکندر کا برسوں کا ایک خواب تھا۔ جہاں اس نے یونانیوں کو اہل فارس کے مستقل خطرے سے نجات دلائی، وہاں اس نے اپنی یونانی ثقافت کو فارس میں لانے کا بھی فیصلہ کیا اور دوسرے ہزاروں مقدونی شہریوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اہل فارس کے ساتھ رشتے دار یاں کریں جس سے دونوں سلطنتوں کی ثقافتیں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ سکندر فارس کے بعد ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوا۔ دارا ابن دارا فارس کے ہنانشیوں کے خاندان کا آخری فرمان روا تھا۔ اس کے بعد آشکانی برسر اقتدار آ گئے۔ سکندر نے افغانستان کو پامال کیا اور ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا۔ اہل علم کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ جب سکندر مقدونی اپنے دار الحکومت مقدونیہ اور اس کے گرد و نواح کے بحری و بری انتظام و استحکام سے مطمئن ہو کر اسکندر یہ پہنچا۔ اس نے وہاں عظیم عمارتوں اور سنگ رخام سے تعمیر کردہ چھوٹے بڑے میناروں کے آثار دیکھے۔ اس نے ان کے درمیان ایک ایسا سرخشاں مینار بھی دیکھا۔ جو زمانے کی سختیاں جھیلتا ابھی تک سر اٹھائے اسکندر یہ کی عظمت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس مینار کی فرش منزل پر مسندی تحریر میں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی جو میریوں اور کل مسیح سے بھی پہلے کے زمانے اور اسی زبان کے رسم الخط میں تحریر تھی۔

”میں شادا بن عاد..... ہوں۔ میرے ہاتھوں

ممالک کو قوت و پختگی حاصل ہوئی۔ میرے حکم سے بڑی بڑی چٹانیں اور پہاڑیاں کاٹی گئیں۔ میں نے باغ ارم تعمیر کیا ہے جس کی چار دیواری سنگ عمارت کی ہے۔ اس باغ کی مثال ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس باغ میں دنیا کے نادر ترین درخت، پھول اور پھل دار بوٹے جمع کر دوں اور اس میں دنیا کے معزز ترین شریف لوگوں کو بسا کر انہیں ہر قسم کی آسائشیں مہیا کر دوں۔ میں نے اب تک جو چاہا اسے جلد از جلد حاصل کر لیا لیکن پھر بھی مجھے اب رات کو نیند آتی ہے، ندوں کو سکون ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میری موت کا وقت اب قریب آچکا ہے۔ ویسے مجھے نہ کسی ظالم و مغرور بادشاہ کا خوف ہے، نہ مجھے کسی بڑے اور بہادر فوجی لشکر کا ڈر ہے لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرے بڑھاپے کی وجہ سے میری بہت سی مہمات اور مقصد پورے نہیں ہو سکے لیکن مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ میں بہت سے قابل قدر آثار چھوڑے جا رہا ہوں۔ جو شخص میرے ان آثار کو دیکھے اور اسے میرے جیسی طویل عمر اور گہری نظر حاصل ہو تو وہ جان لے کہ دنیا سرائے قاتی ہے۔ اس میں کسی کو سکون و قرار حاصل ہو سکتا ہے نہ کسی اور ہمیشہ کی زندگی مل سکتی ہے لہذا اس دنیا سے جی لگنا ناپیکار ہے۔“

اس کے آگے شادا نے دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی مال و زر اور شاہی جاہ و جلال کی تاپا نیاری کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا اور اپنی تحریر کے آخر میں پڑھنے والے کو دنیا کے مال و دولت کو مینے اور اس پر نظر رکھنے سے منع کیا اور لکھا کہ اسے اپنے آخر سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سکندر شادا کی تحریر کردہ اس عبارت کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کہاں تک اعتبار کرے۔ البتہ اس نے اسکندر کے طول و عرض کی پیمائش کا حکم دے کر اس کے بعد وہاں کی نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ جس کے لیے اس نے عسکر، سنگ رخام اور سنگ مرمر کے علاوہ دوسرے پتھر جزیرہ سیقلہ، افریقہ کے گرد و نواح، اطریطش اور بحر روم کے ارد گرد جو علاقے بحرا قیاقوس کے قرب و جوار سے متصل ہیں منگوائے اور انہیں وہاں سے لانے کے لیے بڑی بڑی کشتیوں کا انتظام کیا۔ اس نے کچھ پتھر اور دوسرا سامان روڈس کے جزیرے سے بھی منگوا یا تھا۔ یہ جزیرہ اسکندر یہ کے بالکل سامنے ہے۔ سکندر کے ذریعے سے اسکندر یہ تک کا فاصلہ ایک رات کا ہے اور یہ یورپ کا پہلا آباد جزیرہ ہے جہاں بہت سے صنعتی ادارے قائم ہیں۔ یہیں اس زمانے میں جنگی جہاز بننے تھے اور رومیوں کی

کثرت ہے جو اس سمندری راستے سے اکثر اسکندر یہ اور مصر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ سکندر نے شادا بن..... عادی مندرجہ بالا تحریر کا اعتبار اور اس کی نصیحتوں و ہدایات پر عمل کیا یا نہیں کیا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اسکندر یہ جو اس زمانے تک کسی خرابے کی شکل اختیار کر چکا تھا، اس کو نئے سرے سے بسانے کا ارادہ کیا۔ اور ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ جب اس نئے شہر کے چاروں طرف کھدائی کا کام شروع کیا تو اس نے اس کے گرد و نواح کی اونچی شاخوں کی باڑ لگوائی پھر اس باڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ٹکڑی کے موٹے موٹے ڈنڈے گڑوائے گئے اور ان کے سروں پر لوہے کی پتلی چلی سلاخیں کٹوا کر کٹھن لگوا دیے۔

سکندر نے مجوزہ نئے شہر کے درمیان اپنے قیام کے لیے پہلے ایک عمارت تعمیر کروائی تھی اور اس کے گرد اپنی فوج کے سرداروں اور سپاہیوں کے لیے چھوٹے بڑے عارضی مکان بھی تعمیر..... کروا دیے تھے۔ اس نے شہر کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ معماروں اور مزدوروں کے رہنے کے لیے کمرے بھی تعمیر کرادیے تھے تاکہ انہیں شہر کے تعمیراتی کام پر پہنچنے کے لیے دیر نہ ہو سکے اور وہ جلد از جلد اپنے کام پر پہنچ سکیں۔ اپنی قیام گاہ کی محبت پر اس نے ٹکڑی کا ایک بڑا بنوایا اور اس کے بیچ گرجا گھر کی طرح ایک بڑی سی کھلی لگا دی۔ اس کھلی میں سوت کی موٹی سی رسی بندھوائی جس کا ایک سرا اس نے اپنی خواب گاہ تک پہنچایا تھا اور اس رسی کا بڑا حصہ اوپر ہی اوپر سے باڑ کے ڈنڈوں میں لگائے ہوئے سرکنڈوں سے گزارا جن میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگائی تھیں جو کہ اس عمارت کے چاروں طرف موجود تھیں۔ سکندر کا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی دن صبح سویرے مہارک گھڑی دیکھ کر اپنی خواب گاہ کی رسی کا سرا کھینچے گا۔ جس سے برج کی بڑی کھنی جتنے لگے گی اور اس کے ساتھ ہی دوسری گھنٹیاں جو اسی کے طویل حصے میں لگائی باڑ سے بندھی ہیں وہ بھی جتنے لگئیں گی۔ اس طرح نئے شہر کی چار دیواری کی بنیادوں کے چاروں طرف ایک ہی وقت میں کام شروع ہو سکے گا۔ یہ بات معماروں اور مزدوروں کو پہلے ہی بتادی گئی تھی کہ جس مہارک گھڑی گھنٹیاں بجیں، وہ کام شروع کر دیں تاکہ ایک ہی وقت میں کام شروع ہو سکے لیکن قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ ایک دن صبح ہی صبح سکندر کے بیدار ہونے سے پہلے ایک کو اس رسی پر آ بیٹھا جو اس کی خواب گاہ تک جاتی تھی۔ کوہے کے ادھر ادھر پھدکنے سے نہ صرف

برج کی بڑی کھنی بلکہ اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بھی جتنے لگئیں۔ سکندر ہڑ بڑا کر اٹھا معمار اور مزدور بھی بولکھلا کر اٹھے اور اپنے کام میں جت گئے۔ سکندر نے یہ ماجرا دیکھتے ہوئے فوراً دوسرا حکم دیا کہ ابھی بنیادوں کا کام شروع نہ کیا جائے۔ اس دوسرے حکم پر شہر کے عام لوگوں کے علاوہ معمار اور مزدور بھی حیران ہوئے لیکن بادشاہ کا حکم سر آکھوں پر سمجھ کر کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ان احکامات کے بارے میں پوچھ سکے۔ سکندر بھی پہلے تو خاموش رہا لیکن اگلے ہی دن نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ ایک جگہ نئے شہر کی بنیاد کا پتھر لگا یا اور عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا مگر جلد ہی اسے ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ عمارتیں بننا شروع ہوئیں مگر جو عمارت دن بھر میں جتنی جتنی رات کو وہ گرا دی جاتی۔

سکندر جو اپنے استاد اسطو کی طرح ذہانت و تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس بات پر غور کرتا رہا کہ آخر ان عمارتوں کو گرا تا کون ہے۔ کون ہے جو رات کو یہ کارروائی انجام دیتا ہے کہ وہ دن بھر کی بنائی ہوئی عمارتوں کو رات میں گرا جاتا ہے۔ کئی کئی متواتر اسی طرح ہوتا رہا تو سکندر نے ایک رات جاگ کر اس کا کھوج لگانے کا سوچا۔ پھر ایک رات وہ جاگتا رہا تو اس نے دیکھا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد عجیب و غریب شکلوں کے قد کاٹھ میں اونچے اور مضبوط جسموں کے مالک جو پائے سمندر سے نکلے اور دن بھر میں جو عمارتیں تیار ہوتی تھیں، انہیں توڑ پھوڑ کر وہیں سمندر میں حل گئے۔

سکندر بھی اپنی ذہن اور ضد کا پکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ہر حال میں اس نئے شہر کو بسانا ہے۔ اس لیے اب اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس نئی مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک نئے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے شیشے کا ایک مضبوط تابوت بنوایا۔ اس کے پینڈے پر تانبے یا کسی ایسی دھات کی موٹی چادر چڑھوائی جو تابوت کو سمندری نمکیات اور لہروں کی شکست و ریت سے محفوظ رکھ سکے اور اوپر بڑی کی دوائی لگی اور ایسی مضبوط نالیاں لگوائیں جن کے ذریعے تابوت میں ہوا تو جاکے مگر پانی نہ آ سکے اور اگر یہ تابوت سمندر کی گہرائی میں تک بھی چلا جائے تو نالیاں صبح آب سے اوپر رہیں۔ یہ سارے ضروری اور حفاظتی انتظامات کر کے وہ اس تابوت کو دو کشتیوں پر ادھر ادھر رکھ کر سمندر میں دوڑنے لگے کیا پھر خود تابوت میں لیٹ



## ماہر نباض

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کوئی حکیم صاحب تھے جنہوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رتی کے ایک سرے سے پردہ نشین خاتون کی کلائی کو باندھ دیا جاتا اور دوسرا سرا پرے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچا دیا جاتا۔ حکیم صاحب نباض میں اس قدر ڈکی اٹھن واقع ہوئے تھے کہ رتی پر لپٹی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور شخص محل کر کے نسخہ لکھ دیتے تھے۔

ایک دن یار لوگوں کو دل لگی سوچی۔ وہ نہایت عجیبی سی حکیم صاحب کو بلا کر لے گئے۔ مگر کے اندر رتی کے ایک سرے سے ایک لٹی کی ٹانگ کو باندھ دیا اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھا کہ عرض کیا کہ حضور میری نبض دیکھ لیجئے۔

حکیم صاحب نے رتی پر انگلیاں رکھیں اور فرمانے لگے کہ ”میرے کچھ کھانسی ہے اور ابھی ہضم نہیں ہوا۔“ یار لوگ بے اختیار نبض دیے اور حکیم صاحب کے کمال نباضی کے حاش ہو گئے۔

(مراسلہ نگار: انجمن جیل صدیقی..... کراچی)

## عیادت

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار کا نہیں، اس لیے میں مرزا کے اعزاز عیادت کی طرف لوٹا ہوں۔ وہ جب تہذیبی کلام انبیاء اور تمام جرائم کی جزا قرار دیتے ہیں تو مجھے ردہ کراچی خوب نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تہذیب کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میں کان کے درد سے غدا حال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ مسائل بیان کر کے میری ذخرا سب بندھائی۔

”میاں ہمت سے کام لو۔ بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔“

میں درد سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے، میں بغیر دعویٰ نبوت یہ مذاہب جھیلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ حق“ سے اقتباس

اگست 2018ء

بڑے نیلے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کبھی پورس کا صدر مقام تھا۔ اگر اس نیلے پر کھڑے ہو کر پاؤں زمین پر زور سے ماریں تو اس کی دھبک حیران کن فاصلے تک پہنچتی ہے اور یہیں سے وہ پرانا راستہ بھی دکھائی دیتا ہے جہاں سے یقیناً بھی دریا گزرتا ہوگا اور شہر کے گرد اگر دھیم دائرے کی شکل میں ایک قدرتی رکاوٹ کا کام دیتا ہوگا سیکندر کا درباری اور قانع نگار ایرانی یونانی فوجوں کے ساتھ تھا۔ اس نے یہاں کئی روز تک جاری رہنے والی جنگ کا احوال بیان کیا ہے۔ جنگ کے آخری دن کے بارے میں وہ لکھتا ہے۔

”تیس ہزار پیادے اور چار ہزار شہسواروں نے اس میں حصہ لیا۔ تین سو بگلیاں اور دو سو باغی اس کے علاوہ تھے۔“ اس جنگ میں ایرانیان کے مطابق پورس کے بیس ہزار پیادے اور تین ہزار گھڑسوار ہلاک ہوئے۔

یونانی ذرائع کے مطابق اس جنگ کے لیے سیکندر دریا کو غیر متوقع طور پر عبور کر کے ایک شاطرانہ چال کے ذریعے پورس کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہلکے ہتھیاروں سے لیس مقدونیہ کے گھڑسوار ہتھیوں کے ساتھ آنے والی پورس کی ست رو فوج کی صفوں میں حشر پرا کر دیتے ہیں۔ باغی گھبرا کر پھلتے ہیں اور اپنی ہی پیدل فوج کو روند ڈالتے ہیں۔ خوب صورت اور دراز قامت پورس زخمی ہو کر گرفتار ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر گھوڑے زخم ہیں اور وہ مشکوں سے اپنے پاؤں پر گھڑا ہو پارہا ہے لیکن جب قانع سیکندر اس سے پوچھتا ہے کہ وہ اس سے کس قسم کی توقع رکھتا ہے تو پورس بہادرانہ شان سے جواب دیتا ہے۔

”وہی سلوک جو میرا حق ہے اور ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔“

سیکندر اس کے جواب اور دلیری سے بہت متاثر ہوا اور اس کی سلطنت دوبارہ اسے دے دی۔ اس کے بعد مہم کے جہلم مکمل کر کے سیکندر نے ایک دم جنوب کا رخ اختیار کیا اور پورس کی حدود سے کٹ کر آکر تھان کی طرف چلا گیا۔ راستے میں وہ کہیں بھی مشرق کی سمت نہیں مڑا۔ جہلم اور پنجاب جہاں اکٹھے ہوتے ہیں وہاں سے وہ دریا عبور کر کے مشرقی کنارے گیا۔ ایک معروف تاریخ نویس یہ کہتا ہے۔

”پورس سے جنگ اس یونانی ذہین جرنیل کے لیے آفری تھی۔ تجربہ ثابت ہوئی۔ سیکندر بے شک کتنا ہی لاپچی ہو گا لیکن خود اس کی فوج بغاوت پر آمادہ ہو چکی تھی اور جنگوں انہوں نے ہمالیہ پر اُگنے والے جڑ کے درختوں سے

سیپٹس ڈائجسٹ

چھچھا چھوٹنے کی تدبیر پر پوری زندگی خوش ہوتا۔ نئے شہر کی مضبوط فصیلیں اور خوشنما عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں۔ درلوہ اپنے وائس مند بادشاہ کی بے نظیر ذہانت پر اسے داد دیتے رہے۔ جب نیا شہر ہر لحاظ سے مکمل ہو کر تعمیر ہو گیا تو اس نے شہر کا نام اس کی بنیاد رکھنے والے کے نام پر اسکندر یہ رکھا گیا اور یہ آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسکندر یہ اب بھی اپنی مہمیں عمارتوں کی وجہ سے رات کے وقت دن کی چمک دمک اور روشنی کو شرماتا ہے۔ ویسے دن کے وقت بھی ان پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہونے لگتی ہے۔ اسکندر کے بارے میں کچھ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ اس شہر کو مصر کی ملکہ ”دلوکہ“ نے تعمیر کرایا تھا تاکہ وہ مصر پر کسی حملہ آور دشمن کے لیے پہلا مورچہ بن جائے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اسے مصر کے دسویں فرعون نے تعمیر کرایا تھا جس نے اہرام مصر تعمیر کرائے تھے اور یہ کہ سیکندر نے چونکہ دنیا کے بیشتر ممالک فتح کر لیے تھے اس لیے اس کی وجہ شہرت سے اس شہر کو بھی اسکندر یہ کہا جانے لگا۔ ورنہ مصر کے لوگ تو سیکندر سے بے حد نفرت کرتے تھے کیونکہ اس نے اس شہر کو تباہ و برباد کیا تھا پھر اس کی تعمیر اس کے نام کے ساتھ کس طرح منسوب کی جاسکتی ہے۔ تاہم بعض کا کہنا ہے کہ وہ سیکندر یہ تھا جس نے اسے فتح کیا اور تباہ و برباد کرنے کے بعد دوبارہ از سر نو تعمیر کرایا۔ اس لیے یہ شہر اب تک اسی کے نام سے منسوب ہے۔

سیکندر فارس کو فتح کرنے کے بعد اور اسکندر یہ کے علاوہ بے شمار عمارات اور کئی ریاستوں کو فتح کرتا ہوا ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوا اور اسے روندنا ہوا دریا سے سندھ کو عبور کر کے کیسلا باپتیا۔ یہاں کے آہستھی نامی حکمران نے رضا کارانہ طور پر یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

”یہاں ایک نہیں دو بادشاہوں کے لیے بھی دولت کے انبار موجود ہیں تو مجھ پر بے وجہ لڑنے اور خون خرابا کرنے کا فائدہ۔“

اب سیکندر دریا کے جہلم کی طرف بڑھا۔ جسے یونانی بائبل میں کہتے تھے۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں اسے شدید اور خوف ناک مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں مقدونیہ کے سیکندر کا مد مقابل پنجابی شہزادہ پورس تھا جسے ”نو“ بھی کہا جاتا تھا۔

راجا پورس ایک بڑی راجدھانی کا حکمران تھا جس کا دار الحکومت دریا کے جہلم کے کنارے کہیں تھا۔ تحصیل پچالیہ مقدونی حملہ آور کے گھوڑے بوی فیکس سے منسوب ہے۔ اس کے قریبی گاؤں لاکھنے وال کے نزدیک ایک بہت

گیا اور ہر شہر کے ملاحوں کو حکم دیا کہ وہ پٹن کے موٹے رسوں کے ذریعے اسے سمندر میں نیچے تک اتار دیں کہ سمندر کی تباہی جاتے پھر ملاحوں سے کہا گیا کہ جب تک وہ واپسی کا اشارہ نہ کرے، اسے تباہ میں رہنے دیا جائے۔ تاہم سمندر میں اس وقت تک گہرائی میں جانے دیا گیا جب تک سیکندر کے حکم کے مطابق وہ میں نہ پہنچ گیا۔

یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ جس جگہ سے تاہوت کو سمندر میں اتارا گیا، اس کے ارد گرد دور تک سمندری چٹانیں موجود نہ تھیں اور دن کا وقت ہونے کی وجہ سے پانی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ سمندر میں وہی اونچے گے خوف ناک جانور ہر طرف دوڑتے پھر رہے تھے جن کی صفیں وہ رات کے وقت نہ دیکھ سکا تھا۔ سیکندر نے ان کی شکلیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں تو رسوں کے ذریعے کشتیوں کے ملاحوں کو اشارہ کیا کہ وہ تاہوت کو باہر بھیج لیں۔ جب وہ سمندر کی سطح پر آ گیا تو ملاحوں سمیت دوسرے لوگوں نے دیکھا کہ سیکندر ہشاش بشاش باہر نکلا تھا اور اس کے چہرے پر عام دنوں کے برعکس ہنسی کھیل رہی تھی۔

سیکندر نے اسی دن ان سمندری جانوروں کی شکلوں اور ان کی جسامت کا نقشہ یونان کے ان ماہر مجسمہ سازوں کے سامنے پیش کیا جنہیں وہ اپنے ساتھ اس شہر میں لایا تھا۔ اس نے یہ نقشہ ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرایا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ نقشہ اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہو گیا ہے تو انہیں حکم دیا کہ وہ پتھر کے بجائے لکڑی کے موٹے ٹکڑے جوڑ کر انہی شکلوں اور جسامت کے مجسمے تیار کریں اور ان پر ایسا رنگ و روغن کریں جو رات کے اندھیرے میں فاسفورس کی طرح چمکے۔ سیکندر کے حکم کی دیر بھی کہ دو تین روز ہی میں وہ مجسمے بن کر تیار ہو گئے اور ان پر ایسا ہی رنگ و روغن کر دیا گیا جیسا سیکندر نے حکم دیا تھا۔ ایسے بے شمار مجسمے ہر ذریعہ تعمیر عمارت کے سامنے اور اس کے گرد رکھ دیے گئے۔ جن دنوں میں یہ مجسمے تیار ہو رہے تھے، ان دنوں میں یہ جانور سمندر سے نکل کر ان عمارتوں کو روند کر گئے تھے لیکن جس دن شام کو وہ مجسمے ہر عمارت کے ارد گرد رکھ دیے گئے، حسب معمول اس رات بھی وہ آئے لیکن اندھیرے میں اپنی ہی شکل کے ان چمکتے دیکھتے مجسموں کو دیکھ کر جو بوجہ انہی کی طرح اصلی جانور نظر آتے تھے، پہلے تو گھٹے پھر واپس مڑے اور تیزی سے بھاگتے ہوئے سمندر میں ایسے غائب ہوئے کہ اس کے بعد کسی کو بھی نظر نہ آئے۔ سیکندر اپنے اس لا جواب منصوبے اور ان سے ہمیشہ کے لیے

اگست 2018ء

سیپٹس ڈائجسٹ







اور ساری جاکھاو بھی اپنے قبضے میں کر لی۔ اردوان کی اس حرکت سے اردشیر پر اس کے فتح کی قیامت بھی مکمل گئی۔ اس نے اردشیر کے بجائے فارس کا گورنر اپنے بیٹے کو بنا دیا۔ تب پہلی بار اردشیر کو احساس ہوا کہ اب اس کا اردوان کے پاس رہنا فضول ہے۔ اسے جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اردشیر کتنے ہی دن اس بات پر غور کرتا رہا کہ وہ کس طرح اور کس وقت یہاں سے بھاگے۔ داروغہ اصطبل کی ڈیوٹی دیتے ہوئے اسے کتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا مگر اس کے بھاگنے کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اپنے طور پر اس نے بہت کوشش کی لیکن اردوان کے وفادار دیکر لوگوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ خوش نواز اردوان کی ایک خاص کنیز بھی جسے اس نے محض اردشیر کی نگرانی کے لیے اصطبل میں ڈیوٹی دے رکھی تھی۔ وہ دن میں ایک دوسرے اصطبل میں چکر لگاتی اور پھر واپس چلی جاتی۔ یقیناً وہ واپس جا کر اردوان کو سب اچھا کی رپورٹ دیتی ہوگی۔ ایک رات اردشیر جب سونے کی تیاریوں میں تھا اور تینہ ابھی اس سے کوسوں دور تھی، تب اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ اگر اسے اردوان کے اس قید خانے سے نکلنا ہے تو اسے اردوان کی کنیز خاص سے مدد لینا ہوگی۔

اگلے ہی روز اردشیر نے خوش نواز کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ پہلے تو وہ اس سے گفتگو ہی نہیں کرتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی چٹکی چڑی باتوں میں آ گئی۔ ”تمہاری بھی میری طرح اس اصطبل میں ڈیوٹی لگی ہے؟“ ایک روز اردشیر نے اس سے پوچھا۔

”بس یہی جان لو.....“ خوش نواز نے جلدی سے جواب دیا اور دوسری طرف نکل گئی۔

”مجھے تو میرے نانا نے اپنے ہاتھوں اس دربار میں بھجوا یا تھا لیکن تم.....“ اردشیر نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور مجھے میرے گھروالوں کی مجبوریوں نے یہاں لا ڈالا ہے۔ ویسے مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ میں جس طرح اصطبل میں آتی ہوں، اسی طرح میں دربار اور محلات میں بھی آ جاسکتی ہوں۔“

”مجھ نہیں آتا۔ بادشاہ ساری دنیا کی خوبصورتیاں اپنے ہی پاس کیوں اکٹھی کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اب دیکھو تم جو تیلوں کی طرح خوب صورت اور نازک ہو، تمہیں نہ جانے کیوں اپنے ارد گرد رکھا ہوا ہے۔ تمہیں تو کسی بادشاہ کی بیوی ہونا چاہیے.....“ اردشیر نے اس کی

تعریف کر کے اپنے جال میں لانے کی کوشش کی کیونکہ اردشیر کو علم تھا کہ چالپوسی اور تعریف ہر انسان کی کمزوری ہے۔ اردشیر بھی یہی حربہ خوش نواز پر بڑی ہنرمندی سے آزما رہا تھا۔

پھر اسے جلد ہی کامیابی بھی مل گئی۔ اب خوش نواز اصطبل میں آتی تو دیر تک اردشیر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہتی۔ آخر ایک روز خوش نواز نے خود ہی اس سے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم نوجوان ہو، خوب صورت بھی ہو، طاقت ور اور دلیری بھی لگتے ہو پھر بادشاہ کی قید میں کس طرح دن گزارتے ہو۔“

”میرے پاؤں کی اصل زنجیر میرے نانا حضور پاک ہے۔ میں یہاں ساری عمر اپنا جوں کی طرح گزار رہے ہوں۔ نانا جان کچھ روز پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ اردشیر نے اسے بتایا۔

”بہت مشکل ہے پر دیکھ..... اردوان بہت ہوشیار آدمی ہے۔ تم خود کو اس کی نظروں سے دور رکھتے ہو مگر جان لو کہ اس کی نظریں ہر وقت تم پر ہوتی ہیں۔ مجھے تم جیسے خوب صورت اور دلیر نوجوان سے ہمدردی ہے۔ اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کا کیا ارادہ کر لیا ہے تو اس کی ایک صورت ہے۔“

خوش نواز نے مسکراتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ ”کون سی صورت ہے..... میں اپنی آزادی کے لیے ہر کام کر سکتا ہوں۔“ اردشیر نے جلدی سے جواب دیا۔

”میں تمہیں یہاں سے نکل سکتی ہوں مگر اس کے لیے میری بھی ایک شرط ہے۔“ خوش نواز نے اسی دلچسپ انداز سے کہا۔

”مجھے بتاؤ تمہاری کون سی شرط ہے۔ میں تمہاری ہر شرط اپنی آزادی کے لیے ماننے کو تیار ہوں۔“

”میرے ساتھ شادی کرو گے.....؟“ خوش نواز نے فوراً جواب دیا۔ ”تمہیں ایک اور بات بتاؤں، ابھی کل ہی شاہی نجوی باتوں میں بادشاہ حضور کو بتا رہا تھا کہ اگر اسی ہفتے اردوان کا کوئی خاص ملازم فرار ہو جائے تو وہ ملک فارس کے تخت و تاج کا مالک بن جائے گا۔ میں اسی وقت سے یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں وہ ملازم تم ہی تو نہیں ہو.....“ خوش نواز نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

تب پہلی بار اردشیر کو محسوس ہوا جیسے اب اس کی آزادی کے دن آنے لگے ہیں۔

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے.....“ اردشیر نے

دھوکے باز

جواب دیا تو خوش نواز جھوم جھوم گئی۔

”ٹھیک ہے ہر آج رات کو تیار رہنا۔ میں کسی بھی وقت تمہارے پاس آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے کر نکل جاؤں گی۔“ خوش نواز نے اردشیر کے گال چھپاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

اس رات وہ اسی شش درج میں جاگتا رہا کہ ہو سکتا ہے خوش نواز اپنا وعدہ بھول جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو مکمل نہ کر پائے۔ اس کی آنکھیں نیند سے پوٹھل ہو رہی تھیں مگر وہ جاگ رہا تھا۔ بالآخر جب صبح کی سپیدی اپنی آنکھیں کھولنے لگی تو خوش نواز بڑی آہستگی سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔

”جاگ رہے ہو..... تو جلدی سے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ.....“ خوش نواز نے اس کے نزدیک آ کر آہستگی سے کہا تو اردشیر فوراً اٹھا اور اس کے ساتھ ہو گیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اردوان کے محل سرائے سے تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے کھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ لگتا تھا جیسے کوئی ان کی طرف آ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد ایک گھڑ سوار ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ”کہاں مر گئے تھے..... اتنی دیر لگا دی۔“ خوش نواز نے تکی سے پوچھا۔

”وہ..... بادشاہ سلامت کو آپ کے بھاگنے کی خبر مل گئی ہے۔ انہوں نے چار ہزار سپاہیوں کا لشکر آپ کو ڈھونڈنے پر لگا دیا ہے اس لیے مجھے نکلنے میں دیر ہو گئی۔“ گھڑ سوار نے جواب دیا۔

خوش نواز نے اسی لمحے بڑی پھرتی کے ساتھ اردشیر کی کریم گلی کو اڑائی۔ اس سے پہلے کہ اسے اپنے بچاؤ کا خیال آتا، اس نے تیزی کے ساتھ اس کا سرا ڈا دیا۔

”حرام زادہ..... مجھ سے محبت کے بھی گن گاتا تھا اور شاہ کی وفاداری کا بھی پاس رکھتا تھا۔ ہمارے بھاگنے کا صرف اس کو علم تھا، اسی نے بادشاہ کے آگے خبری کی ہوگی۔“ خوش نواز نے سنجیدگی سے کہا تو اردشیر کے منہ سے نکلا۔

”اف پار تھا کی دلیر اور بہادر عورتیں!“

وہ دونوں بھاگ کر اصطبل میں آ گئے۔ اردوان انہیں پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ پاک کے سرداروں نے جب سنا کہ اردشیر واپس آ گیا ہے تو وہ تمام اموال اور املاک اس کی تحویل میں دینے کو آ گئے اور سب نے اس کے سامنے حاکم و فاداری اٹھایا اور اردوان کے بیٹے کو شہر اصطبل سے الال دیا۔

اصطبل پر قبضہ کرنے کے بعد اردشیر نے ارد گرد کی ریاستوں کے سرداروں کو خطوط لکھے کہ اس کی اطاعت قبول کر لی جائے اور اسے تادان کی باقاعدہ ادائیگی کی جائے ورنہ وہ اپنے لیے برے وقت کا انتظار کریں۔ کچھ سرداروں نے اطاعت قبول کر لی۔ بعض نے انکار کر دیا اور بعض غیر جانبدار رہے۔ اردشیر نے بہت جلد ان ریاستوں کو زیر کر لیا جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ابھی وہ ان کاموں سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دارا الجبر ویش اس کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ اردشیر نے اس بغاوت کے ساتھ بڑی سختی سے نپا اور بعد میں فارس کے صوبے پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب اس ہم سے فارغ ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے کے لیے شہر کرمان پر فوج کشی کی اور شاہ کرمان وگلش کو گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ ساحل فلج فارس کو بھی فتح کر لیا۔ صوبہ فارس اور کرمان کو مکمل طور پر فتح کرنے کے بعد اس نے فیروز آباد میں ایک محل اور آتش کدہ تعمیر کرایا۔

اردشیر نے دوسرے سرداروں کے ساتھ ساتھ اردوان کو بھی اپنی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی تھی لیکن اردوان نے اس کا بڑی حقارت سے جواب دیا اور ساتھ ہی خوزستان کے شاہ کو حکم بھیجا کہ وہ اردشیر سے لڑنے کے لیے جائے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر قید خانوں لائے۔ اس بات کا اردشیر کو بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے خوزستان کا شاہ اس پر چڑھائی کرتا اس نے خوزستان پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دینے کے بعد شاہ ہوات پور پر حملہ کر کے اسے بھی شکست دے کر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے دریاے دجلہ کے دہانے پر قائم ایک چھوٹی سی ریاست نصیبن کو فتح کر لیا۔ اس وقت اس ریاست پر عمان کے عربوں کا قبضہ تھا جو ان عربی قبائل کے پیشرو تھے جنہوں نے اسی زمانے میں حیرہ میں اپنی حکومت قائم کی ہوئی تھی۔

ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اردشیر نے اردوان پر حملہ کر دیا۔ اردوان اس وقت ”دجل“ میں مقیم تھا۔ بڑے سخت مقابلے کے بعد اردوان محصور ہو گیا۔ محاصرہ اتنا بڑھا کہ اہل شہر کا کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور وہ بھوک سے مرنے لگے۔ جب اردوان نے یہ صورت حال دیکھی تو شہر سے باہر نکلا اور ہرمزدگان کے میدان میں بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اردوان اس لڑائی میں مارا گیا۔ بعض تاریخ داں کہتے ہیں اس نے محاصرے سے تنگ آ کر خود کشی کر لی تھی۔ اس کے بعد اردشیر ۱۲۸ پرل 224



دیا۔ مشہور تاریخ دان طبری کے مطابق شاہ پور نے اصل میں ساسانی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ تخت نشین ہوتے ہی شاہ پور اول کو اس کے والد اردشیر کی وصیتیں اور کتابیں ملیں۔ جو اردشیر کے ساتھیوں اور رفقاء کے کار کے پاس ابھی تک محفوظ پڑی تھیں۔ اردشیر نے اپنے بیٹے کو جو خصوصی وصیتیں کی تھیں، ان میں تھا۔

”اے بیٹے..... یاد رکھ کہ دین اور ملک دو بھائی ہیں۔ کسی بادشاہ کے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بے نیازی کا برتاؤ کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ دین ملک کی اساس ہوتا ہے اور ملک دین کا محافظ..... جس ملک کی بنیاد نہ ہو، وہ برباد ہو جاتا ہے اور جس چیز کا کوئی محافظ نہ ہو، وہ ضائع ہو جاتی ہے..... اس لیے تمہارے لیے میری وصیت ہے کہ دونوں کی ہر حال میں حفاظت کرو۔“

اپنے بیٹے کو وصیت کرنے کے ساتھ ساتھ اردشیر نے اپنے ملک کے بڑے اور مشہور لوگوں کو جو خطوط لکھے، وہ بھی پند و نصائح سے بھر پور تھے۔ اس نے اپنی رعایا کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

”ملک الملوک (شہنشاہ) کی طرف سے ان لوگوں کی جانب جن کے سپرد ملکی انتظامات ہیں۔ ان دانشوروں اور علماء کرام کی جانب جو مذہب کے ستون ہیں اور ان لوگوں کی جانب جو ملکی تعمیر کے ذمے دار ہیں۔ ان جنگی سرداروں کی طرف جو جنگی اصولوں اور موقع محل کو سمجھتے اور ان پر عبور رکھتے ہیں۔ تم سب پر سلامتی ہو۔ واضح رہے کہ ہمارا شمار اب نیک بندوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی رعایا کے بہت سے امور کو اپنی نیکی اور اپنے (خدا داد) عروج ہی کی بنا پر ترقی دی ہے۔ اب ہم تمہیں بطور نصیحت (وصیت) جو کچھ بتا رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں، اسے گرہ میں باندھ لو۔ آپس میں کبھی تفرقہ بازی نہ کرو کیونکہ اس سے دشمن تم پر غالب آ جائیں گے۔ اخراجات میں حد سے نہ مگرو، ورنہ تنگ دست ہو جاؤ گے۔ مسافروں کو پناہ دو اور ان کی مدد کرو جس کا اجر تمہیں آخرت میں ملے گا۔ ازدواجی سلسلہ اپنے عزیز و اقارب ہی میں رکھو کیونکہ وہ کسی لحاظ سے تم سے قریب تر اور اس کے حق ہیں۔ دنیا ہی کے نہ رہو کیونکہ دنیا کی کا ہمیشہ ساتھ نہیں رہتی۔ نہ اسے ترک کرو کیونکہ وہ زندگی کے لیے ہی ناگزیر نہیں بلکہ دنیاوی اعمال ہی آخرت میں وسیلہ نجات بنیں گے۔“

مؤمنین کے مطابق اردشیر بہت زیرک، عادل اور اپنی رعایا کے آرام کا طلب گار تھا۔ اس کا ایک قول ہے جو

اردشیر کا قول تھا کہ شرافت و نجابت سے معاشرہ سنورتا اور گھرتا ہے جبکہ بد اعمالیوں اور شرپسندی سے اس کی بڑائی کو نقصان پہنچتا ہے۔ گندے اذہان کے مالک لوگوں سے معاشرہ بھی برائیوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

اردشیر ہی کا کہنا تھا کہ بادشاہ کے لیے لازم ہے کہ عدل و انصاف کے ذریعے لوگوں کو فیض پہنچائے کیونکہ عدل و انصاف ہی ایک ایسا قلعہ ہے جو مملکت کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھتا ہے۔ بزرگوں کو احقانہ ہنسی مذاق سے پچتا چاہیے۔ بادشاہوں کے درباری اور ساتھی صورت و شکل سے مہذب و منسوب ہوں۔ صاف ستھرا لباس رکھتے ہوں جس سے دوسروں کی نگاہیں خوشی اور فخر محسوس کریں۔ آداب گفتگو اور موقع محل سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اشاروں اور کنایوں کو سمجھیں اور اخلاق نبیل سے دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔ اردشیر نے بارہ سال مسلسل ارد گرد کی ریاستوں سے جنگ کر کے انہیں زیر کر لیا تھا جس سے دوسرے سرکش و باغی حکمران بھی اس کے اطاعت گزار بن گئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے اردوان کو قتل کیا تھا اور سب سے آخر میں ایک خود ساختہ بھٹی بادشاہ کو قتل کیا تھا جو عراق میں قصر بن نبیرہ کے مقام پر تخت نشین ہو کر خود کو شہنشاہ کہلانے لگا تھا۔

☆☆☆

شاہ پور ساسانی حکمران اردشیر کا پوتا تھا جو اردشیر کے بعد اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اردشیر نے آشکانی خاندان کی ایک شہزادی سے شادی کی جس کا نام ارسا سید تھا، جسے لیڈی میراؤ بھی کہتے تھے۔ جس کا ذکر یہودیوں کی کتاب تالمود میں افراہمز کے نام سے موجود ہے۔ یہ نہایت خوب صورت اور ذہین عورت تھی جو شاہ اردوان کی بیٹی یا اس کے چچا کی لڑکی تھی۔ ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ اردوان کے لڑکے فرخاں کی بیٹی تھی، اردشیر کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے خود کو آشکانیوں کا جائز وارث ثابت کرنے کے لیے آشکانی خاندان میں ضرور شادی کی ہوگی۔ شاہ پور اسی آشکانی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور اسے اردشیر نے اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ شاہ پور اول 241ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے بیستیس سال حکومت کی۔ یہ بڑا خوب صورت اور دلیر تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے گرد و پیش کے ممالک کے ساتھ بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ اس کے زمانے تک پارٹھیا والوں نے ملک فارس کی بہت سی ریاستوں اور صوبوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ شاہ پور نے اپنے والد کے ساتھ پارٹھین کے خلاف جنگ لڑی اور انہیں تہ تیغ کر کے رکھ

رکتی تھیں جنہیں زرتشت کے تین بیٹوں نے ڈالی تھی۔ آذر فرگ مذہب کے عالم دین کی آگ تھی۔ آذر گھنپ سپاہیوں کی آگ یا آتش شای بھی اور آذر برزین مہر زراعت پسند لوگوں کی آگ تھی۔ ملک فارس میں ایک مخصوص قبیلہ ”ماگی“ کو مذہبی اجارہ داری حاصل تھی۔ تمام اودار میں مذہبی پیشوائی کا حق صرف اسی خاندان کے پاس رہا۔ پروفسر آرتھر لکھتا ہے۔

”جس یا مغاں اصل میں میڈیا کے ایک قبیلے یا اس قبیلے کی ایک شاخ یا خاص جماعت کا نام تھا جو غیر زرتشتی اور مزدائیت کے عالم دین پر مشتمل تھا۔ جب مذہب زرتشت نے ملک فارس کے مغربی علاقوں کو تغیر کیا تو مغاں، اصلاح شدہ مذہب کے بڑے بن بیٹھے۔ اوستا میں یہ عالم مذہب آذر وان کے قدیم نام کے علما میں شمار ہوتے تھے لیکن آشکانیوں اور ساسانیوں کے زمانے میں وہ معمولہ مخ کہلاتے تھے۔“

ملک میں جاگیر دارانہ نظام ہونے کے سبب یہ مذہبی قیادت بھی ایک خاص قبیلے کے افراد سے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے خدمات کے صلے میں امراء کو بڑی بڑی جائیدادیں بخشی جاتی تھیں اس لیے یہ دونوں گروہ ملک میں با اثر اور متقدر شمار کیے جاتے تھے۔ آذر خاندان کے پاس صرف مذہبی قیادت ہی نہ تھی بلکہ یہ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بھی تھے۔ مذہبی قائد کا انتخاب ہمیشہ قبیلہ مغاں سے ہوتا۔ آذر باغیان مغلوں کا ملک سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ان لوگوں کی زرتشتی مذہب اور پرتشکا فکات تھیں۔

پارتھیا کے آخری ایام میں مغلوں کی اجارہ داری جب ختم ہوئی تو ان کی اہمیت بھی گھٹ گئی۔ یہاں تک کہ ان سے بڑی بڑی جاگیریں چھین لی گئیں۔ ان کے آتش کدے ویران ہو گئے اور قربان گاہیں سناں لیکن ساسانی خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد اردشیر نے ان کو وہ پہلا مقام دے دیا اور ان کی مذہبی بالادستی اور اجارہ داری کے ساتھ ساتھ ان کی امارت اور خوشحالی کا دور بھی واپس آ گیا۔

اردشیر نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے ملک میں قدیم طبقاتی تقسیم کو از سر نو مرتب کیا۔ پہلا طبقہ اس کے درباری عالموں، دانشوروں اور مملکت کے مشیروں کا تھا۔ دوسرا طبقہ ملک کے مختلف صدر مقامات پر گورنروں اور سرحدی شہروں کے حاکموں اور نگران افراد پر مشتمل تھا۔ تیسرے طبقے میں وہ لوگ شامل تھے جو اس کے دربار میں شریفانہ انداز میں تفریحات اور روح کی تسکین کا سامان فراہم کرتے تھے۔

کو اردشیر فاتحانہ طور شہر میں داخل ہوا۔ فلسفون کی فتح کے بعد اردشیر نے اپنے لیے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ سارے فارس پر قابض ہو گیا۔

اردشیر نے اپنے دور حکومت میں اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے بہت سے کام کیے۔ عبادت گاہوں کی تعمیر، نہریں نکالنے اور نئے شہروں کی آباد کاری اس کے خاص شغف تھے۔ وہ جو بھی نیا شہر بساتا، یادگار کے طور پر اس کے ساتھ اردشیر کا اضافہ ضرور کرتا۔ اس نے پرانے سلیو کی جس کو 165ء میں رومن سپہ سالار اویڈیوس کیسوس نے تباہ و برباد کر دیا تھا، اسے اپنے نام اردشیر سے دوبارہ آباد کیا۔ اس کے علاوہ خوزستان میں شہر ہرمز اردشیر کے نام سے آباد کیا۔ آشکانیوں کی شکست کے بعد اہل روم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مشرق میں ایک نئی سلطنت کا ستارہ طلوع ہو رہا ہے جس کی جنگی طاقت ناقابلِ تخریب ہے۔ اردشیر نے ایگزینڈر سیلورس کو ایسی شکست فاش دی کہ تمام بازنطینی سلطنت میں صف ماتم بچھ گئی۔ رومیوں کو جتنی ذلت آمیز شکست اس جنگ میں ہوئی، آج تک نہ ہوئی تھی۔ اس سے بازنطینی سلطنت کے وقار اور جاہ و جلال کو سخت صدمہ ہوا۔ اردشیر نے سترہ سال حکومت کی اور وہ 241ء میں فوت ہوا۔ یہ اعلیٰ درجے کا جرنیل اور منتظم بادشاہ تھا۔ اس نے رومیوں کو شکست دے کر ملک فارس کا لوہا منوایا اور عسکری قوت کا دبدبہ اور عرب قائم کیا۔

اسی نے ساسانی خاندان کی حکومت کی بنیاد 226ء یا 227ء میں اپنی شہنشاہیت کے ساتھ رکھی۔ اس نے ایک بار پھر سے زرتشتی مذہب کی ترقی و ترویج کے لیے کام کیا جس کی وجہ سے ساری قوم ایک بار پھر سے زرتشت مذہب کی پیروکار بن گئی مگر خود اس نے زرتشتی مذہب کو قبول نہ کیا بلکہ اس نے زرتشت کے صرف ان نظریات کو قبول کیا جس کی نمائندگی عبادت گاہوں کے کاہن کرتے تھے۔ جس میں آگ کی عبادت سرفہرست تھی۔ اس بدلے ہوئے مذہب کی حمایت اور تحفظ کا بیڑا اردشیر اول نے اٹھایا۔

سلطنت ساسانی میں ہر جگہ اور ہر شہر میں آتش کدے موجود تھے لیکن ان میں سے تین ایسے تھے جن کی خاص حرمت اور تعظیم ہوتی تھی۔ یہ وہ آتش کدے تھے جن میں قدیم زمانے کی آگ موجود تھی۔ ان میں آذر فرگ، آذر گھنپ اور آذر برزین مہر تھا۔ زرتشتیوں کے نظریے کے مطابق یہ تین آگیں ان تین معاشری طبقوں سے تعلق





ماہ آزادی کی جوشیلی تیاریاں  
جاسوسی کی سنسنی خیز کہانیاں

### اولین صفحات

حسین چروں کا ساتھ ہو تو زندگی کی رنگینی بڑھ جاتی ہے اور سنگینی منظر رہتی ہے۔

ہمایوں بلگرامی کے قلم سے پرفریب داستان

### انگاریے

دشمنوں کے قلعے میں آجی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا

ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

### آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نو جوان کی سرگزشت۔۔۔۔۔

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

### سرورق کے رنگ

آزادی کی تڑپ اور چاہ میں جاں نثار کردینے والوں کا فسانہ

پہاڑوں میں گہری ایک وادی کے دکش مناظر میں خون میں ڈوبی سنسنی خیز داستان

### جینی نکتہ جینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

اکساتا اور ملک میں قتلہ وفساد کی آگ بجھانے کی جرات کرتا لیکن اس سے ایسی خرابیاں بھی نمودار ہوئیں جو ملک فارس کی ترقی کی راہ میں بھاری پتھر ثابت ہوئیں۔ بادشاہ اپنے آپ کو آمر سمجھنے لگے۔ ان کی کسی بات پر اعتراض کرنا ایسا جرم تھا جس کی سزا قتل تھی۔ تاریخ طبری میں درج ہے۔

”جدید ہندو مت اور اصلاح مالیات پر غور کرنے کے لیے خسرو نے ایک کونسل منعقد کی اور دیر خوراک کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں یہ آواز بلند پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے دودھ حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ سب چپ رہے۔ بادشاہ نے تیسری بار پوچھا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کہ آیا بادشاہ کا یہ منشا ہے کہ تانا پائیدار چیزوں پر ٹیکس لگائے۔ تیرا یہ حکم کچھ مدت گزرنے کے بعد ظلم و بے انصافی کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس پر بادشاہ لاکار کر بولا کہ اے مرد ملعون و گستاخ۔ تو کون لوگوں میں سے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں دیہروں (کاجیوں) میں سے ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قتلہ انوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو۔ اس پر ہر ایک دیہر نے اپنے اپنے قتلہ ان سے اسے مارنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ بھارہ مر گیا۔ جس کے بعد سب نے کہا، اے بادشاہ جتنے لوگ تو نے ہم پر لگائے ہیں، وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں۔“

شاہ پور اول کی تربیت اس کے والد اردشیر نے بڑی خوب صورت کی تھی۔ اس لیے اس میں اکثر عادات اردشیر والی ہی تھیں۔ یہ اسی کی طرح اپنی رعایا کے لیے رحم دل تھا۔ شاہ پور نے تخت نشین ہوتے ہی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کا قطعی طور پر قلع قمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے نصیبن پر چڑھائی کا پروگرام بنایا۔ نصیبن کا شہر یونان کے اسکندریہ کے قریب روی سرحد کا آخری شہر تھا۔ نصیبن ہی وہ شہر تھا جس میں سب سے پہلے قلعہ کا مضمون پڑھایا جاتا تھا۔ اس میں موسیقی اور سائنسی علوم کی ابتدا کی گئی تھی۔ رومیوں نے نصیبن پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کے بعد شام کی طرف بڑھے۔ اس وقت گورڈین سوم روم کا بادشاہ تھا۔ اس نے ساسانیوں کے خلاف سونا اور فوج اٹھائی۔ اس وقت شاہ پور خوارزم کی جنگ میں مصروف تھا اور وہ گیلان کی فتح کے لیے برسرِ پیکار تھا۔ جب روی بادشاہ گورڈین کو اس کی اطلاع ملی تو اچانک روی

یہ مانی کی مصوری ہی کی دین تھی کہ اس کے بعد ملک فارس میں تصاویر بنانے اور نقش و نگار بنانے کا فن رواج پا گیا۔ خود خاندان ساسان کے کئی بادشاہوں نے بڑی بڑی چٹانوں پر اپنی ایسی تصاویر بنائی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اھورا مزدا (خدا) اسے منصب شاہی عطا کر رہا ہے۔ اسی دور میں دیواری تصاویر میں کئی جگہ دیوتا بادشاہ کو انگوٹھی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تصویر میں اہرن مزدا کے ہاتھ میں انگوٹھی دکھائی گئی ہے جو وہ بادشاہ کو دینے والا ہے۔ انگوٹھی بادشاہ کی قوت اور اعتماد کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ یہ دستخط کے بجائے استعمال کی جاتی تھی۔

اس طرح کی بے شمار تصاویر ملک کے مختلف علاقوں میں کثرت سے ہیں اور ان کے پیش نظر دیگر مقاصد کے علاوہ اہل فارس کے ذہنوں میں یہ نقش ثبت کرنا ہے کہ ان کے بادشاہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ حکمرانی و سلطانی کے یہ اختیارات انہیں اھورا مزدا نے اپنے ہاتھوں سے دیے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان سے چھین نہیں سکتی۔ بادشاہ کی غیر مشروط فرمانبرداری اور اطاعت و درحقیقت اھورا مزدا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اس طرح ساسانی بادشاہوں نے رعایا کی طرف سے علم بغاوت بلند کرنے کے تمام امکانات کو ختم کر دیا۔ کیونکہ بادشاہ کے خلاف تو کوئی بھی بغاوت کا پرچم بلند کر سکتا ہے لیکن اھورا مزدا کے خلاف بغاوت کرنے کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس طرح ساسانیوں نے اپنی سلطانی کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ نیز یہ تصور بھی اپنی رعایا کے دلوں میں پختہ کر دیا کہ بادشاہی ساسانی خاندان کے افراد ہی کے لیے ہے۔ جب بھی ایسا ہوا کہ ساسانی خاندان کے علاوہ کسی نے عتوان حکومت ہاتھ میں لینے کی جسارت کی تو اس کی تمام صلاحیتوں کے باوجود قوم نے اسے ٹھکرایا اور جب آرام کا سانس لیا جب اس کو تہ تیغ کر دیا۔

تخت شاہی حاصل کرنے کے لیے جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں، ان میں دونوں طرف ساسانی خاندان کے ہی افراد تھے۔ اس سیاسی نظریے کے چند فوائد بھی تھے کہ سلطنت کو استحکام میسر آیا اور ہر ایراد بغیر سے کو جرات نہ ہوتی کہ وہ حکومت کے حصول کے لیے عوام کو

زبان زد عام ہے۔  
”فوج کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہو سکتی۔ مہرے کے بغیر فوج نہیں رکھی جاسکتی۔ زراعت کے بغیر پیسا نہیں مل سکتا۔ انصاف کے بغیر زراعت کا مایاب نہیں ہو سکتی۔“  
شاہ پور نے اپنے دور حکومت میں بہت سے قلعے تعمیر کیے۔ بستیوں اور شہر تعمیر کیے۔ جانے کتنے ہی ترقی کے نام پر کام کیے۔ مانی نے اسی کے زمانے میں شہرت پائی۔

فارسی کی روایات کے مطابق یہ ایک قدیم الشال مصور کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا۔ روایات کے مطابق مانی کا تعلق چین سے تھا۔ اس نے زرتشت کے مسلک سے فائدہ اٹھا کر اور دوسرے مذاہب اور دین سے فائدہ اٹھا کر ان کے افکار اور تصورات میں ترمیم کر کے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ بات واضح ہو گئی کہ ادنیٰ روایات یکسر جھوٹ نہیں ہوتیں۔ مانی اور اس کے مذاہب کا تعلق مصوری سے بھی تھا۔

مانی کے مطابق جب دنیا وجود میں آئی تو اس کے دو جوہر اصلی تھے جن کی بنیاد پر دنیا بنائی گئی۔ ایک نیک اور ایک بد۔ نیک جوہر کو زردان کہتے ہیں اور دوسرے کو جوہر غلٹ کہا جاتا ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے یہ دونوں جوہر آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ جب تک کائنات بالکل فنا نہ ہوگی نور آئینہ غلٹ سے رہا نہ ہوگا۔ مانی اپنے دین کی تبلیغ تقاریر اور وعظ کے ذریعے کرتا۔

مانی کے مسلک کو بڑی کامیابی ہوئی۔ چنانچہ شاہ پور اول اس کا پیروکار ہو گیا اور مانی نے اپنی تصنیف ”شاہ پورگان“ اس سے منسوب کی مگر کچھ ہی عرصے کے بعد مانی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس عرصے میں۔۔۔۔۔ اس نے ہندوستان اور چین کی سیاحت کی۔ مانی نے اپنے نئے مسلک کی ترقی کے لیے ہر نئے ماحول میں نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا مذہب پوری دنیا میں پھیل جائے۔ اس لیے اس نے اپنی تعلیم کو مختلف مذاہب کے ساتھ موافق اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

مانی ازم سے متعلق جو تحریریں اور تصویریں ملتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلک رکھنے والے مصور سنہرا کام بڑی مہارت سے کرتے تھے چنانچہ کم و بیش تمام تصویروں میں سونے کا پانی یا برادہ استعمال کیا گیا ہے۔ سنہری کام کی یہ روایت مانوی و بستان فن سے مخصوص ہے۔



شہنشاہ نے شاہ پور پر حملہ کر کے نصیب اور کارنجن شہروں پر قبضہ کر لیا اور انہیں بری طرح تباہ و برباد کر ڈالا اور نصیب شہر... ویلین کے حوالے کر کے خود دوسری مہمات میں مصروف ہو گیا۔ شاہ پور کو موقع ملا تو اس نے دوبارہ سے اپنی فوج کو اکٹھا کیا اور ویلین کو لکھا کہ وہ طے شدہ تاوان ادا کرے مگر ویلین نے جواب دیا چونکہ نصیبین پر اب ملک فارس کا قبضہ نہیں رہا اس لیے وہ اسے تاوان ادا نہیں کر سکتا۔ شاہ پور نے جب اس کا یہ جواب سنا تو اس نے فوراً اپنی فوج لے کر نصیبین پر حملہ کر دیا ویلین اپنے شہر میں محصور ہو گیا۔ اس نے شہر کے تمام دروازے بند کر دیے۔ نصیبین شہر کے چاروں طرف حساری دیوار انتہائی مضبوط تھی۔ شاہ پور نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کتنے ہی دن ایسی محاصرے میں گزر گئے۔ شاہ پور نے جب دیکھا کہ کسی طور محاصرے سے روئی شہنشاہ اکٹھا کر باہر نہیں نکلتا اور نہ ہی نصیبین فتح کرنے کا کوئی سبب بنتا ہے، تو اس نے شہر زور کے صحرا سے بہت سارے کالے بچھو منگوائے۔ پہلے اس نے گوبھیوں سے شہر کی دیواروں اور برجوں کو گرایا۔ پھر شہر کے اندر منگوائے ہوئے کالے بچھو پھینکا دیے اور رسد و رسائل کے تمام راستے بند کر دیے۔ محصورین شہر کی خوراک کا ذخیرہ جب ختم ہو گیا اور کالے بچھوؤں نے شہروں کو ڈنک مارنے شروع کر دیے تو پانچار اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔ بادشاہ ویلین نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی بیٹی شہزادہ کو صلح کا پیغام بھجوایا اور ساتھ ہی مقررہ تاوان دینے کی ہامی بھری۔ شاہ پور نے اس کی درخواست مانتے ہوئے نصیبین پر اپنا ایک نائب مرزبان مقرر کیا اور خود طرطوس کی طرف بڑھ گیا۔ طرطوس کو فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ جہاں اس وقت قسطنطین بن ہلانی کی حکومت تھی۔ اس نے چوبیس سال حکومت کرنے کے بعد اپنے بھائی لیلیاس کو دے دی تھی۔ اپنے دور حکومت میں اس نے بہت سے گرجا گھر تعمیر کرائے اور دین مسیحی کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیلیاس روم کا تیسرا اصرانی بادشاہ تھا لیکن اس نے بہت جلد نصرا نیت سے روگردانی کر کے اعنام پرستی شروع کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے روم کے لوگ اس سے سخت نفرت کرنے لگے تھے اور اسے لیلیاس بڑھا ط کہنے لگے تھے۔ شاہ پور ابھی راستے میں ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی، لیلیاس نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر شاہ پور کے عراقی علاقوں پر چڑھائی کر دی ہے مگر اس کی فوج میں موجود مغربی ساتھیوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اسے قتل کر ڈالا ہے۔ لیلیاس کے قتل پر اس کے ہمرد حکمرانوں کو بہت افسوس ہوا لیکن چونکہ روم کے

عوام مقتول بادشاہ کے سخت مخالف تھے اس لیے اس کے زیر دست حکمرانوں نے نصرا نیت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے باہم مشورے سے یونیاں کو اپنا حکمران مان لیا۔ لیلیاس کا لشکر ابھی عراق ہی میں تھا جب شاہ پور ان کے سر پر پہنچ گیا۔ شاہ پور نے روئی فوج کا محاصرہ کر لیا اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ جس پر یونیاں نے شاہ پور کو بڑے قیمتی تحائف اور زور نقد بھیج کر اس سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ شاہ پور کے ساتھ اس نے خط کتابت بھی کی اور وہ بددھنٹو بھی کی جس کی وجہ سے متعدد باہمی اختلافات کا بحسن و خوبی تصفیہ ہو گیا اور شاہ پور ملک فارس آ گیا۔ روم کی فوجات کے بعد شاہ پور ملک فارس میں پلٹا تو اس نے سرزمین فارس کے شہر شاہ پور میں ایک عظیم الشان آتش کدہ تعمیر کرایا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسے دارا ابن دارا نے تعمیر کرایا تھا۔ روم میں بھی اس نے ایک آتش کدے کی بنیاد رکھی۔ جب شاہ پور جزیرہ کے شہر کی طرف روانہ ہوا تھا تو سیدھا راستہ چھوڑ کر ایک قلعے میں جا اتر اس وقت ایک تورانی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ شاہ پور نے اس پر چڑھائی کر کے اسے شکست دی اور اسے قتل کر دیا اور شاہ پور نے اس جگہ ایک مستحکم شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اس نے نیوشاہ پور رکھا۔ جو آج کل نیوشاپور کہلاتا ہے۔

☆☆☆

نصف ایک سریانی بادشاہ ساطرون جس کا لقب خزان تھا، کی بیٹی تھی۔ ساطرون وجہ اور فرات کے درمیانی علاقے ہیراکا حکمران تھا جس نے شہر میں حصن جعفر کے نام سے پختہ قلعہ بنا رکھا تھا۔ نصرا انتہائی خوب صورت تھی جس کے انتہائی لمبے گھنے بال اس کے گھٹنوں تک آتے تھے اور اس کے حسن کو چار چاند لگتے تھے۔ نصرا کو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ گلابی اور سفید رنگت، اونچا لمبا قد، لگنا تھا جیسے یونانی اور پارسی (فارسی) حسن نے مل کر اسے یہ مثال بنا ڈالا تھا۔ خزان اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس کے سرخ ہونٹوں سے جو بھی بات نکلتی، اسے فوراً پورا کرنے میں خزان کوئی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا تھا۔ ساطرون ہندی شہنشاہ کے نام سے مشہور تھا۔ وہ جس بات کو سن میں بٹھالیتا، جب تک اسے پورا نہ کر لیتا اس سے پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ وہ ملک فارس کا دوسری یونانی ریاستوں کی طرح باج گزار تھا اور ایک مخصوص رقم منج تحائف کے ساسانی حکمرانوں کو سالانہ ادا کرتا تھا۔ جب ارشیر وقات پاسیا تو ملک فارس کی ریاستوں میں کچھ عرصے کے لیے انتشار اور افراتفری پیدا ہوئی جس کو فارس کے نئے حکمران شاہ پور نے صرف سختی سے دبا دیا بلکہ کئی نئی ریاستوں کو دوبارہ سے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا۔ فارس کا ایک شہر "جور" تھا جہاں سے عراق دردملا کر پانی باہر بھیجا جاتا تھا۔ نصیبین کی جنگ کے تین سال بعد 240ء میں اہل فارس اور رومیوں کے درمیان ایڈریا کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ قیصر روم، ویلیرین نے صلح نامہ نصیبین کی رو سے خراج کے علاوہ ارمینیا بھی ملک فارس کے حوالے کر دیا تھا جس سے ویلیرین کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے قیصر روم تین سال تک تیار میں بیٹھا رہا۔ جب جنگی تیار یا مل ہو گئیں تو بذات خود حملہ آور ہو لیکن شاہ پور نے آگے بڑھ کر اسے نہ صرف شکست فاش دی بلکہ اسے گرفتار بھی کر لیا۔ قیصر روم قیدی کی حالت میں شہر چندی شاہ پور میں کر گیا۔ روئی مورخوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ پور نے قیدی روئی شہنشاہ سے بہت برا سلوک کیا تاہم یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بازنطینی وقار کو جو صدمہ پہنچا۔ اس کی وجہ شاہ پور کے سلوک پر نہ تھی۔ ویلیرین سے جو سلوک ہوا وہ اس کا حق تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ جولین نے اہل فارس سے بدلہ لینے کے لیے طیفونوں پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس جنگ میں جولین اس قدر زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ اب روئی سلطنت کو چاروں چار یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ اہل فارس قیامت کے دن اور بہتر شہر سوار ہیں۔

نصف ایک سریانی بادشاہ ساطرون جس کا لقب خزان تھا، کی بیٹی تھی۔ ساطرون وجہ اور فرات کے درمیانی علاقے ہیراکا حکمران تھا جس نے شہر میں حصن جعفر کے نام سے پختہ قلعہ بنا رکھا تھا۔ نصرا انتہائی خوب صورت تھی جس کے انتہائی لمبے گھنے بال اس کے گھٹنوں تک آتے تھے اور اس کے حسن کو چار چاند لگتے تھے۔ گلابی اور سفید رنگت، اونچا لمبا قد، لگنا تھا جیسے یونانی اور پارسی (فارسی) حسن نے مل کر اسے یہ مثال بنا ڈالا تھا۔ خزان اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس کے سرخ ہونٹوں سے جو بھی بات نکلتی، اسے فوراً پورا کرنے میں خزان کوئی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا تھا۔ ساطرون ہندی شہنشاہ کے نام سے مشہور تھا۔ وہ جس بات کو سن میں بٹھالیتا، جب تک اسے پورا نہ کر لیتا اس سے پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ وہ ملک فارس کا دوسری یونانی ریاستوں کی طرح باج گزار تھا اور ایک مخصوص رقم منج تحائف کے ساسانی حکمرانوں کو سالانہ ادا کرتا تھا۔ جب ارشیر وقات پاسیا تو ملک فارس کی ریاستوں میں کچھ عرصے کے لیے انتشار اور افراتفری پیدا ہوئی جس کو فارس کے نئے حکمران شاہ پور نے صرف سختی سے دبا دیا بلکہ کئی نئی ریاستوں کو دوبارہ سے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا۔ فارس کا ایک شہر "جور" تھا جہاں سے عراق دردملا کر پانی باہر بھیجا جاتا تھا۔ نصیبین کی جنگ کے تین سال بعد 240ء میں اہل فارس اور رومیوں کے درمیان ایڈریا کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ قیصر روم، ویلیرین نے صلح نامہ نصیبین کی رو سے خراج کے علاوہ ارمینیا بھی ملک فارس کے حوالے کر دیا تھا جس سے ویلیرین کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے قیصر روم تین سال تک تیار میں بیٹھا رہا۔ جب جنگی تیار یا مل ہو گئیں تو بذات خود حملہ آور ہو لیکن شاہ پور نے آگے بڑھ کر اسے نہ صرف شکست فاش دی بلکہ اسے گرفتار بھی کر لیا۔ قیصر روم قیدی کی حالت میں شہر چندی شاہ پور میں کر گیا۔ روئی مورخوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ پور نے قیدی روئی شہنشاہ سے بہت برا سلوک کیا تاہم یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بازنطینی وقار کو جو صدمہ پہنچا۔ اس کی وجہ شاہ پور کے سلوک پر نہ تھی۔ ویلیرین سے جو سلوک ہوا وہ اس کا حق تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ جولین نے اہل فارس سے بدلہ لینے کے لیے طیفونوں پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس جنگ میں جولین اس قدر زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ اب روئی سلطنت کو چاروں چار یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ اہل فارس قیامت کے دن اور بہتر شہر سوار ہیں۔

چونکہ ملک فارس کا زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ عورتوں کی حفاظت کے لیے مرد ملازم رکھے جاتے تھے اور اولاد کے بارے میں ان کا دستور تھا کہ لڑکا جب تک بالغ نہیں ہو جاتا اور لڑکی جب تک بیانی نہ جاتی، ان کی پرورش اور نگہداشت باپ کی ذمہ داری تھی۔ لڑکی کی مذہبی تعلیم ماں کا فرض تھا لیکن اس کی شادی کرنا باپ کے فرائض میں تھا۔ اگر باپ زندہ نہ ہو تو پھر لڑکی کی شادی کسی اور شخص کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ فارس کا سرکاری مذہب زرتشت تھا اور شیطان کو دور رکھنے کے لیے آگ اور روشنی کا استعمال کیا جاتا تھا۔

بلاش خوب صورت اور بہادر نوجوان تھا جس کو انوشیر نے اپنی بیٹی ارزی کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا اور انوشیر قصہ کواد کے بادشاہ کا نائب تھا۔ ارزی نصرا کی سبیلی اور خادمہ تھی۔ نصرا اس کی ہم راہ بھی تھی۔ دونوں لڑکیاں جب بھی اکیلے میں پیشیں تو ارزی ہر بات کی تان بلاش پر لا توڑتی تھی۔ کئی بار تو ایسے بھی ہوتا تھا کہ نصرا ان دونوں کو چار محبت کی باتیں کرنے کے لیے خود موقع فراہم کر دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ بلاش اور ارزی اس کے سامنے ہی ایک دوسرے کے ساتھ پیاری چٹکیں بڑھانے لگے۔ نصرا نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ



مجھے بلاش پر شک گزر رہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ پیار کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ کسی لالچ کے تحت تمہارے ساتھ پیار کی کیفیتیں بڑھا رہا ہے مگر اس وقت تک ارزی اس کے پیار میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ نصر کی باتوں کا یقین نہیں کر رہی تھی۔ ایک روز جب ارزی بلاش کا انتظار کر رہی تھی تو نصر نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھو ارزی! مجھے شک گزر رہا ہے کہ بلاش تمہارے پیار میں سنجیدہ نہیں۔ وہ کسی لالچ میں تمہیں ورغلا رہا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ سنجیدہ ہے تو اس سے کہو کہ وہ تم سے شادی کر لے۔“ نصر نے اسے سمجھایا۔

”میں نے کئی بار اس سے کہا ہے مگر وہ آگے سے جواب دیتا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ جب تک اسے وہ حاصل نہیں ہو جاتا وہ شادی کے بندھن میں خود کو نہیں باندھ سکتا۔“ ارزی نے بتایا۔

”میں جانتی ہوں اس کا کون سا مقصد ہے۔ میں نے ایک روز کو تو اس سے اسے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ میں نے وہ باتیں تمہیں نہیں بتائیں کہ کہیں تمہارا من اس سے نفرت نہ کرنے لگے۔“ نصر نے اسے بتایا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو بلاش کو مجھ پر اعتماد ہے اور نہ ہی اپنی سبیلی پر بھروسہ کرتی ہو۔“

”نہیں ارزی یہ بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے بتانے سے ایک تو اس کی حقیقت تم پر کھل جائے گی۔ دوسرے محبت کے معاملے میں، میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اتنا آگے نکل چکی ہو کہ تمہیں سن کر دکھ ہوگا اور کسی کو دکھ پہنچانا میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ البتہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ اپنے باپا سے کہہ کر تمہارے والد کو اس بات پر آمادہ کر دوں کہ وہ تمہاری دیوروں کے اس لڑکے سے شادی کر دے۔ وہ بھی اگر تم چاہو تو۔“ نصر نے اسے بتایا تو ارزی فوراً بولی۔

”نصر! میں جانتی ہوں کہ تم جو کام بھی کرو گی میرے مفاد کے لیے کرو گی لیکن میں اس کی وہ باتیں سننا چاہوں گی جس سے تمہیں اس کی وفا پر شک ہوا ہے۔“ ارزی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تو سنو۔۔۔۔۔ اس کا ارادہ تمہیں سبڑھی بنا کر مجھ تک پہنچنا ہے۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد پتا چل جائے گا اور پھر وہ ہمارے خاندان کا حصہ بننا چاہتا ہے جو کسی طور پر بھی ہمیں منظور نہیں لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس وقت تک اس سے کچھ نہ پوچھو گی جب تک وہ خود تم سے بات نہیں کرتا۔“

نصر نے اسے نصیحت کی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔“ ارزی نے مایوسی سے جواب دیا۔

پھر بہت جلد ایک روز جب ارزی اور بلاش آپس میں راز و نیاز کر رہے تھے تو بلاش نے اپنے دل کی بات ارزی کو کہہ ڈالی۔

”دیکھو ارزی! میں بڑے دنوں سے تمہارے ساتھ ایک بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر پھر بھی جان سے ڈر جاتا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ میں تم سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں اور اسی بھروسے پر میں بڑی سوچ بچار کے بعد آج تم سے ایک بات کر رہا ہوں مگر تم وعدہ کرو کہ اس معاملے میں تم میری مدد ضرور کرو گی۔“ بلاش نے رکتے رکتے اس کے چہرے پر نظرسن گاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”کہو۔۔۔۔۔ یہ میرے لیے نہایت عزت افزائی کی بات ہوگی جو میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“ ارزی نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

”یہ جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، ہمارے درمیان رہتی چاہیے۔ اگر تمہارے بس میں ہوئی تو میری مدد ضرور کرنا وگرنہ کچھ لینا کہ میں نے تم سے کوئی بات کی ہی نہیں۔“ بلاش نے سادگی سے کہا۔

”بات تو بتاؤ۔۔۔۔۔ میں بات سن کر ہی فیصلہ کر پاؤں گی کہ یہ میرے بس میں بھی ہے کہ نہیں۔“ ارزی نے اسی انداز سے پوچھا۔

”تم کسی طرح میری بات نصر! اسے نہیں کروا سکتیں؟ اسے اعتماد میں لے کر یہ یقین دلادو کہ میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ گو یہ بات مجھے تم سے کہتے زیب نہیں دے رہی مگر اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ اگر نصر! میری محبت کے چھانے میں آجائے تو میں اس سے شادی کا فرضی دعوئی کر کے اس کے والد کے تاج و تخت کا مالک بن جاؤں گا اور پھر تم سے شادی کر لوں گا۔ یوں تم ملک بہتر کی بلاشرکت غیر ملکہ بن جاؤ گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری خوب صورتی کے آگے نصر! کا حسن ماند ہے۔ تمہاری خوب صورت باتیں کرنے کے انداز سے تمہاری ذہانت جتنی ہے۔ جو نصر! کی گفتگو کے انداز سے کہیں اونچی ہے۔ تمہیں میرے لیے ایسا کرنا ہوگا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اپنے اور میرے مستقبل کے لیے تم یہ کھیل کھیلنے میں میری مدد کرو گی۔“ بلاش نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

”بلاش! تم نے میرے دل کی خواہش بیان کر دی۔ میں بڑی دیر سے یہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ یہی طرح نصر! کے دل میں تمہاری محبت کی جوت جگا دوں۔“ ارزی نے دھکی دھکی سے اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔۔۔۔۔“ بلاش خوشی سے بولا۔

اگلے ہی دن ارزی نے یہ تمام باتیں نصر! کو بتا دیں تو نصر! نے کہا۔

”دیکھا میری بات سچ نکلی تا۔۔۔۔۔ اب تم کسی روز ایسا کرو، بلاش کو ملاقات کے بہانے سے بلاؤ۔ جب وہ آجائے گا تو میں اپنے پروگرام کا اگلا حصہ تمہیں اس وقت بتاؤں گی۔“ پھر ایسا ہی کیا گیا۔

ایک دن ارزی نے بلاش کو بہانے سے بلایا اور نصر! کو بھی بتا دیا۔ اس روز ارزی بڑی بے چینی سے بلاش کا انتظار کر رہی تھی اور نصر! اقرب ہی چھپی ہوئی تھی جہاں سے ارزی اور بلاش دونوں اسے نظر آ رہے تھے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ تب ہی بلاش خوش ہوتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم میری محبت میں یقیناً وہ گم گمزدگی جو میں کہوں گا۔ کیا بات ہوئی بتانا پسند کرو گی؟“

”میں نے نصر! سے بات کی تھی۔“ ارزی نے بتایا۔

”پھر اس نے کیا کہا۔۔۔۔۔؟“ بلاش نے اگلا سوال کیا۔

”میری بات سن کر وہ ہنسی اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا واقعی بلاش مجھے چاہتا ہے؟ ارزی تم خوش قسمت ہو کہ اتنا ذہین اور خوب صورت مرد تمہیں پسند کرتا ہے میں واقعی اس سے ملنا چاہوں گی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ تو اس نے یہ کہا۔ پھر کب اس سے ملوؤ گی؟“ بلاش بے چینی سے بولا۔

”اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ یہ تو اس کی مرضی ہے، وہ میرا کی شہزادی ہے جب اس کا من چاہے گا وہ تم سے مل لے گی۔“ ارزی نے سادگی سے جواب دیا۔

”اوہ ارزی! تم کتنی اچھی ہو، ملکہ بننے کا اعزاز یقیناً تمہاری خوب صورتی اور ذہانت کو چار چاند لگا دے گا۔ تم اسے جتنی جلدی ہو سکتے میرے ساتھ ملوانے کی کوشش کرنا۔“ بلاش نے خوشی سے کہا۔

ابھی وہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ نصر! جلدی سے نکلی اور ان کے سامنے آگئی۔

”نصر! یہ تم ہو۔۔۔۔۔“ ارزی نے خیرانی سے پوچھا۔

”اسی اثنا میں بلاش نے بھی اپنا رخ موڑا۔ اب نصر! اس کے سامنے تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا، نصر! نے چھپایا ہوا تیز دھار۔۔۔۔۔ فخر نکالا اور بلاش کے پیٹ میں اتار دیا۔ اس نے جوش جذبات میں ایک دو بار اس خنجر کو اس کے پیٹ سے نکالا اور دوبارہ اس کے پیٹ میں مارا۔ بلاش انتہائی زخمی حالت میں زمین پر گر گیا اور ترپے لگا تو نصر! نے ارزی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

”آؤ ارزی۔۔۔۔۔ چلتے ہیں۔“

ارزی اس کے ساتھ ہنسنے چلی گئی۔

دونوں نصر! کے باپ خزن کے پاس پہنچ گئیں اور نصر! نے تمام بات باپ کے گوش گزار کر دی۔ اس نے اطمینان سے نصر! کی بات سنی اور انہیں گل میں جانے کو کہا۔

جب وہ چلی گئیں تو اس نے بلاش کے والد کو اپنے پاس بلایا۔ کچھ دیر کے بعد بلاش کا والد خزن کے سامنے کھڑا تھا۔

”تمہیں پتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص کے لیے ایک معین مقام ہے۔ تمہارے بیٹے نے اپنے رتبے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر رتبے کی خواہش کی تھی۔ ادھر اس کی لاش پڑی ہے، اٹھالو۔۔۔۔۔“ بلاش کے والد نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”یقیناً ہمارے بادشاہ انصاف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اب بھی انہوں نے بہتر انصاف کیا ہے۔“

یہ کہہ کر بلاش کا والد اپنے بیٹے کی لاش لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

قیصر روم بھی اب شاہ پور کی بے درپے فوج کشی سے اکتا گیا تھا۔ اب اس نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ ملک فارس کے ساتھ صلح کر لی جائے۔ یونانی پہلے ہی کئی بار ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ جب رومیوں نے صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شاہ پور بھی صلح پر آمادہ ہو گیا۔ اسی دوران ایک بار قیصر روم نے شاہ پور کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی سیاست کا دار و مدار آپ کی افواج ہیں۔ آپ کے ماتحتوں نے نظام حکومت کو نظم و ضبط کے ساتھ درست کر رکھا ہے۔ اہل مملکت کی سلامتی کے لیے آپ نے کچھ خاص تدابیر کی ہیں لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ان سب باتوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بتائیں تاکہ میں بھی اپنی مملکت کی فلاح و بہبود کے لیے آپ کے وضع کردہ اصولوں پر کار بند رہ سکوں۔ شاہ پور نے قیصر کو جواب لکھا۔

”میں نے اس سلسلے میں اپنی مملکت میں آٹھ باتوں



کی پابندی لازمی قرار دے رکھی ہے جو یہ ہیں۔ میں نے کبھی اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی اپنے احکامات میں کبھی ذلیل اور مستحکم خیزی کو داخل ہونے دیا ہے۔ ہمیشہ وعدے کی خلاف ورزی سے خود کو دور رکھا۔ میرے ذہن میں ہوتا ہے کہ جب بھی کسی ملک کے خلاف جنگ کروں تو یہ جنگ امن و امان کی بحالی کے لیے ہو۔ کسی لالچ کے تحت نہ ہو اور ملک کی رعایا کے دل بغیر کسی خوف کے آپ کی طبیعت میں آنے چاہئیں۔ کوئی شخص آپ کے تشدد اور ظلم کی وجہ سے خوف میں مبتلا نہ ہو۔ سزا جرم پر ملنی چاہیے۔ اس کی بنیاد صرف آپ کا غصہ یا حقارت نہ ہو۔ طاقت کا استعمال ہمیشہ وقت پر اچھا لگتا ہے۔ بے وقت طاقت دکھانا بیکار ہے۔”

بعض عہدیداروں کو بھی یہ لگتا تھا۔  
”میں جب بھی کسی شخص کو کسی عہدے کا داری دیتا ہوں تو اس کی زندگی کی ضروریات اور ملازمت کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کی۔ اس کے عہدے کا استعمال صرف اور صرف عوام کی بھلائی قرار دیا اور اسے ہر موقع پر حسن تدبیر سے کام لینے کی ہدایت کی۔ اسے یہ بھی ہدایت کی کہ وہ عوام پر ٹیکوں کو حد سے نہ بڑھنے دے اور اپنے ذاتی اخراجات میں بھی اسی ہدایت پر عمل کرے۔ رعایا کو جو رو ظلم کے بجائے حسن تدبیر سے اپنی اطاعت کا پابند رکھے۔ کسی کو صرف سزا کی وجہ سے خوف میں مبتلا نہ رکھے۔ امیروں اور سرمایہ داروں کو بھی اس طرف متوجہ کرے کہ وہ اپنی دولت کو اپنے ذاتی مفادات و خواہشات تک ہی نہ رکھے بلکہ عوامی بہتری کے لیے اس کو اولیت دے۔ اپنے مفاد کے لیے عوام کے انکار پر غصے میں نہ آئے اور اپنے مفاد کے لیے رعایا کو اپنے احکامات ماننے پر مجبور نہ کرے اور کوشش کرے کہ عوام کی فلاح کے لیے کئے گئے کاموں میں اس کی ذاتی غرض شامل نہ ہو۔ پھر بھی اگر کوئی شخص اس کے جائز احکام کو کرنے یا ماننے سے انکار کرے تو پہلے زبانی اس کو سمجھایا جائے۔ اگر پھر بھی ماننے سے انکار کرے تو اس کو قانون کے مطابق سزا دینے کا اختیار اسے حاصل ہے۔ لہذا تمہارے لیے بھی ان جملہ مشوروں اور ہدایت پر پابندی لازم ہے۔“

شاہ پور اول ہمیشہ اس بات پر پابند رہا کہ اس نے بے جا کسی شخص یا ریاست پر حملہ نہیں کیا۔ جب وہ بڑی مہمات کو مکمل کر چکا تو اس کی عدم توجہ سے پتھر کے ٹکڑے ان ساطرون جسے خزن کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا، اس نے

کافی لاؤ لشکر جمع کر لیا تھا اور اپنی طاقت کے ذمہ میں اس نے شاہ پور کو تادان کی ادا نیکی بھی بند کر ڈالی تھی، شاہ پور نے چونکہ اپنی ساری توجہ بڑے معاملات پر لگا رکھی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے شاہ پور کا کچھ علاقہ زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ شاہ پور نے اس کو پیغام بھیجا کہ تادان کی ادا نیکی بحال کرنے کے ساتھ ساتھ قبضے میں لی گئی اراضی کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ مگر اس نے شاہ پور کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ تب شاہ پور نے حصن حضرت نامی قلعے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ تاریخ دانوں کے مطابق یہ قلعہ اپنی ساخت کے اعتبار سے انتہائی پختہ اور خوب صورت تھا۔ اس کی تعمیر میں خزن نے خاص دلچسپی لی تھی تاکہ بیرونی حملہ آوروں سے یہ محفوظ رہ سکے۔

شاہ پور نے جب اس قلعے کا محاصرہ کر لیا تو ساطرون عرف خزن شہر میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا۔ اس کی بیٹی جو ہمیشہ مہم جوئی میں اس کے ساتھ رہتی تھی، وہ بھی اس قلعے میں موجود تھی۔ شاہ پور نے اس کی بیٹی نصر کی خوب صورتی اور معاملہ فہمی و ذہانت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہی حال نصر کا بھی تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ شاہ پور نے ان پر حملہ کر دیا ہے اور انہوں نے نہ صرف شہر بلکہ قلعے کو بھی محاصرے میں لے لیا ہے تو اس کے والد ساطرون نے تاریخ کے مطابق قلعے کے بالا خانے میں بھیج دیا تاکہ وہ اطمینان سے دشمن کو کسی تدبیر یا جنگ کر کے شکست دے کر قلعہ و اگر اذرا کر لے۔ شاہ پور ایک ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ وہ درج قلعے کے ارد گرد چکر لگاتا رہا تاکہ کسی بھی جگہ سے ساطرون کی کمزوری دیکھے اور قلعے کو فتح کر لے مگر اسے ہر بار تادان کی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تجربوں نے شاہ پور کو بتایا کہ ساطرون عرف خزن کی فوج کے ایک حصے کی کمان نصر اکر رہی ہے۔ نصر اقلے کے بالا خانے میں بیٹھ کر شاہ پور کی افواج کی نقل و حرکت پر پوری طرح توجہ رکھے ہوئے تھی۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، شہر میں محصور عوام کی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ شہر میں کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے والد کو مشورہ دیا کہ شاہ پور جیسے دانا اور بہادر آدمی کا مقابلہ کرنا ان کی ہمت سے باہر ہوتا جا رہا ہے لہذا بہتر یہی ہے کہ وہ ہتھیار ڈال کر قلعے کے دروازے اس پر کھول دے مگر ساطرون کو اپنی بے پناہ افواج اور اس کی وقاداری کا بڑا مان تھا۔ اس لیے اس نے ہر بار نصر ا کے مشورے کو

دھوکے باز

نکمر دیا۔

نصر اہر روز صبح ہی صبح حالات کا جائزہ لینے کے لیے قلعے کے بالا خانے میں آکر بیٹھ رہتی۔ اس نے شاہ پور کی جواں مردی اور بہادری کی کئی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اب کتنے دنوں سے وہ اسے خود اپنی آنکھوں سے اپنی فوج کو احکامات دیتے اور ان کی حفاظت کے لیے پہرے داری کرتے دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں چاہت کی پندگاریاں اس کے من میں سلگنے لگی تھیں۔

شاہ پور اپنے ارادے کا دعویٰ تھا۔ وہ جس بات کا ایک بار ارادہ کر لیتا تھا، جب تک وہ اسے پورا نہ کر لیتا اسے ادھرنا نہ چھوڑتا تھا مگر یہاں اس کے ارادوں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں اور شہر بند بادشاہ اور اس کی رعایا تک پہنچنے کا کوئی راستہ یا کسی طرح شہر میں داخلے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

اس روز بھی سورج کی سنہری کرنوں نے شہر اور قلعے کو ابھی پوری طرح سجایا نہ تھا۔ نصر اقلے کی بالائی منزل میں اس طرف چٹھی بھیجی جہاں سے سورج کی روشنی آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول رہی تھیں۔ معا اس نے دیکھا کہ ایک ”اچھے لپٹے“ قند کا مالک جس کے مضبوط جسم پر اس کا شاہانہ اور عزم اور ذوق برق لباس دیکھنے والوں کی نظروں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ اوپر سے اس کے چہرے کی سرخ و سفید رنگت نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر رکھا تھا، اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ اس کے چلنے میں بھی عجیب و بد بہ تھا۔ اس کے من نے فوراً گواہی دی کہ وہ نہ ہو یہی شاہ پور ہے جس کی بہادری اور دلیری کی داستانیں وہ بڑے عرصے سے سن رہی تھی۔ یہی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے نزدیک پہرا دیتے ہوئے ایک ملازم کو بلا کر اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ یہی شاہ پور ہے۔ اس تصدیق کے بعد اس کے من میں ہزاروں منہ بند خواہشوں نے سر اٹھالیا۔ یقیناً ایک ایسے ہی شخص کو وہ اپنے دل میں ایک عرصے سے بسا چکی تھی۔

”تم میرے لیے ایک کام کر سکتے ہو۔“ اس نے ملازم سے پوچھا۔  
”آپ حکم تو دیں، میرے لیے آپ کا حکم ایک اعزاز کا باعث ہوگا اگر میں اس کو پورا کر سکوں۔“  
”تو ایسا کرو اس شخص کو جسے تم شاہ پور کہتے ہو، میرا ایک پیغام کسی طرح پہنچا دو۔ قلعہ بند شہر سے تم میرے بتائے ہوئے لیے راستے سے نکل کر اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔“

”جیسا آپ کہیں گی اس پر حرف بہ حرف عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ ملازم نے جواب دیا۔  
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچائیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس جاسوسی پاکیزہ، مرکز شرت

C-63 فیڈرل انکسپشن ڈپنس ہاؤسنگ اتھارٹی بن کنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



بچہ۔ ”آئی! امی نے ایک کپ چینی منگوائی ہے۔“

آئی۔ ”اچھا تو اور کیا کہہ رہی تھیں تمہاری امی؟“ آئی نے کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

بچہ۔ ”جی وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر وہ بھجوس ندوے تو سامنے والی باجی سے لے آتا۔“

مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

”بچہ چاہیے۔“

”اگر تمہیں پہلے میری سچائی کا اعتبار نہیں آیا تو اب کیا آئے گا۔“ نضرانے جواب دیا۔

”اصل میں جب سے میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ ایک خوا خواہ کا خوف میرے دل میں گھر کر چکا ہے۔ میں اسے رفع کرنا چاہتا ہوں۔“ شاہ پور بولا۔

”چلو یہ بھی سہی اگر اس طرح تمہارے سن میں میری سچائی کا سورج طلوع ہو جائے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔“ نضرانے تنبیہ کی سے کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی محبت کا ثبوت طلاق کی گواہی پر معاہدہ لکھ کر تو دے دیا اور قلعے کا خفیہ راستہ بھی بتا دیا جس سے میری فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں لیکن اب تک یہ نہیں بتایا کہ تم نے اپنے باپ کو قلعے اور شہر میں داخلے سے کس طرح بے خبر رکھا تھا۔“

”میں نے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی تھی۔“ نضرانے جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ لیکن اتنی دیر بے ہوش رکھنے کی کوئی دوا تو ہمیں آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔“

”دوا کا یہ مرکب مجھے شاہی حکیم سے معلوم ہوا تھا۔ جس سے انسان رات بھر کے لیے غافل اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔“ نضرانے وہ مرکب شاہ پور کے پوچھنے پر بتا دیا۔

شاہ پور نے نضر کا خوش ہوتے ہوئے شکر یہ ادا کیا اور اسے بھرے اپنی محبت کا یقین دلایا اور یہ بھی کہا کہ اب اسے مکمل طور پر یقین ہو گیا ہے کہ وہ اس سے سچی محبت کرتی ہے۔ اس بات کو سننے ہی دن ہو گئے۔ نضر اب مطمئن تھی کہ بالآخر وہ اپنے محبوب کے دل میں گھر کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

ایک روز پھر اسی طرح شاہ پور نے بڑے پیار سے

جائے۔ دراصل میں اپنے دل کو اس بات پر مائل کر رہی تھی کہ میرا اقدام کس قدر درست ہے بالآخر میرا دل جیت گیا۔ یہ رہی ہماری خاندانی سونے کی نگوار جس پر میں نے تمہارے یقین کے لیے معاہدہ پاسداری لکھ دیا ہے اور یہ وہ چابیاں ہیں جن سے شہر کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں اور میں خود تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ اگر چاہو تو مجھے جان سے مار دو، چاہے اپنے وعدے کے مطابق اپنی دہن بنا کر ساتھ لے جاؤ۔“ نضرانے معاہدے کی نگوار اور شہر کی چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

شاہ پور نے اسی لمحے نضر کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور اپنے ملک کی طرف لے اڑا۔ جاتے جاتے اس نے شہر تیراکی چابیاں اپنی فوج کے سپہ سالار کو دے دیں کہ اگلی صبح وہ شہر کے دروازے کھول کر شہر میں داخل ہو جائے اور ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ شہر میں داخل ہو کر وہ قتل و غارت نہ کرے اور خاموشی سے قلعے پر قبضہ کر کے ساطرون کو زندہ گرفتار کر لے۔ اس کی اطلاع مجھے دی جائے تاکہ میں اگلا حکم دے سکوں۔

اگلی صبح کاغذات تیرا اور اس کے پاسیوں کے لیے ساطرون کی شکست اور اس کے لیے ایک نئے شاہ کی تخت نشینی کے اعلان کے ساتھ ہوا۔ شاہ پور نضر کو لے کر اپنے شاہی محل میں آ گیا اور اس کے بعد اندرون سلطنت کی دوسری سرکش قوموں اور شمال مشرق کی سرحدی مملکتوں کے ساتھ جنگ کرنے نکل گیا۔ ”استاق“ کا قلعہ فتح ہو چکا تھا۔ اس کی فوجیں خاموشی سے قلعے میں داخل ہو گئیں اور انہوں نے ساطرون کو بغیر کسی مزاحمت کے گرفتار کر لیا اور اسے پکڑ کر شاہ پور کی قید میں لا کر ڈال دیا جہاں اسے بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ شاہ پور اپنی مہمات سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس نے وعدے کے مطابق نضر اسے شادی کر لی۔

نضر اب بے حد خوش تھی کہ اس نے جو چاہا وہ اسے مل گیا۔ اب نضر اس کے لیے ہر دن خوشی کا اور ہر رات چاہتوں کی باتوں سے بھر پور تھی۔ ساطرون کو جب اپنی بیٹی کی بے وفائی کا پتا چلا تو وہ انتہائی مایوس ہوا تھا گرفتار کر کے اس کو قتل بھی کر دیا گیا۔ شاہ پور اور نضر اب بڑے آرام سے زندگی کے دن کاٹنے لگے تھے کہ ایک رات شاہ پور کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا، اس نے نضر اسے باتوں باتوں میں پوچھا۔

”نضر! ایک بات پوچھوں۔۔۔۔۔ مجھے اس کا جواب بچ

میں ہونے کے سبب اس سے ملنے کی خواہش مند تھی؟“ ”تم شاہ پور۔۔۔۔۔ اپنی جواں مردی اور بہادری میں بلاشبہ اپنی مثال آپ ہو مگر اس بات کو دھیان میں رکھو کہ تم چاہے کتنی ہی دیر شہر کا محاصرہ جاری رکھو، تم اسے کسی صورت فتح نہ کر پاؤ گے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ تم مجھ سے شادی کا وعدہ کرو تو میں تمہاری اس مشکل کو حل کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔“ نضرانے اپنے جذبے کا اظہار بر ملا کر دیا تو شاہ پور نہ صرف خوش ہوا بلکہ دل ہی دل میں اس بات پر آمادہ بھی ہو گیا۔

”گھر اس بات کا کیا اعتبار کرتے جو۔۔۔ کچھ کہہ رہی ہو سچ ہے۔۔۔؟“ شاہ پور نے پوچھا۔

”تم جو کہو اور جیسے کہو میں اس کا اعتبار دلانے کو تیار ہوں۔“ نضر ابولی۔

”مجھے عورتوں کی باتوں کا یقین نہیں آتا۔ یہ کسی لمحے بھی اپنے وعدے سے سکر سکتی ہیں۔“ شاہ پور تنبیہ کی سے کہنے لگا۔

”میں اس کے لیے معاہدہ لکھنے کو بھی تیار ہوں کہ میں جو کہہ رہی ہوں، وہ سچ ہے۔“ نضرانے جواب دیا۔

”تو پھر تم اپنی آبائی نگوار پر یہ لکھ کر بھیج دو۔ میں پھر نہ صرف تم پر یقین کر لوں گا بلکہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کو بھی تیار ہوں۔“ شاہ پور نے اپنی شرط بتادی۔

”ٹھیک ہے، تم کل اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔ تمہیں میری باتوں کی سچائی کا اعتبار آ جائے گا۔“

اگلی رات شاہ پور اپنی فوج سے نکل کر اسی جگہ پر آ گیا جہاں نضرانے اس کے ساتھ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کتنی دیر تک نضر اوہاں نہ آئی تو اس کے دل میں شک پیدا ہونے لگا۔

آخر عورت ہی نگلی نا بے اعتباری۔۔۔۔۔ دغا جس کی سرشت میں لکھا ہوتا ہے۔ کتنی دیر تک وہ گموگمو کی حالت میں ادھر ادھر پھر تا رہا۔ آخر اسے ایک جانب سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا تو وہ نضر اہی تھی۔ وہ خوف کے مارے بار بار ادھر ادھر اور اپنے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو شاہ پور بے تابی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے اپنی ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

”اتنی دیر لگ دی۔ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کل کی تمہاری ساری باتیں اور وعدے محض جذباتی تھے اور تمہاری یہ ایک لفریب چال تھی۔“

”نضر! ایسی عورت نہیں ہے جو بات کر کے کر

طرف اس کے باپ کا پیار اور اس سے محبت کا جذبہ اسے اس حرکت سے روک رہا تھا جبکہ ایک اُن دیکھا اور منہ زور جذبہ شاہ پور کو اپنانے پر اکسار رہا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھی۔ بالآخر شاہ پور سے لگاؤ کا جذبہ اس کی شخصیت اور سوچوں کو چمکت کر گیا اور اس نے شاہ پور کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی روز شام کے وقت اس نے اپنے ملازم کے ہاتھ شاہ پور تک پہنچا دیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

شاہ پور تو پہلے ہی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح شہر کے دروازے اس پر کھل جائیں اور وہ اپنی مہم کو بہتر طرح ختم کر سکے۔ جب ساطرون عرف خزن کا ایک فوجی اس سے ملنے کے لیے آیا اور اس کے ایک ساتھی نے شاہ پور کے ساتھ اس کی ملاقات کی اجازت طلب کی تو شاہ پور نے فوراً پوچھا۔

”یہ نضر اکون ہے۔۔۔۔۔؟“ ”وہ شہر ہجیرا کے بادشاہ ساطرون عرف خزن کی اکلوتی بیٹی ہے۔“

شاہ پور یہ سن کر ایک لمحے کو سکتے میں آ گیا کہ ایک ایسا بادشاہ۔۔۔۔۔ جو خود انتہائی چالاک و مکرور آدمی ہے اس کی بیٹی اس کے ساتھ کیوں ملنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ بہر حال بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے پیغام کو جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، ہم اس سے ملنے کو تیار ہیں مگر اسے بتا دینا اگر اس نے کوئی چالاک یا ہوشیاری دکھائی تو پھر ہم اس شہر کی تباہی و بربادی کے ذمے دار نہ ہوں گے۔ انہیں جا کر ہمارا پیغام پہنچا دو۔ ملاقات کی جگہ کا یقین اور وقت کا انتخاب وہ خود کر کے ہمیں بتا دیں۔ ہم مقررہ وقت پر اس جگہ پہنچ جائیں گے۔“ شاہ پور نے جواب دیا تو پیغام رساں نے سن و سن سہی جواب نضر کو پہنچا دیا۔ شاہ پور کا جواب سن کر نضر اس کے سن میں سلگنے والی آج ایک جوالا بھی بن گئی۔ اس نے اپنے والد سے کہے سے بغیر شاہ پور کو اپنا اگلا پیغام بھجوایا۔

”کل شام شہر سے کچھ دور ایک ویران جگہ پر وہ اس کا انتظار کرے گی۔“

چنانچہ طے شدہ مقام پر نضر اپنے بچپاتے اور چھپتے چھپاتے پہنچ گئی۔ شاہ پور بھی اسی وقت اس جگہ پہنچ گیا۔ ملاقات پر سب سے پہلا سوال جو شاہ پور نے نضر اسے پوچھا، وہ یہ تھا۔

”کیا وجہ ہے کہ وہ اس قدر بہادری اور دلیر بادشاہ کی



میں نے مڈر مسٹری ڈنر میں جانے کے بارے میں کسی نہیں سوچا تھا لیکن تم کے بے حد اصرار پر میں جانے پر آمادہ ہوئی۔ دراصل ایک عسکری ٹیئر گروپ مقامی یونیورسٹی کیمپس میں اپنا ڈراما پیش کر رہا تھا اور یہ ڈراما سلسلے کی کڑی تھی۔ جب ہم اسٹوڈنٹ سینٹر میں داخل ہوئے تو وہاں لگے ہوئے بورڈ پر ڈرامے کا نام دیکھ کر میرے حلق سے ایک غراہٹ برآمد ہوئی۔ عجیب بے لگنام تھا۔ ”موت کا سامان۔“ ”یہی دکھانے کے لیے تم مجھے یہاں لائے ہو؟“

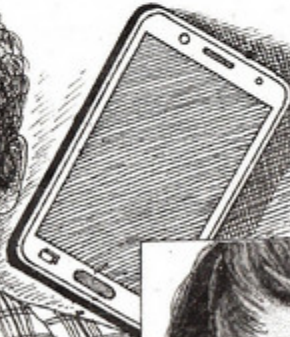
## غیر اہم

### تنویر ریاض

اپنے گرد خوبصورت چہروں کا ہجوم اور ان کے دلوں میں اپنے لیے گنجائش کا احساس یقیناً ہر ایک کے لیے فرحت بخش ہوتا ہے مگر کبھی کبھی یہ سب اپنا جھوٹا بہرہ بنانے اور کسی کو حسد میں مبتلا کرنے کے لیے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔۔۔ بس ایک یہی مذاق اسے بھی بہت مہنگا پڑا، جس کی قیمت اسے ہر حال میں ادا کرنا تھی۔ اگرچہ یہ بات اس کے لیے انتہائی غیر اہم تھی لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اسے اتنی مشکلات اٹھانے کے بعد پوہی گیا۔

سراغ رسانی میں معاونت کو جانے

والی ایک معمولی سی بات



”تم نے..... اکلوتی اولاد ہو کر اپنے والد کی محبتوں کا یہ صلہ دیا۔ اس سے دغا کی اور صرف اپنے عشق کو پانے کے لیے اس کی محبتوں اور جاتوں سے دھوکا کیا۔ فریب دیتی رہیں اسے..... ایک محبت کرنے والے باپ سے تنگ حرامی کی۔ تمہارا کیا اعتبار..... اور تم پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم جیسی لڑکی اپنے چاہنے والے باپ سے دھوکا کر سکتی ہے تو میرا اور میری سلطنت کا بھی ایسے ہی کام تمام کر سکتی ہے۔ یہ ساطرون عرف خزن کا محل نہیں ہے۔ شاہ پور کا محل ہے، تم ناقابل اعتبار ہو..... اپنے مفاد کے لیے تم کسی سے بھی دھوکا کر سکتی ہو۔ اس سے قبل کہ تم ایسا کرو کیوں نہ تمہارا کام ہی تم ہی کر دیا جائے۔“

انتاکہ کر شاہ پور نے نصر کے بالوں کو اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ پکڑا کر زمین پر گر پڑی۔ اب شاہ پور کے لہجے میں نفرت کی گھن گرج تھی۔ نصر نے اٹھ کر اس کا دامن پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

”مجھ پر رحم کرو..... مجھے معاف کر دو۔“

”مت گردانی باتیں۔ تم رجم کے قابل نہیں ہو۔ تم تو وہ ڈائن ہو، جو اپنے ہی گھر کو کھاجاتی ہے۔“ یہ کہتا ہوا وہ محل سے باہر نکل گیا۔ نصر ارونی چلاتی رہی اور دوڑ کر شاہ پور کے دامن کو پکڑنے کی کوشش کرتی رہی مگر شاہ پور اب نصر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اسی وقت اس نے شاہی اسٹبل سے ایک چابک دست سوار اور انتہائی تیز رفتار تھر اگھوڑا منگوایا اور ایک خادم کو کہا کہ نصر کے بالوں کو شاہی گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو اس وقت تک صحرا کی خاردار جھاڑیوں میں سر پٹ دوڑا کر گھسیٹا جائے، جب تک نصر کا وجود سوائے بالوں کے باقی نہ رہے۔

ملک فارس کے یہ ایک فرماں روا کا حکم تھا۔ اسی طرح کیا گیا۔ یوں ایک دھوکے باز کو اس کے انجام تک پہنچا دیا گیا۔ یہ 1500 قبل مسیح کا ملک فارس تھا جسے بعد میں ایران کا نام دیا گیا اور یہ اس دور کی ایک دھوکے باز شہزادی کا وہ المناک انجام تھا۔ جو قدیم ترین تاریخ کے اوراق پر اپنی حرماں نصیبی کا رد و آج بھی رورہا ہے۔

نصر اسے پوچھا۔  
”تمہارا کوئی اور بھائی یا بہن نہیں؟“  
”نہیں میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔“  
نصر نے جواب دیا۔

”پھر تو تم اپنے والدین کی بڑی لاڈلی ہوگی۔“  
”ہاں.....“ نصر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے والد مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔“ نصر پرانی یادوں میں گم ہو چکی تھی۔ وہ خاموش ہو رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر سے خاموشی توڑی اور گہمیر آواز میں بولی۔

”میرے والد کو اگر کسی سے سب سے زیادہ پیار تھا تو مجھ سے ہی تھا۔ وہ مجھے آئے روز پیار سے شہد، بالائی، مکن، میوہ جات اور اپنے ہاتھوں سے پھلوں کے جوس کا جام پلاتے تھے اور اگر میں انہیں لینے سے انکار کر دیتی... تو وہ میرے سر کو اپنی گود میں لے کر زبردستی مجھے یہ کھلاتے پلاتے تھے۔ میری ایک پل کی ناراضگی سے وہ بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک میں مان نہ جاتی انہیں چین نہیں آتا تھا۔“  
نصر نے نیکی آواز میں اسے سب بتا دیا۔

”پتا ہے، ایک روز میں کسی بات پر والد سے ناراض ہو گئی تو انہوں نے اتنی دیر تک کھانا نہیں کھایا۔ جب تک میں راضی نہ ہو گئی تھی لیکن..... میں.....“ وہ ایک دم سے رونے لگی۔ جب شاہ پور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اسے چھتپایا پھر چابک اس نے نصر کے بالوں کو پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھما لگا۔ محبت کی جگہ اب ایک دم اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اٹھنے لگی تھیں۔ نصر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا..... جہاں پیار کے بجائے نفرت اور نرمی کے بجائے سختی نے لے لی تھی۔

نصر نے تکلیف سے اپنے بالوں کو چھڑانے کی کوشش کی مگر شاہ پور کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اب شاہ پور نصر کے لیے درندہ بن چکا تھا۔ وہ نصر اسے مخاطب ہو کر بولی مگر جیسے کوئی درندہ دھاڑتا ہے۔

تاریخ هیروڈوٹس، هیروڈوٹس ترجمہ

سو مشہور کتابیں، ملکہ اشفاق ترجمہ

ضیاء النبی، پیر محمد کور شاہ الازہری جلد اول

المنصور، نلسوف ای پکوز کو یار ازی ترجمہ

ایوان بعد ساسانیان، ڈاکٹر حمید اقبال ترجمہ

تاریخ المسعودی، حسین بن علی المسعودی جلد اول دوم

تاریخ طبری، علامہ ابو جعفر جریر طبری جلد پنجم

مہذبوں کی کاپا کلبہ، کیرن آرمسٹرانگ، ترجمہ حنیف کھوکھر

تاریخ جنگ پیلوپونیش، ہیوسی ڈائیڈز ترجمہ

دی ایج آف فیٹہ، ول ڈیورانت ترجمہ



شہر واپس آئی تو ہر طرف سے نیسی..... نیسی کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں اور اب یہ دونوں میاں بیوی بھی جی بکھی بکھی رہے تھے کہ میں اس ڈرامے میں نیسی ڈریو کا کردار ادا کر رہی ہوں۔

کچھ لوگ اور ہماری میز پر آئے اور انہوں نے اپنا تعارف کروایا لیکن وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لیے اپنی باتوں میں لگ گئے۔ تم اور میں نے میگی اور نیشن سے تھوڑی بہت بات کرنے کی کوشش کی لیکن مزہ نہیں آیا۔ نیشن اپنی بات کی وضاحت کے لیے کسی نہ کسی بہانے میرے کندھے یا بازو کو ہاتھ لگاتا اور بھول جاتا کہ میں اس کی بیٹی کے برابر ہوں۔ ہم نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں جرائم کی دنیا کے بہت شوقین ہیں اور مسز میسون کے علاوہ باقاعدگی سے اس طرح کے ڈرامے دیکھنے جاتے ہیں۔

”یہ مجھے زبردستی لے جاتا ہے۔“ مسز تھامس نے کہا۔ ”حالانکہ وہاں ہمیشہ بہت ہی گھٹیا کھانا ملتا ہے۔“ پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”نہ صرف یہ شوز اکٹا دینے والے ہوتے ہیں بلکہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی بور ہوتے ہیں۔“ اس نے ایک وقفہ لیا اور ہمیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”موجودہ کینی ان سے مختلف ہے۔“

میرے برابر میں بیٹھے ہوئے غم نے قہقہہ لگایا لیکن اس میں بے ساختگی نہیں تھی۔ میں نے موضوع بدلنے کی خاطر مسز تھامس سے پوچھا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟“ اس نے اپنی ناچائیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”تم تو سراخ رساں ہو سکتی..... تم مجھے بتاؤ۔“ میں نے زبردستی ایک قہقہہ لگایا اور اپنی کرسی غم سے قریب کر لی۔

مسز تھامس نے مجھ پر ایک فیڑی نگاہ ڈالی اور اپنی جیکٹ کا گر بیان کھینچتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں کالج کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔“ تم آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”ایٹن کے والدین بھی یہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔“ ”ادھ اچھا۔“ مسز تھامس نے بدحواس ہوتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی ہمارے اور قریب کر لی۔ ”اور ایٹن بھی نیچر ہے۔“ تم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی آفٹر اسکول پروگرام میں طالب علموں کو بلا معاوضہ پڑھاتا ہوں۔“

جنگ کا نام استعمال کرتی ہوں، ایٹن۔“

☆☆☆

”کیا واقعی تم نے میرا ایک نام لکھوایا تھا؟“ میں نے غم سے پوچھا۔

”کیا میں نے کوئی غلطی کر دی؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور اس دن کو یاد کرنے لگی جب ہم پہلی بار ڈیٹ پر گئے تھے میں نے واپس آکر سیٹل کوٹون کر کے اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ شاید ہم ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ تم ایک خوش شکل اور زندگی کے بارے میں پرامید رہنے والا شخص تھا جبکہ میں ایک دہلی پستی خواہوں کی دنیا میں رہنے والی حساب کی نیچر تھی۔ ابھی تک مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جس پر میں قہقہہ لگا سکوں۔

تم کی ایک اور بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ کہ وہ دوسروں کی عزت کرتا تھا۔ یہ بات میں مسز تھامس کے بارے میں نہیں کہہ سکتی تھی جو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس شخص کی نظریں میرے جسم پر گزری ہوئی تھیں اور اب مجھے سمجھتا ہوں کہ وہ ہاتھ لگاتا کہ میں نے گھر سے نکلے وقت اپنا اسکاٹف لمباری میں کیوں چھوڑ دیا۔

”نیسی ڈریو پر اچھا مذاق ہے۔ اب ہم یقیناً اس قتل کا معاملہ کر لیں گے۔“

میں نے ایسی بات پہلے کبھی نہیں سنی تھی اس لیے میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے والدین نے یہ مذاق میرے ساتھ کیا تھا۔“ دراصل وہ دونوں یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے تھے اور انہیں ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے بیڑیوں کے نیچے اپنی لائبریری بنا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ میرے والد کی شادی میں صرف اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ وہ کسی کتاب کا آخری باب پڑھ رہے تھے۔ جب آپ گفتگو اور آرٹ کے بارے میں اتنے پاگل ہو جائیں تو آپ سے کوئی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے میرا نام رکھتے وقت یہ نہیں سوچا کہ آگے چل کر یہ میرے لیے کتنے مسائل پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ سے مجھے طنزیہ جملوں اور احمقانہ سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ دراصل ایک سراخ رساں لڑکی کا کردار تھا جو اپنی غیر معمولی ذہانت سے کئی بار میں ایک طویل عرصے تک اپنے آپ کو کالج میں ایٹن اریج کے نام سے متعارف کرواتی رہی لیکن جب اپنے آبائی

بہترین سکولی نے اس وقت کیا جب میں نے اسے بتایا کہ تم مجھے اپنے ساتھ کسی ”سرپرست“ پر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو خواہوں کے سہارے زندگی گزار دیتی ہیں اور کینڈل لائٹ ڈنر سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اسی لیے وہ کرید کرید کر مجھ سے غم کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں خود بھی یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

دراصل یہ میری بھی غلطی تھی کہ اسے میرا اصلی نام معلوم ہو گیا۔ میں نے ایک اچھی ماڈرن لڑکی بننے کی کوشش میں پہلی ڈیٹ پر اپنے حصے کے بل کی ادائیگی کرنے کے لیے کرڈٹ کارڈ نکالا تو اس نے مجھے منع کیا اور کارڈ مجھے واپس کر دیا۔ اس طرح اس نے میرا پورا نام پڑھ لیا۔ جب حقیقت مجھ پر واضح ہوئی تو بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ ”نہیں.....“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ مسکرا دیا۔ ”تمہیں بہت مزہ آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”میں زمانہ طالب علمی میں ان کے ساتھ ایک ڈراما کر چکا ہوں اور وہ بہت کامیاب ہوا تھا۔“

ہماری میز کمرے کے دوسری جانب دروازے کے ساتھ تھی۔ ہمارے والدین کی عمر کا ایک مرد اور ایک عورت عمدہ لباس زیب تن کئے اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نام کی تختی پکڑی ہوئی تھی اور وہ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ ان کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔

”یقیناً یہ ڈرامے میں حصہ لے رہے ہیں۔“ بیوی نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی یہ ایکٹرز ہمارے ساتھ بیٹھیں گے؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔“ ”مرد نے جواب دیا۔

”میز نمبر سات؟“ تم نے پوچھا پھر دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے مخصوص ہے۔“ ”میرا نام میگی تھامس ہے اور یہ میرے شوہر نیشن تھامس ہیں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مشہور سراخ رساں نیسی ڈریو ہمارے ساتھ بیٹھے گی۔“ وہ کارڈ پر انگلی مارتے ہوئے بولی۔

میں نے غم کو گھورا، پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مالا مال..... بالکل لیکن میں اپنا

میں نے غم کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ادھ نہیں۔ تم یقیناً اسے پسند کرو گی۔“ تم نے پورے اعتماد سے کہا۔

جس عورت نے بال روم کے باہر ہمارا استقبال کیا، وہ ہر جملے پر دانت نکالتی تھی۔ اس نے ہمیں خالی کارڈ دیے جن پر ہم ڈراما دیکھنے کے دوران لکھ سکیں کہ قاتل کون ہے اور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری میز پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔“ ایک بار پھر وہ بڑے جھگڑے سے ہنسی۔ ”تمہارا کئی نمبر سات ہے۔“

میں بھی جواب میں مسکرا دی لیکن میں اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں سمجھ رہی تھی بلکہ میرے اندر ایک خوف بے حد بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے غم کا بازو پکڑا اور دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اسے روکتے ہوئے بولی۔ ”تم نے میرے نام کی تختی پر کیا لکھوایا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے اپنی بھوپیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔ ”کیا تم نے..... غم! میں قسم کھاتی ہوں اگر تم نے یہ حرکت کی ہے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔“

وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ”تھوڑا صبر کرو۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟“ ”نہیں۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”اب جانے بھی دو۔“ وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”اندر چلتے ہیں۔ ڈراما شروع ہونے والا ہے۔“ وہ ہماری چوٹی ملاقات تھی جب ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آپس میں جسمانی تعلق قائم کرنا ہے یا یونیورسٹی خوش گپیاں کر کے وقت گزارتے رہیں گے، جب جذبات عروج پر تھے لیکن اس کے ساتھ ہی میں تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ معاملات صحیح سمت میں چلتے رہیں گے۔ تم دیکھنے میں بہت اچھا اور شریف انسان تھا اور ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا جو مجھ میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس نے وسط شہر میں مووی تھیٹر کھول رکھا تھا جہاں کلاسک فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ وہاں کا پوپ کارن بہت مشہور تھا۔ وہ اپنے والدین سے رابطے میں تھا اور ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ انہیں خط بھیج کر رہتا۔ اسے گہرے رنگ کی جینز پسند تھیں۔ اس کے ساتھ وہ قیمتی جوتے پہنتا۔ البتہ اسے فٹ بال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تم نے اس کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، اس سے تو لگتا ہے کہ وہ خاصا دلچسپ ہے۔“ تیسرے مردی



”کیا تم ہماری ایک تصویر لے سکتے ہو؟“ تم نے اچانک کہا۔ ”مجھے اپنا موبائل نکالنے کے لیے کہنی ماری۔“

”یقیناً... مسٹر تھامس نے خوش دلی سے کہا اور میں نے ہنسی کرتے ہوئے موبائل اسے پکڑا دیا پھر میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر تم نے اپنا بازو میرے کندھے پر رکھا اور ہم دونوں بوز دینے کے لیے مسکرا دیے۔ مسٹر تھامس نے ہنسنے دیا اور کہا۔ ”دیکھو، کتنی اچھی تصویر آئی ہے۔ میں مزید تصویر بھی لے سکتا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اچھی ہوں گی۔“ میں نے تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، واقعی بہت اچھی ہیں۔“ تم نے بھی تائید کی۔ ”اب میری اور تمہاری ایک سیٹھلی ہو جائے۔“

تھامس نے مسنی خیر انداز میں کہا۔

میں نے زوردار قہقہہ لگایا تو وہ میرے قریب آ گیا۔ اب اس کا کھر در اچھرہ میرے گالوں کو چھو رہا تھا۔ میری کچھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ مجبوراً میں نے اپنا موبائل سامنے کیا اور ایک سیٹھلی لے لی۔

”اب یہ تصویر تمہیں ہمیشہ میری یاد دلاتی رہے گی۔“ تھامس نے کہا۔

”اوہ ہاں۔“ میں نے قہقہہ لگایا۔ ”میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”نیشن! کیا تم نے اسے پورے بارے میں بتایا؟“ ”میں نے تیز آواز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے پر میں حیران رہ گئی۔ مجھے اب بھی یقین نہیں تھا کہ وہ ہم دونوں یا کسی اور سے نفرت کر سکتی ہے۔

مسٹر تھامس نے اپنی ہنسی بھری اس طرح میری جانب اٹھائیں کہ اس کی بیوی نہ دیکھ سکے پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”نیشن!... پھر اس نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور کہنے لگا۔ ”میں نے اس کی ایک تصویر اسپین سے منگوائی ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس تصویر کی بات کر رہا ہے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم ایڈون پور کو نہیں جانتیں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو مسٹر تھامس بولی۔ ”اب تو وہ امریکا میں بھی کافی مقبول ہے۔ اس کا تعلق کیوبا کی تحریک سے تھا۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی لیکن نیشن اسے بہت چاہتا ہے اور اب ہمارے پاس اس کی نئی پینٹنگ آگئی ہے۔“

”واؤ، مبارک ہو۔“ تم نے کہا۔ ”ہم تو صرف ان تصویروں کے بارے میں جانتے ہیں جو بازار سے خرید کر لوگ اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر لگاتے ہیں۔“

خدا خدا کر کے شو شروع ہوا۔ ایک اداکار سے سوٹ میں بلیوس ایجنٹ پر نمودار ہوا۔ اس نے اپنے سر کے آدھے بال کسی چمکی نیل سے چپکائے ہوئے تھے اور گیس کے ہٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ سب لوگوں کو یہاں آکر آپس میں گلے ملنے اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملا ہوگا۔ اس کے لیے میں سب لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

اس کی بے غمی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ بیٹھے بیٹھے میری ٹانگوں میں خون جننے لگا اور میں نے حرارت پہنچانے کے لیے انہیں ملنا شروع کر دیا۔ اسی وقت میرے فون میں بجبنا ہٹ ہوئی۔ میں نے پرس سے فون نکال کر دیکھا۔ وہ سیسل کا پیغام تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

میں مسکرائی اور وہ تصویر جو مسٹر تھامس کے ساتھ لی تھی، اسے بھیج دی۔ چند سیکنڈ بعد اس کا جواب آیا۔ ”اوہ میرے خدا! تم کہاں ہو اور یہ بوز کھانوں ہے؟“

میں نے قہقہہ روکنے کے لیے اپنے ہونٹ مسخ لے لیے۔ اسی وقت مسٹر تھامس میری طرف مجھے اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ”تم ایک اہم سرانجام خالق کر رہی ہو نیشن۔“

میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس کی بیوی نے ہم دونوں کی طرف دیکھا تو میں مسکرا دی لیکن وہ جواب میں نہیں مسکرائی۔

ایجنٹ پر اداکار اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ یہ عجائب گھر کئی سال پہلے بنا کارہ ہو گیا تھا لیکن میز کی کوششوں سے یہ بحال ہو سکا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہمارے علم میں آئی کہ اس کے مالک کی بیٹی کا ایک مشہور تاجر سے معاشرہ چل رہا تھا۔

میں اس گفتگو سے اتنا کر لیڈر ز روم میں چلی گئی اور فون نکال کر سیسل سے پیغامات کا تبادلہ کرنے لگی۔ جب واپس آئی تو ڈنر شروع ہو چکا تھا اور سلاو دیش کی جارہی تھی۔

مسٹر تھامس نے کرسی پیچھے کی اور مجھے جینے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھول مت جانا۔“

”میں کوشش کروں گی کہ ایسا نہ ہو۔“

”اگر تم چاہو تو مجھے فون کر سکتی ہو۔“ اس نے پلکیں ہلکائی اور فون کی طرف اشارہ کیا۔ میں سوچنے لگی کہ کہیں اس نے دیکھ تو نہیں لیا جب میں نے اس کی تصویر سیسل کو بھیجی تھی۔ میں نے اپنا فون بیگ کی چمکی تہ میں رکھ دیا۔

جیسا کہ مسٹر تھامس نے پہلے ہی بتا دیا تھا، وہ سلاو ہائل روایتی انداز کی تھی۔ ٹھنڈی پائپس، ایک سلاو کا پتا، ایک نماز، گاگر کے گلے اور اس پر چھاپی ہوئی دہری تہ، مجھ سے پہلے جو عورتیں میز تک پہنچیں، انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے قہقہہ لگایا اور میرے حصے میں چھٹھ ہی آئی۔

یہ دیکھ کر تم نے بغیر کچھ کہے اپنے حصے کے نماز میری پلیٹ میں ڈال دیے۔

”کیا تم نے بھی اپنے گھر پر اس طرح کے مرڈر مسز کی ان کی میزبانی کی ہے؟“ تم نے مسٹر تھامس سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ ایک اچھی میزبان ثابت ہو سکتی ہوں۔ ویسے بھی یہ سب اداکاری ہے۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی ہوں۔“ تم نے کہا اور کھیانا ہو گیا۔

”وینس سلاو کی پلیٹیں اٹھانے کے لیے آئے، اس وقت تک وہ مسٹر تھامس اپنی جگہ پر واپس نہیں آیا تھا۔ ان میں سے ایک وینس نے مسٹر تھامس سے پوچھا کہ اس کا شوہر ان میں کیا لیتا پسند کرے گا؟“

”کچھ بھی لے آؤ۔“ وہ مجھے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی جہاں ڈرا سے کے اداکار ایک بار پھر جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے خالی گلاس میں جھجھکا مارنا شروع کر دیا۔ مسٹر تھامس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا اور میں نے پوچھا بھی نہیں لیکن تم اپنے بوائے فرینڈ سے کہہ سکتی ہو کہ وہ میری خاطر ایک دفعہ مردوں کے ریٹ روم میں دیکھ لے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے اتنی دیر کیوں ہوگئی؟“

تم کو جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا حالانکہ اس طرح وہ ڈرا سے کا بہت صاحبہ دیکھنے سے محروم ہو جاتا لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس کے لیے فوس لٹی رہوں گی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا اور لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”مردوں کے ریٹ روم میں کوئی نہیں ہے۔“

”نیشن اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا؟“ مسٹر تھامس فرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ تازہ ہوا کے لیے باہر چلا گیا ہو۔“

”آخری بار وہ تازہ ہوا کے لیے اس وقت باہر گیا تھا جب جاپان نے پرل ہاربر پر بمباری کی تھی۔“ اس نے طنزاً کہا اور قہقہہ لگا دیا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بھی شو کا ایک حصہ ہے۔“ تم نے کہا۔ ”شاید وہ اسے کوئی کاسٹیوم پہنا کر واپس لائیں اور اس طرح ہمیں ہنسنے کا موقع مل جائے۔ تم دیکھنا ایسا ہی ہوگا۔“

میری بھی یہی خواہش تھی۔ میں چاہ رہی تھی کہ تھامس ایک زخمی ہرن کی طرح لڑکھاتا ہوا ایجنٹ پر آئے۔ میرے خیال میں وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔

”ممکن ہے۔“ مسٹر تھامس نے کہا اور مجھے یوں لگا کہ وہ ابھی کھڑے ہو کر شو روک دے گی۔ بالآخر اس نے ایک ویٹر کو بلا کر کہا۔ ”میرے شوہر ابھی تک ہاتھ روم سے واپس نہیں آئے۔ مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ اسے شو کا حصہ بننے کے لیے تو نہیں کہا گیا؟“

وینس حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”اوہ نہیں میڈم! میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرتے پھر بھی میں تمہاری تسلی کے لیے چیک کر لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن فوراً ہی کسی نے دوسری میز پر بلا کر اس سے آکس میں کیڑا لٹکنے کی شکایت کی اور مسٹر تھامس سر آہ بھر کر رہ گئی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک طرف کوچل دی۔

ہمارے ارد گرد بیٹھے لوگوں نے ہمیں گھورتا شروع کر دیا لہذا میں نے شو کی جانب متوجہ ہونے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”میں لیڈر ز روم کا ایک چکر لگا کر آتی ہوں۔ اب مجھے مسٹر تھامس کی بھی فکر ہو رہی ہے۔“ میں نے تم کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اچھی واپس آ جاؤ گی۔“

”تم بھی اس کی طرح غائب نہ ہو جانا۔“ تم نے کہا۔ باہر ہال میں خاموشی تھی۔ میں ریٹ روم کی طرف بڑھی اور دیکھا کہ ہال کے آخری سرے پر مسٹر تھامس کسی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ دیکھنے میں لگ رہا تھا کہ وہ عورت بیس کام کرتی ہے۔ مسٹر تھامس ہاتھ بچا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے اس عورت کو کہتے ہوئے سنا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں تھی۔“

میں ان کے پاس سے گزر کر اس راہداری میں چلی



مگنی جہاں مردوں اور عورتوں کے ریست روم تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مردوں کے روم میں داخل ہوتی۔ میں دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوئی لیکن مجھے کچھ سنا نہ دیا پھر میں نے نیچے دیکھا تو مجھے ٹائل کے فرش پر سرخ قطرے نظر آئے۔ میں نے جبکہ کر قریب سے دیکھا تو وہ مجھے کیلے لگے۔ میں نے لیڈ بڑ روم سے پیچہ ناول لیا اور ان قطروں پر رکھا۔ سرخ خون پیچہ ناول پر پھیل گیا۔ اس خون کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کیا واقعی وٹسن تھامس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا جو میرے والدین نے سنایا تھا کہ کس طرح یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو نشے میں دھت دو بھائیوں نے گھیر کر تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ کہیں پروفیسر کے ساتھ بھی کچھ ایسا تو نہیں ہوا؟

مردوں کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں پیچھے ہٹی اور وہ ناول اپنے پیچھے کر لیا۔ وہاں ایک نوجوان شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی ناک پر بڑی سی تولیا کی پٹی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹا اور ہنسنے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا، میری نکسیر پھوٹ گئی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ احمقانہ انداز میں ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

واپس جاتے ہوئے میں ایک سگریٹ پینے کے لیے رک گئی۔ گوکہ میں ایک عرصے سے اسے چھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید تھامس پارکنگ لاٹ میں کسی اور عورت کو رنگ بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ وہ اسی ٹائپ کا آدمی تھا جو اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں سگریٹ کا پیکٹ نکالتی، سیسل کا ایک اور پیغام آگیا۔

”کیا تم نے ابھی تک اسے دھکا نہیں دیا؟ میں تو بار کے باہر خوب صورت لوگوں میں گھری ہوئی ہوں۔“ میں نے قہقہہ لگایا اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے پٹی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

وہ واقعی ایک خوب صورت شخص تھا۔ میں حیران تھی کہ سیسل کا تصور اتنی جلدی حقیقت بن کر میرے سامنے آگیا۔ وہ کتنا فراہم کرنے والی کمپنی کا نمائندہ تھا اور اپنی دین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

”کچھ کھو گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں،

در اصل میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“

کمپنی کے دو بڑی عمر کے آدمیوں نے ہم پر ایک اچنی ہوئی نظر ڈالی اور ایک چمڑے کو عمارت میں دھکیلنے لگے۔ ”تم نے کسی موٹے شخص کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”موٹا شخص؟“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، اگر دیکھا ہوتا تو مجھے ضرور یاد آ جاتا۔“ وہ ایسا بندہ تھا کہ سیسل اسے دیکھ کر فوراً ہی پھسل جاتی۔ اس نے بڑے دلکش انداز میں پوچھا۔ ”کیا تم کسی کا انتظار کر رہی ہو؟“

میں نے شرما تے ہوئے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ کیا تم بھی مرڈر سسٹری ڈنر میں آئے ہو؟“

”اوہ ہاں۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مرڈر..... میرا کچا نام ہے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“ میں نے چڑکھا۔

”کیونکہ میں ایک پراسرار شخص ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

دروازے کے اندر سے اس کے ایک ساتھی نے سیٹی بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ گھبرا کر بولا۔ ”معاف کرنا..... مجھے کام پر جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”عجیب اتفاق ہے کہ اے یو موچ پر میں ہمیشہ ڈیوٹی پر ہوتا ہوں۔ بہر حال تم اپنے ڈنر کا مزہ لو۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن رک گئی۔ پھر کچھ سوچ کر تھوڑا سا فٹ پاٹھ کی جانب بڑھی اور یوں ظاہر کیا جیسے میں اپنا موبائل چیک کر رہی ہوں لیکن درحقیقت اس کی تصویر لینا چاہ رہی تھی تاکہ سیسل کو بھیج سکوں۔ یہ یقیناً

مسٹر تھامس کی ڈراؤنی تصویر کے برعکس ہوگی جو میں اسے پہلے بھیج چکی تھی لیکن جیسے ہی میں نے تصویر لینے کے لیے فٹن دیا یا اس کا ایک سامی دوبارہ دین کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میرے راستے میں آگیا اور مجھے کھورنے لگا۔ میں نے گھبراہٹ میں کمر اٹھایا اور تیزی سے عمارت کی طرف جانے لگی۔ یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں مستقل مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ جب میں اس کی نظروں سے اوچھل ہو گئی تو

تصویر کو چیک کیا۔ یہ میری بدقسمتی کہ تصویر میں دین کا پچھلا

حصہ اور اس لڑکے کی صرف کھنی آئی۔ میں نے وہ تصویر صاف کر دی اور ایک سر داہمہ کر آگے بڑھ گئی۔

میں نے اس امید پر اسٹوڈنٹ سینٹر کے گرد چکر لگایا کہ شاید کہیں مسٹر تھامس سے سامنا ہو جائے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ میں واپس اس جگہ پر آئی جہاں کیشنگ والے کھڑے ہوتے تھے لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا اور ان کی دین بھی جا چکی تھی۔ مجبوراً میں مایوسی کے عالم میں واپس لوٹ آئی۔

”تم کہاں رہ گئی تھیں؟“ تم نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”تم نے ڈنر بھی کس کر دیا۔ میں تو پولیس کو فون کرنے والا تھا۔“

”کیا وجہ ہے کہ آج سب لوگ یہاں سے غائب ہو رہے ہیں؟“ ہمارے برابر والی میز پر بیٹھی ہوئی عورت نے کہا۔ ”کیا یہاں بھی کوئی جرم ہونے جا رہا ہے؟ شاید اسی لیے تم نے پورا ڈراما نہیں دیکھا۔ اب ہم یہ انعام جیت جائیں گے اگر ہم نے قتل کا معاملہ کر لیا۔“

میں اسے نظر انداز کر کے ٹھم کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”میں تازہ ہوا کے لیے باہر گئی تھی لیکن جب واپس آئی تو یہ دروازے بند تھے۔ خوش قسمتی سے انتظامیہ کی ایک رشتہ مندر نے میری دستک کی آواز سن لی اور اس طرح میں اندر آنے میں کامیاب ہو گئی۔“

”تم تازہ ہوا کے لیے باہر گئی تھیں یا اس شخص کو اصرار دے؟“ تم نے کہا۔

”وہ شخص؟“ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں اس کیئرنگ والے لڑکے کا خیال آیا لیکن فوراً ہی سمجھ گئی کہ تم کا اشارہ کس جانب ہے۔ میں نے مسٹر تھامس کی خالی کرسی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں ایسا کیوں کروں گی؟“

”کیونکہ تمہیں پراسرار واقعات پسند ہیں۔ چاہے تم اس کا اعتراف نہ کرو۔“

”یہ احمقانہ بات ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

”تم خوش قسمت ہو کہ ابھی سوئٹ ڈش آتا باقی ہے۔“ جب سوئٹ ڈش پیش کی جا رہی تھی تو مسٹر تھامس بھی واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ میں نے اس

کو پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ کہیں نہیں ملا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ گھر پر بھی فون کیا لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔ تھمیز والوں کا کہنا ہے کہ شاید وہ باہر نکل گیا ہو لیکن میں نے کار میں بھی دیکھ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

## وائرس

سائنسدانوں نے کہا ہے کہ کیلے میں ایڈز کے وائرس سے تحفظ فراہم کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس کی مدد سے مستقبل میں ایڈز کے علاج میں پیش رفت ممکن ہے۔ اس سلسلے میں لیبارٹری میں کیے گئے تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ کیلے میں شامل ایک جزو Ban Lec میں وہی خوبیاں موجود ہیں جو اس وقت HIV کے خاتمے کے لیے استعمال کی جانے والی دو دواؤں میں ہوتی ہیں۔ سائنسدانوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ ”بین لیک“ یعنی سستی دواؤں کی تیاری سے لاکھوں جانیں بچائی جاسکیں گی۔ مختلف پودوں میں قدرتی طور پر پائے جانے والے ایسے کیمیائی مادے جو انٹیکشن کا مقابلہ کر سکتے ہیں، Lectin کہلاتے ہیں اور ”بین لیک“ بھی لیٹن کی ایک قسم ہے۔ امریکی ریسرچرز نے اپنی تحقیق میں یہ دیکھا ہے کہ کیلے میں پایا جانے والا لیٹن جسم میں وائرس کے داخلے کو روک دیتا ہے اور اس طرح ایچ آئی وی سے تحفظ فراہم ہو جاتا ہے۔ ”بین لیک“ اس لحاظ پر وٹسن پر اثر انداز ہوتا ہے جس میں ایچ آئی وی کا جینیائی مواد محفوظ ہوتا ہے۔ مشی مکن یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اس ریسرچ کے قائد مائیکل سوانسن نے کہا ہے کہ ایچ آئی وی کی بعض دواؤں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ایڈز کا وائرس اپنی ماہیت تبدیل کر کے دواؤں کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تاہم لیٹن کی موجودگی میں یہ کام وائرس کے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ لیبارٹری میں ”بین لیک“ کو اس طرح موثر پایا گیا جس طرح اس وقت ایچ آئی وی کے خلاف استعمال کی جانے والی دواؤں T-20 اور ”سیرا وروک“ موثر ہیں۔ مائیکل سوانسن ”بین لیک“ کی ہیئت کو تبدیل کر کے اسے انسانی مریضوں کے لیے قابل استعمال بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ریسرچرز نے توقع ظاہر کی ہے کہ اسے تھامز کے دوا کے طور پر یا دیگر اشیائے ایچ آئی وی دواؤں میں شامل کر کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو دنیا بھر میں لاکھوں جانیں ضائع ہونے سے بچائی جاسکیں گی۔



آرہا کہ کیا کروں؟

”کیا تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟“ میں نے کہا۔  
”نہیں شکریہ۔“ پھر اس نے میری کرسی کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا فون گر گیا ہے۔“

”میرا فون؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔  
”میں نے جھک کر دیکھا، کرسی کے نیچے میرے آئی پوڈ فون کا کیس پڑا ہوا تھا۔ یہ غالباً اس وقت گر گیا ہوگا جب میں اپنا فون بیگ میں ڈال رہی تھی۔ میں نے جھک کر وہ کیس اٹھایا۔ اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا پھر مسرتھاس کو دیکھا۔ مجھے اپنے گال سرخ ہوتے محسوس ہوئے۔ میں نے دل میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔“

مسرتھاس مجھے میں بڑ بڑاتی ہوئی ہمارے ساتھ چل دی۔ ہم اس وقت ہال سے گزر رہے تھے۔ ”مجھے امید ہے کہ اس نئے سیکورٹی سسٹم کی وجہ سے وہ اپنے دفتر میں بند ہو گیا ہوگا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے رات بھر وہیں رہنے دیا جائے۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری جگہ میں بھی یہی کرتی۔“ میں نے کہا۔ اس احمق پرفیسر نے کسی طرح چپکے سے وہ کاغذ میرے فون کے کیس میں رکھ دیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں اس سے تصویروں کی نمائش کے قریب نیچے بیڑھیوں پر ملوں پھر وہ مجھے تنہائی میں پوری نمائش دکھائے گا۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ یہ میرے آئی پوڈ فون کا کیس ہے۔ اسی لیے اس نے جاتے وقت مجھے بڑے بے ڈھنگے پن سے آکھ ماری اور کہا کہ میں اسے فون کروں۔ اسی لیے میں وہ رقعہ پڑھ کر جان گئی کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح گھٹیت رہی ہوں۔“ مسرتھاس نے کہا۔ اب وہ تھوڑی سی شرمندہ نظر آرہی تھی۔

”کیا تم مذاق کر رہی ہو؟ مجھے تو مزہ آرہا ہے۔“ تم نے کہا پھر اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب ہے، مجھے افسوس ہے کہ تمہارا شوہر اس وقت مشکل میں ہے۔“

”مشکل میں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم نے ابھی مشکل دیکھی نہیں ہے۔“  
ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں دو عدد ڈبل شیشے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر خوب صورت

الفاظ میں لکھا ہوا تھا..... ”پیٹرن آرٹ گیلری۔“

”یہ وہ جگہ جو وہ تمہیں اکیلے میں دکھانا چاہ رہا تھا۔“ مسرتھاس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے غبی سے کہا جیسے اسے یقین نہ ہو کہ میں نے پروفیسر کی پیشکش کو سنجیدگی سے لیا تھا یا نہیں۔ ”نیشنل کالافتر اس طرف ہے۔“  
جب اس نے دروازے کی تاب گھنائی تو مجھے اپنا سانس روکنا ہوا محسوس ہوا۔ میں سوچ رہی تھی کہ دروازے کے دوسری جانب مسرتھاس نہ جانے کس حال میں ہوں گے لیکن دروازہ مٹفل تھا۔ گوکہ ہم نے کئی بار زور سے دستک دی اور مسرتھاس نے حسب عادت دھمکیاں بھی دیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

”ممکن ہے کہ وہ گیلری میں ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا اور ہم واپس ڈبل دروازوں کی جانب چل دیے۔ ”مجھے یقین ہے کہ گیلری بند ہوگی۔“ مسرتھاس نے بڑے وثوق سے کہا لیکن جیسے ہی اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے آواز طریقے سے کھٹکا چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کسی نے دھات کے تالے پر پیپ کا ٹکڑا چپکا دیا تھا تاکہ وہ بند نہ ہونے پائے۔

ہم گیلری کے اندر چلے گئے۔ وہاں کافی گھنٹن تھی لیکن تھا کہ ہوا کے گزرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ ہمارے بالکل سامنے وائٹر میں بنی ہوئی نیلے پھولوں کی ایک بہت بڑی تصویر تھی۔ مجھے پھولوں کی زیادہ پہچان نہیں اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کون سے پھول تھے لیکن اس کے نیچے ایک چھوٹے سے پلے کارڈ پر ان کا نام لکھا ہوا تھا..... ”پلیو پیو پیو“ اور یہ ولیم رچرڈ کی اسٹیٹ کی جانب سے عطیہ کی گئی تھی۔

”پوپر کی پینٹنگ اس طرف ہے۔“ مسرتھاس نے ہمیں بتایا۔ ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ہمارے سامنے ایک بڑی خالی سی دیوار تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر ایک چھوٹی سیڑھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔

مسرتھاس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”تصویر غائب ہے۔“ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ ”کسی نے اسے چوری کر لیا۔“  
تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آگئی۔ ان کے ساتھ دوسرا خ رساں بھی تھے۔ مرد کا نام اسٹیل تھا۔ میں یہ نام سن کر اس سے کوئی احمقانہ مذاق کرنے والی تھی لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو روک لیا۔ البتہ اس ہنگامے میں عورت کا نام

مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیں وہاں ٹھہرنے کے لیے کہا اب تک وہ جانے تو وعدہ کی تلاشی نہ لے لیں۔

مسرتھاس زار و قطار رو رہی تھی۔ شوہر سے اس کی ناراضی اب خوف میں بدل چکی تھی۔ ”کیوں وہ اسے اپنے ساتھ پرغال بنا کر تو نہیں لے گئے؟“ اس نے ہم سے پوچھا۔ اس نے ایک ہلکا سا ٹھہکن لکھا تھا جس میں وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ میں نے اسے اپنا سویٹر دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بلڈنگ منیجر اسے دلا سادے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اسے اپنا کام بھی دیکھنا تھا۔

تم اور میں فٹ پاتھ پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی ڈزچیکٹ میرے شانوں پر ڈال دی کیونکہ ہم دونوں کے کوٹ عمارت کے اندر ہی رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد پولیس والوں نے ہمیں اندر بلایا اور سوالات شروع کر دیے..... مسرتھاس کب غائب ہوئے؟ ہم نے کیا دیکھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنی طرف سے ان کا جواب دینے کی پوری کوشش کی لیکن میرے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے وقت کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔ انہوں نے ہمیں جاننے کی اجازت دے دی لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ مسرتھاس کو ایسا چھوڑ دوں۔ لہذا ہم اس کے پاس ایسے رک گئے۔

ہم ابھی مسرتھاس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ عمارت کی منیجر چارے پاس آئی۔ وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا چاہ رہی تھی اور ہمیں قائل کرنا چاہ رہی تھی کہ پوپر کی عکاسی کا کوئی بھی فرد کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا۔ ”یہاں ہر طرف کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی بھی شخص کیمرے کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکتا ہے۔ لوگ یہاں ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں اور ہم نے آج ہی اپنے سیکورٹی سسٹم کو آپ ڈیٹ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دروازے ہر وقت بند نہیں ہوتے۔ جب کیئرنگ والے اپنا سامان اندر رکھ رہے تھے تو اس وقت دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایسے میں کوئی بھی اندر باہر جاسکتا ہے۔“  
”کیئرنگ والے؟“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کون کیئرنگ والے؟“

”ہاں وہی جنہوں نے اس ڈنر کے لیے کھانے کا اہتمام کیا ہے بلکہ میں نے ان سے پوچھا بھی تھا کہ کیا انہوں نے مسرتھاس کو دیکھا ہے۔“  
”ہم نے اس ڈنر کے لیے کسی کیئرنگ والے کو نہیں

بلایا۔ ہماری اپنی کمپنی ہے۔ البتہ ان کا سارا سامان اسی عمارت میں رکھا جاتا ہے۔“

میں سوچ میں پڑی کہ پھر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو کیئرنگ کمپنی کا نمائندہ ظاہر کیا؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، پیٹرول میں عمارت سے باہر بھاگتے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک خاتون سراخ رساں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”سنگی! بہتر ہے کہ تم اندر آ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے تم شددہ فرد کو تلاش کر لیا ہے۔“  
جب سراخ رساں میں نے میرا بیان لیا تو وہ اس بات پر خوش نہیں تھی کہ مجھے دین پر لکھا ہوا نام کیوں یاد نہیں رہا۔ ”وہ کوئی عام سامانوس نام تھا اور اس پر ایک نیلے رنگ کا لوگو بنا ہوا تھا۔“ میں صرف یہی بتا سکتی تھی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سراخ رساں اسٹیل بولا۔ ”وہ لوگو کونسی بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس شہر میں سفید رنگ کی کتنی دین موجود ہیں؟“

میں نہیں جانتی تھی لیکن اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ وہ اسپتال والوں سے اجازت لینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ مسرتھاس کا بیان لیا جاسکے۔ میرے فون کے کیس میں رقعہ ڈالنے کے بعد وہ گیلری میں جا کر میرا انتظار کرنے لگا لیکن وہاں اس کا سامنا چوروں سے ہو گیا جنہوں نے اس کے سر پر ضرب لگائی اور اس کے دفتر کے برابر والے کمرے میں بند کر دیا۔ پولیس کو وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے کراہنے کی آواز آئی۔ جب انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس کے لیے اسی کی ٹائی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر گہرا زخم آیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

ان کیئرنگ والوں کے بارے میں مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اس لڑکے سے پوچھا کہ کیا تم مرڈر مسٹری کے لیے آئے ہو تو اس نے جواب دیا کہ مرڈر میرا کچا کام ہے جو کہ ایک احمقانہ بات تھی۔ اس نے صرف مجھ سے پوچھا چھڑانے کے لیے ایسا کہا تھا جبکہ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ سے فلرٹ کر رہا ہے۔ پھر میں نے مسرتھاس کے بیان کے بارے میں سوچا۔ وہ پولیس والوں کو بتا رہی تھی کہ چوری ہونے والی تصویر بہت بڑی تھی اور کوئی اسے اپنی نہیں کی جیب میں رکھ کر نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس کا سائز ایک میز کے برابر تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ وہ کوئی سامان نہیں اتار رہا





## رائگاں

مظہر سلیم ہاشمی

سنا ہے درندہ صفت انسانوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں جو زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ کر جب دل چاہے کسی کی جان لے لیتے ہیں مگر یہاں تو اچانک اس درندے کو ایک رشتے کی محض یاد نے ہی خون کے آنسو رلا دیا۔

### برقیلی شاموں میں ایک خون آشام روداد

”غم و آلام میں بھاگ دوڑ کرتے کرتے چند پوچھلے ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان سب کچھ چھوڑ کر صرف آرام کرنا چاہتا ہے۔“ میں روز تپے میں اپنی یادداشتیں اکٹھی کر رہا تھا جب آفتاب لغاری کی کال آئی۔ یہ بڑا آنکھوں والا پاکستانی بڑا بھانجہ، ایک منت کش تھا جس کے ماں باپ ہجرت کر کے کینیڈا آنے لے گئے تھے۔ امارے قصبے میں یہ برف صاف کرنے والے عملے کا سربراہ تھا۔ شدید برف باری کے دنوں میں یہ رضا کاروں کو بلا لیا کرتا اور کافی مناسب ادا جتنی کروا دیتا تھا۔ میں برف صاف کرنے کا اتنا تجربہ رکھتا ہوں جتنی اس

کی عمر بھی نہ تھی۔ میری پوزمٹی ہڈیاں اب مشقت کی اہل نہیں رہی تھیں ورنہ یہ ذمے داری کسی اور کے سپرد کرنا ناممکن تھی۔ بچن کی بقی جلا کر میں اپنے مکان سے باہر آ گیا۔ یہ ایک قدیمی اور سانحہ روداد مکان تھا جو مالک مکان خاتون کی وفات کے بعد سے میری ہی ذمے داری بن گیا۔ میں یہاں رہتا تو ہوں لیکن دیکھ بھال کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ جن دنوں لغاری مجھے کام پر نہیں بلاتا تب میں اپنے جاننے والوں کو خط لکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے میرے بچے کا سراغ مل جائے۔ کچھ لوگوں کا جواب آ بھی جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کوئی بھی یہ بات بتانے سے قاصر

تھا جب میں اس کے پیچھے گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دین کے اندر کوئی چیز دھکیل رہا تھا۔

”ایٹن! میرے خدا، تم کہاں رہ گئی تھیں؟ میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے ایک بڑی زبردست کہانی ہے۔“

تیسل کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سننے کی کوشش کی۔ وہ کسی لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی پھر میری توجہ فوراً ہی تم کی جانب چلی گئی جو ہمارے کوٹ لے کر آ رہا تھا۔

میں نے تیسل سے کہا۔ ”ہم کل بات کریں گے۔ رات کافی ہو چکی ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ غم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنا نام پسند نہیں لیکن آج تم بہت اچھی سراغ رساں ثابت ہو گئیں۔“

”بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سراغ رساں مگی کا خیال ہے کہ میرے فضول سے بیان کی بنیاد پر ان لوگوں کو پکڑنا ممکن نہیں۔ مجھے صرف وہی یاد رہا جو میں نے دین پر لکھا ہوا دیکھا جو کہ کافی ہے۔“

”تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ ویسے بھی اس وقت تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ چور ہیں۔“

تب مجھے یاد آیا کہ اس وقت میں نے تیسل کو بھیجنے کے لیے اس لڑکے کی تصویر اتاری تھی لیکن بعد میں متاوی۔ ”تم شیک کہہ رہے ہو۔“ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں بھی یہ ہمت نہ کرتی کہ اس کی تصویر لینے کی کوشش کروں۔

”کیا؟“

میں نے اسے اس تصویر کے بارے میں بتا دیا جو میں نے تیسل کو بھیجنے کے لیے اتاری تھی۔ ”لیکن میں نے اسے ڈیلیٹ کر دیا کیونکہ وہ خراب ہو گئی تھی۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی ناک کو دبا دیا اور بولی۔ ”دفع کرو۔“

”نہیں۔ صبر کرو۔“ وہ بولا۔ ”تم مجھے اپنا فون دو۔“

اس نے کچھ ٹھنڈا شروع کیا اور میں لائق بنی اپنے کوٹ کی زپ سے چھپتی رہی پھر میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی اور وہ بولا۔ ”مل گئی۔“

”کیا؟ کیسے؟“ میں نے پوچھا اور اس سے فون چھیننے کی کوشش کرنے لگی لیکن اب اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”اس میں ان کا پورا فوٹو موجود ہے۔“ اس نے میرا فون اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کوئی غلطی نہ دبا دیا

جس کی وجہ سے وہ تصویریں ضائع ہونے کے بجائے محفوظ ہو گئیں۔ باقی داوے۔۔۔۔۔ تم نے بہت خوف ناک سیلفیاں بنائی ہیں۔“

میں نے شرما کر ایک بار پھر اس سے فون لینا چاہا لیکن تب تک وہ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ چکا تھا جہاں پہلے پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اب وہاں ایک ہی بیڑول کار رہ گئی تھی اور ایک آفیسر اس میں بیٹھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گئی اور بولی۔ ”سب ٹھیک تو ہے؟“

”تم مگی کو فون کرو۔“ غم نے اسے میرا سیل فون دیتے ہوئے کہا۔

”اسے بتا دو کہ ہمارے پاس دین کی تصویر ہے اور شاید اس پر لائسنس پلیٹ کا نمبر بھی ہے۔“

اس کے بعد پولیس کے لیے مجرموں تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ وہ تصویر بھی برآمد کر لی گئی لیکن سراغ رساں مگی اب بھی مجھ سے خوش نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے شکایت کیا۔ ”تمہیں چاہیے تھا کہ پہلے ہی اس تصویر کے بارے میں بتا دیتیں۔“

”میرے نزدیک وہ ایک غیر اہم بات تھی اور ویسے بھی میں اپنے طور پر اس تصویر کو ڈیلیٹ کر چکی تھی اور مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب بھی میرے موبائل میں محفوظ ہے۔“

”دیکھ لو۔ اسی تصویر کی بدولت ہم مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ ایک اچھے گواہ کی یہی خوبی ہے کہ وہ پولیس کو سب کچھ بتا دیتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم بات کیوں نہ ہو۔“

اب میں مگی کو کال بناتی کہ میں نے محض تفریحاً اس لڑکے کی تصویر لینے کی کوشش کی تھی تاکہ تیسل کو بھیج سکوں اور اسے پتا چل جائے کہ میرے ارد گرد پر دھیس پڑے بڑے کھوسٹ ہی نہیں بلکہ اس کیئرنگ والے جیسے خوب صورت لڑکے بھی منڈلاتے رہتے ہیں۔

مگی کے جانے کے بعد غم نے کہا۔ ”تمہاری سراغ رساں کی چکر میں ہم سوئٹ ڈش سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک ریسٹوران ہے۔ وہاں بڑی اچھی چاکلیٹ ملتی ہے۔“

”چلو۔ میرا بھی کافی پیئے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے مجھے میری منزل مل گئی ہے۔



ہے کہ وہ کہاں چلا گیا؟ میں یہ سوچ رہا نہیں رہ سکتا کہ کہیں وہ میری غیر موجودگی میں نہ وہاں لوٹ آئے۔ چنانچہ چکن کی جی جلا کر باہر لکھنا میری مجبوری ہے۔

میرا ہوا ویسے ہی جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی بخ بستہ کر رہی تھی، روٹی کے گالوں کے مانند گرتی برف میری ٹوپی اور شانوں پر جتنے تھی۔ اگر میں ایسے ہی ساکت ٹھہرا ہوتا تو شاید اس برف میں دفن بھی ہو سکتا تھا۔ زندہ دفن ہونے کا احساس ہی کتنا اذیت ناک تھا۔ میرے جسم نے ایک پھریری کی اور میں برف جھاڑتا ہوا شیش کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں موجود پاڑے میں بند بھیریں ایسے میاں نے لگیں جیسے میں ان کو خوراک ڈالنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے ان کا خیال رکھنا چاہیے تھا لیکن اپنے بیٹے کی گمشدگی نے ان کی طرف سے بھی دھیان ہٹا دیا تھا۔ اس کی حفاظت کی یقین دہانی تک میرا ارادہ لڑنا ناممکن تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو سختی سے منع بھی کیا تھا کہ بھیروں کے پاس نہ جائے، یہ صرف اس لیے مہیاتی ہیں کیونکہ میں بھی ان کو ذبح نہیں کرتا۔ تو میری پالتو ہیں۔ میں ان کی جان کیسے لے سکتا ہوں؟ یہ تو میری آمد پر ٹوٹی سے آوازیں نکالتی ہیں۔ لیکن اس نے میری بات نہ مانی اور ان کو دیکھنے کے لیے بچھ گیا اور پھر اس واقعے کے بعد ہی وہ گھبرا کر ہوا گیا تھا۔

میں نے اپنی برف صاف کرنے والی گاڑی کی ونڈ اسکرین سے برف کی تہ ہٹائی اور بیٹھ گیا۔ لیڈروالی سیٹ سخت سرد ہو چکی تھی لیکن مجھے ایسے ہی پسند تھی۔ اس کی ہمواری کو صاف کرنے میں بھی بہت زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ ایک بڑے سائز کا ریج میرے پہلو میں رکھا تھا، چہاں وہ ہر وقت میری دسترس میں رہتا تھا۔ اس کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد میں نے گاڑی چلا دی۔ خود کار نظام کے تحت نمک پھینکنے کے بعد جب برف تراش کو نیچے کیا تو وہ تیزی سے سڑک پر پھیل کر برف کو کاٹنے لگا۔

پہاڑی والی سڑک پر پہنچ کر برف کو جب کاٹا تو دو اطراف میں جیسے ایک دیواری بن گئی۔ کسی بھی گاڑی نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب قطار در قطار ایک جانب موج انتظار رہے۔ عموماً ان کو وقت روائی کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ وہ نمک کی کاٹ کے اثر پذیر ہونے سے قبل ہی برف صاف کرنے والی گاڑی کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور حادثے کا موجب بنتے ہیں۔ ان کی اس بے وقوفی کا نقصان دیگر لوگوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن الزام ہمیشہ موسم کو دیا جاتا ہے۔ یہ احمق لوگ بھی اپنی غلطیوں سے نہیں سمجھتے۔

مجھے لگتا ہے کہ میں اب اس کام کے لیے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اب آرام کروں اور اپنی بھیروں کو ایک ایک کر کے مرنا ہوا دیکھوں۔ جب آخری والی بھی مرنے کے قریب ہو جائے تو میں اُسے اُس کی زندگی کی بہترین خوراک مہیا کروں اور پاڑے کا دروازہ کھول دوں۔ مستقبل قریب میں میرے ان خوابوں کی تعبیر مشکل ہی نظر آتی ہے۔ روت 60 پر ہمہ وقت برف باری کے بعد امیر جی کی صورت حال طاری ہو جاتی ہے اور جس خوبی سے میں اپنا کام سرانجام دیتا ہوں، وہ کسی اور رضا کار کے بس کا نہیں ہے۔ لغاری جب بھی میرا کام دیکھتا ہے تو اس کی ہز آکھیں چمکنے لگتی ہیں۔

”کیا شاندار طریقے سے صفائی کی ہے۔“ وہ تعریف میں کبھی بھلے سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس کا یوں کھل کے سراہتا ہمیشہ میری روح تک کو سرشار کر دیتا تھا۔

جب بھی ہمارے ٹرک ایک دوسرے کو راستے میں ملتے ہیں تو بارن بجا کر ایک دوسرے کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ اکثر اوپر کی جانب سے آ رہا ہوتا تھا اور چوک پر ہی ہم ایک دوسرے کو ہاتھ ہلا دیتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری بیشتر ملاقاتیں برف کھودنے کے دوران ہی ہوتی تھیں۔ حقیقت میں مل جینے کا ہم دونوں کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔

کبھی کبھی پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے جب مجھے برف کے طوفان کی آمد کا خطرہ محسوس ہوتا تو میں لغاری کو فون کر دیتا۔ ہم آپس میں بہت بے تکلف نہیں تھے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی کئی ہے یا غیر ملکی؟ اور نہ ہی یہ کہ اس کے کتنے بچے تھے؟

ہاک اسٹریٹ پار کرتے ہی ایک احمقوں کا ٹولا اپنی اپنی گاڑیوں میں میرا تعاقب کرنے لگا لیکن خدا کا شکر کہ جلد ہی میں اکیلا ہو گیا اور تو جے برف سیننے کا کام کرنے لگا۔ چنی کارز تک پہنچتے پہنچتے میں بالکل تنہا تھا۔ میری برف صاف کرنے والی گاڑی کی زبردستی۔ سفید برف پر انوکھا ملاپ کر رہی تھی۔ میں مسکرا اٹھا۔ رنگوں کے اس دلچسپ کھیل سے میں شاید کچھ لمحے مزید لطف اندوز ہوتا لیکن محسن میرے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی اور میں گھر جانے کا منتہی تھا۔ میری بھیریں اس کی تھیں اور میں ان کو اگر کھانا نہ دیتا تو۔۔۔ شاید وہ ایک دوسرے کو کھا جاتیں۔

”ایسا تو ممکن ہی نہیں۔“ میں نے ذہن میں ابھرنے والے خیال کی تردید کی اور موڑ کاٹا۔

وہاں لفٹ لینے کے لیے ایک نوجوان منتظر کھڑا تھا۔ صاف تھرے چلیے میں وہ کسی ٹھنری ہوئی لاش کے مانند لگ رہا تھا۔ میں نے رک کر اسے اپنے ساتھ آنے کی اجازت دے دی۔

”شش۔۔۔ شکر یہ جناب۔۔۔“ سردی سے اس پر کپکپاہٹ طاری تھی۔

”کہاں تک جانا ہے تمہیں؟“ میں نے اس کی لہر گزاری پر کوئی تبصرہ کیے بغیر پوچھا۔

”چارلسٹن۔۔۔“

”تھر والوں کے پاس؟“

”ہاں جی۔۔۔ جناب۔۔۔“

”مجھے صرف گاڑی کے پل تک جانا ہے۔۔۔ پھر میں وہاں کے لیے مڑ جاؤں گا۔“ میں نے اپنا راستہ بتایا۔

”شک ہے۔۔۔ میں وہاں سے کسی اور سے مدد مانگ لوں گا۔“ وہ مسکرایا۔ وہ یقیناً ایک خوش مزاج اور نفیس لڑکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بے وقوفوں کی ایک اور ٹولی نے سڑک صاف ہونے سے قبل ہی اپنی کاریں میرے پیچھے لگا دیں۔ مجھے گیزر میں گاڑی چلاتے ہوئے میں نے اپنے

اپنی توجہ کو سڑک پر رکھی۔ اب پیچھے والوں میں سے کوئی ہل کے کر جاتا تو میری بلا سے۔۔۔ میں نے سب کا ٹھیکا ٹوٹیں لے رکھا تھا کہ انہیں سڑک صاف کرنے کے بعد گیزر بھی کھسکاؤں۔

”اے سخت موسم میں باہر لکھنا کوئی عقند کی کام نہیں ہے۔“ میں نے مناسب الفاظ میں اظہار خیال کیا۔

”بالکل بھی نہیں ہے۔۔۔“ وہ میری تائید کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن کسی کو اپنے گھر جانا ہو تو یہ سفر ایک مجبوری بن جاتی ہے۔“

”تو تم نے بس کیوں نہیں پکڑ لی؟“ میں نے پوچھا۔

”اووو۔۔۔ بسیں بڑی بدبودار ہوتی ہیں۔۔۔ ٹنگ و

”اچھا آدمی لگتا ہے۔“ میں نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”وہ تو واقعی بہت اچھا ہے۔۔۔ اس کا قبے سے باہر ایک بہت بڑا قدام ہے۔ وہاں اس نے گھونڈوں کا اسٹبل بھی بنا رکھا ہے۔ تم نے یقیناً اتنے شاندار گھوڑے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اگلے سال واپسی پر وہ مجھے ان کی دیکھ بھال کا کام بھی سکھائے گا۔“ لڑکے نے تفصیل بیان کی۔

”میرا بھی چھوٹا سا ایک پاڑا ہے لیکن میں صرف بھیریں پالتا ہوں۔“ میں نے اپنے شوق کا بتایا۔

”بھیریں بھی بڑی منافع بخش ہوتی ہیں۔“

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”مجھے ان سے کوئی منافع نہیں ملتا۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی بھیر کو مرتے ہوئے دیکھا ہے؟“ اپنی لگہ واپس سڑک پڑا لے ہوئے میں نے پوچھا۔

”ظاہری بات ہے۔۔۔“ وہ بولا۔

”بھیریں بڑی مشکل سے مرتی ہیں۔۔۔ میں نے جنگ میں انسانوں کو اس سے زیادہ آسانی سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”کبھی تو جنہیں دی اس بات پر۔۔۔ ہم تو سیدھا سر میں فائر کرتے ہیں اور کام تمام۔ ہاں تھوڑی دیر تڑپتی ضرور ہیں لیکن اتنا وقت تو پھر بھی نہیں لگتا۔“ وہ اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے بولا۔

”شاید۔۔۔“ میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا لیکن فوراً ہی بات بڑھائی۔ ”لیکن میں انہیں مارتا نہیں ہوں۔“

”مارتے نہیں ہو تو کیا کرتے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔۔۔ میری بھیریں بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ کسی بھی کام کے لیے مناسب نہیں رہی ہیں۔ میں بس اب ان کو ایک ایک کر کے مرنا ہوا دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کمالی تو بس سردیوں میں برف صاف کر کے ہی ہوجاتی ہے۔ ویسے بھی میری ضروریات بہت کم ہیں۔“

”بچے نہیں ہیں جناب کے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری بیوی کے انتقال کے بعد میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا۔ وہ شہری زندگی کا عادی تھا۔۔۔ یہاں اس قبے میں میرے ساتھ جو میں گھنے وقت گزارنے کا کھل نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ ویسے بھی اب تو اس بات کو عرصہ بیت گیا۔“ میں نے تاسف سے کہا۔

لڑکا میری بات سن کر خاموش ہو گیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی کیونکہ آگے برف زیادہ ہو گئی تھی۔ نمک اور برف



تراش بلینڈ کو کام کرنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔ عقیب آئینے میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔  
 ”آپ کا بیٹا اب کیا کرتا ہے؟“ لڑکے نے اچانک سے سوال کیا۔ وہ شاید بھول رہا تھا کہ میرا بیٹا واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ یا پھر وہ شاید صرف گفتگو کو آگے بڑھانا چاہتا تھا اس لیے بات کر رہا تھا۔  
 ”وہ نگری کا کام سیکھ رہا تھا۔ جب وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔“  
 ”اس میں تو اچھی کمائی ہو جاتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر سر کو ہلاتے ہوئے بات کو بڑھایا۔  
 ”میں نہیں جانتا۔ اس وقت تو وہ صرف بڑے بڑے تختے ڈھونڈنے کا کام ہی کرتا تھا۔“  
 ”یہ تو بڑا ہی مشکل کام ہے۔“ وہ سٹی بھاتے ہوئے بولا۔  
 ”مجھے صرف دو ہفتے کے لیے کرنا پڑا تھا اور پورا مہینا میرے کندھے تکلیف سے ڈکتے رہے تھے۔“  
 ”یقیناً یہ سخت جان لوگوں کا کام ہے۔“ میں نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اگر وہ تختے ڈھونڈنے والا مشکل کام کر سکتا تھا تو یقیناً مضبوط جسم کا حامل تھا۔  
 ”لغاری کی برف صاف کرنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر میں چونک گیا۔ اپنی گاڑی کو میں پہلے گزیر میں لے آیا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔“  
 ”تھک جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم میرے پاس کو نظر آ گئے تو تمہیں لفٹ دینے کی پاداش میں مجھے کام سے نکال دیا جائے گا۔“  
 ”لڑکا حکم کی تعمیل کرنا جانتا تھا۔ فوراً ہی سیٹ کے نیچے کی طرف دیک گیا۔ آفتاب لغاری کی گاڑی کی روشنی براہ راست مجھ پر پڑ رہی تھی۔ پہلو میں پڑے رینچ پر بھی یہ روشنی منعکس ہونے لگی تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے پھر بھی ہاتھ ایسے ہلایا جیسے وہ مجھے نظر آ رہا ہو۔ پاس سے گزرتے ہوئے ہم دونوں نے ہارن بجایا اور ایک دوسرے کو مخصوص انداز میں سلام کیا۔  
 میں اب قہقہے کے مرکز کی طرف جا رہا تھا، اس کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا۔ میں اپنا کام نہایت صفائی سے کرنا چاہتا تھا لیکن لغاری کا پچھلا کرتی گاڑیوں نے جب میری جانب رخ کیا تو مجھے اپنے اعصاب میں کشیدگی سی محسوس ہوئی۔ میں کسی ایکٹیوٹ کا موجد نہیں بننا چاہتا تھا۔ لڑکا اب سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا اور جب اس نے بولنا شروع کیا تو میری بے چینی سوا ہو گئی۔

”اس علاقے سے گزرتے ہوئے میں کافی خوفزدہ تھا۔“ وہ بولا۔  
 ”اچھا۔“ میں نے ایک لفظی جواب پر استغنا کیا کیونکہ کسی گاڑی سے نگر جان لیوا ہو سکتی تھی۔  
 ”یہاں میرے جیسے لفٹ مانگنے والے اکثر ہلاک ہو جاتے ہیں۔“ وہ سنسنی خیز انداز میں بولا۔  
 ایک شخص ہارن بجاتا ہوا مجھے کراس کر گیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اتنی کم چوڑی سڑک پر کھائی میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے سڑک پر غور کیا تو آفتاب لغاری کافی سارا کام میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے حصے کی صفائی بھی مجھے ہی کرنا تھی۔  
 ”ایک سپاہی کی تو صرف ہڈیاں ہی ملیں۔ بہت نازک صورت حال تھی۔“ لڑکے نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔  
 صرف ایک کارروہی تھی اور جب بالکل کنارے سے ہو کر وہ بھی گزر گئی تو میں نے اپنے کندھوں اور سر کو آرام دیا۔ میرا جسم لرز رہا تھا اور پسینا آ رہا تھا۔  
 ”اس سپاہی کے بارے میں کوئی معلومات ہیں کیا تمہارے پاس؟“ اس نے رساں سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ میں نے کچھ نہیں جانتا اس بارے میں۔  
 ”اس کا بیگ“ جلسی عاشقین“ والی کھائی سے ملا تھا۔  
 تمام سامان کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی اس میں ہی بندھ گئیں۔  
 وہ ایک جھرمجری لیتے ہوئے بولا۔  
 ”ہاں یاد آیا۔ بہت برا ہوا تھا وہ تو۔“ میں نے برف زار میں بھری برف پر رنگ و روشنی کا مسکور کن شیل دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ایک اور بندے کی لاش بھی اسی علاقے میں ملی تھی۔ وہ شاید اکلوتا تھا جس کے بدن پر کوئی گوشت باقی تھا۔ ورنہ اکثر تو ڈھانچے ہی ملتے تھے ادھر لوگوں کے۔“  
 ”اب تو کئی سال بیت گئے۔“ تفتیش کاروں کو ایسا کچھ نہیں ملا۔“ میں نے جوابی روکتے ہوئے کہا۔  
 سرد موسم اور برفباری مجھے ویت نام کی سردراتوں کی یاد دلا دیتی تھی جب سردی سے بچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہوتا تھا۔  
 ”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ ”شاید وہ جنونی قاتل خود بھی مر چکا ہو۔“  
 ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔  
 پہاڑیوں کا کناؤ کم ہو چکا تھا۔ ہم گاؤں کے قریب تھے

چلے تھے۔ لڑکے نے ایک سگریٹ سلکا لیا تھا اور کھڑکی کا شیشہ کرا کر دو سوئیں اور برف سے بیک وقت محو تھے لے رہا تھا۔  
 ”انہیں سو بہتر کی بات ہے جب میں تمہاری طرح تھیں ایک سال کا جوان تھا۔ چھاتا برداروں کے ساتھ میں بھی ویت نام کے اس حصے میں اترا تھا جہاں پر بے تحاشا دشمن موجود تھے۔“ میں نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔ ”ہماری پلٹن نے ایک فارم ہاؤس پر ایک بھی گولی چلائے بغیر قابو پا لیا تھا حالانکہ وہاں پر دشمن انتہائی خوفناک تجربے کر رہا تھا اور مخالفت کا بھی خاطر خواہ بندوبست تھا۔“  
 ”واہ۔“ وہ متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا خجروں کے دار کے تھے۔“  
 ”غرویں تو زدی تھیں ان کی۔“ میں نے فخریہ لہجے میں بتایا۔  
 ”لڑکا ایک لمحے کے لیے یوں کمرنگ رہ گیا۔ لوگ کتنی آسانی سے مر جاتے ہیں۔ اس کو اندازہ ہی نہیں تھا۔  
 گاؤں کی گلی کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں پر برف کی صفائی والا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس علاقے کی نفری زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی مستعد بھی تھی۔ میں نے ایک سال کا زدی مار کر دی میرے پیچھے آنے والی گاڑیوں کی لاشیں آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔  
 ”لڑکے! کیا تم میری فلیش لائٹ نکال کر دے سکتے ہو؟“ وہ تمہاری سیٹ کے نیچے ہو گئی۔“ میں نے رینچ کے آگے پر ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔  
 وہ تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے کی جانب گوراہٹ کیا۔  
 ”تم بالکل میرے پیچھے ہو۔“ وہ بھی ایسے ہی مجھے کام بتاتے ہیں۔ ای! کھانا لے آؤ۔ ای! میری گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟“ وہ میرے ہاتھ میں موجود قاتل ہتھیار سے بے نیاز پٹر پٹر بول رہا تھا۔  
 میرے ہاتھ پر جیسے قاتل کر گیا تھا۔ اس کا نام سن کر میں ٹھہر گیا تھا۔ احساسات کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ میں چند لمحوں کے لیے تو ساکت رہ گیا۔  
 ”ادھر تو نہیں مل رہی۔“ میری کیفیت سے انجان وہ اب بھی اس فلیش لائٹ کو ڈھونڈنے میں مگن تھا جو کہ کبھی وہاں سے نہیں گئی۔  
 ”پلاؤ کوئی بات نہیں۔“ میں نے رینچ کو واپس رکھتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 قاتل گھر گزر چکا تھا۔ وہ بے خبر تھا کہ موت اس کے

کتنے پاس سے گزر گئی تھی۔  
 ”نام کیا بتایا تم نے اپنا۔؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اما نوئل۔“ پیارے اسی ملا تے ہیں مجھے۔“ وہ بولا۔  
 میری آنکھیں نمی سے دھندلا گئیں۔ وہ میرے بیٹے کا ہمنام تھا۔ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہا۔  
 ”لفٹ دینے کا بہت بہت شکر ہے۔“ وہ اپنی آنکھوں میں چمک اور یوں پر مسکان لیے اتر گیا۔ میں اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسے ایک اور کار والے سے لفٹ مل گئی۔  
 میں اتنی محسوس کر رہا تھا کہ واپس جانے کا سوچ کر ہی جان جا رہی تھی۔ زندگی کے بیٹے لکھوں کا حساب لگاتے ہیں کب واپسی کے لیے روانہ ہوا اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ جنگ میں مارے جانے والوں کا بھی تو کوئی حساب نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سب کو جان دینا پڑی تھی۔ موت کب دیکھتی ہے کہ کس کی جان لے رہی ہے۔ وہ دوست دشمن میں کوئی تیز تھوڑا ہی کرتی ہے۔ لغاری کی گاڑی کے پاس سے گزرتے مجھے اس کے ہارن کی آواز سنائی دی لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے خیالات کی روانی میں کچھ ٹھیس نہیں ہو سکتا تھا۔  
 میں تو بس مرنے والوں کو گمن رہا تھا جو جنگ میں مارے گئے۔ جو میرے ہاتھوں قتل ہوئے اور میری خونخوار بھیڑوں کی خوراک بن گئے تھے۔  
 میں واپس پہنچا تو بھیڑیں میانے لگیں۔ ان کو جیسے یقین تھا کہ میں ان کے لیے خوراک کا بندوبست کر کے آیا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنا روز ٹاچا اٹھایا اور اس پر لکھنے لگا۔  
 ”برف صاف کرنے والی گاڑی سامنے ٹھہری ہے۔ وہ آج بھی اتنی صاف ستھری ہے جتنی پہلی بار لانے پر تھی۔ برف پوش پہاڑوں پر موجود درختوں پر بھی برف جمنے لگی ہے۔ صاف ہو جانے والی سڑک پر کاریں بڑی رفتار سے رواں دواں ہیں۔ بچن کی حق اب بھی روشن ہے لیکن گھر خالی ہو چکا ہے۔ بالکل میرے دل کی طرح جہاں کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ آج اپنے بیٹے سے بھی میں مل گیا۔ چاہے وہ کسی اور کے بیٹے کی صورت میں مجھے ملا تھا۔ میری بھیڑیں بجھ چکی ہیں۔ ان کو خوراک کی ضرورت ہے جو صرف میں ہی ان کو مہیا کر سکتا ہوں اور میں اب ان کے ہاؤس کے جانب جا رہا ہوں۔ زندگی تو برباد ہو چکی۔ اب کم از کم موت تو رانگاں نہ جائے۔“





PakiBooks.Site



دسواں حصہ

## رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب احراج اور تاریخی جنوں خیز یوں کے بہرے  
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان



## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہ شالیہ کے گئے جنگوں اور سنگاں پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قلعہ محصور ہے۔ اس قلعے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جتو اسے لندن سے یہاں تک بھیج لاتی ہے۔ اس قلعے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً جنت پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اڈا باش جیتجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیامی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، اویس عمر خاں ساں میاں بیوی مندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا جیلا کرل نو جوان شوکت حسین بھی اس قلعے میں شامل ہے۔ یہ جزل مائیکل شا کے ساتھی کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمبڑی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عداوت ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ رو کر رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار رستہ کی کھوج لگاتا ہے۔ کوہ شالیہ کی تین خوبصورت ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو بیوتا ڈکرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانناز گوریوں کا گروپ اپنی جانیں جو قسم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوج آزادی کے سپہ سالار جزل میر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی مہار کا جانا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرسٹل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذات خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ کاروانہ مجاہد کہلاتا ہے۔ باقی دوسرا شریں اور قیصر شاہ تھے۔ ایٹ اینڈ ایکٹیو کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا رد بار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شہ قہار کے منتشر مسلم باغی گروہ کوہ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بناتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو کھینچ کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا "سلسلہ تسلط" کوہ شالیہ کی ان تینوں قابل ذکر ریاستوں تک دراز کرنا تھا۔ لہذا مکاری اور دھوکے بازی کا میل کھیلنے والے فرنگی حکومت پہلے ریاست تاکرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بظاہر دوستی کا ہتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشرک طور پر باقی دور ریاستوں پر تپان اور پان پر کے خلاف مسلحی سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ مسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پان پور میں مہاراجا مہندر سنگھ لکھنوی دشمن ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی جوبائی اپنے بیٹے ایٹش کار کو وادی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ مہارانی جوبائی کی ایک جوان سال خوبصورت بیٹی سوچنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایٹش کمار کا کار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گھ جوں کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کر دیتا ہے۔ مہارانی جوبائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر لہوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا کی لپٹا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی حقیقتات کرواتا ہے۔ شک جوبائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب کمار جوبائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں جانتے پراور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اصرار یہ کہ ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے ممبروں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، مندو بابا اور شانتا محل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار رستہ کے عجیب و غریب لوگ لگتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بیٹی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا بھڑ ایک لڑکی بانی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھا جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ بھڑ ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اور بیوی کو دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ اور بھڑ رام ماریا کے باپ کرل اینڈ رسن کو بھڑ دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے

مہا ب میں منہ کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بھڑ رام کرل کو حتی جبر دیتا ہے کہ ماریا کے خیاں میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ کوہ شالیہ پر انگریزوں نے چڑھائی کرنے کی حتی منگوری دے دی تھی۔ اریہ اور شاہ زمان بھی مہم پر روانہ ہو گئے۔ اور کالی مندر کے بدری ناتھ نے اپنے چیلوں کو حکم دیا کہ وہ اس گوری حیدر رینا کو اغوا کر لیں۔ دو پجاری رینا کے خیمے میں گھس گئے۔ اسے بے ہوش کیا اور کاندھے پر لا کر جمو پٹوسے سے باہر نکل گئے۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رینا بھڑ فرس پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ قریب وہی وہاں پجاری خاموش کھڑے تھے جو اسے جمو پٹوسے سے بے ہوش کر کے اٹھالائے تھے۔ ان کے قریب مہا پجاری بدری ناتھ بھی کھڑا تھا۔ اس کی کالے تیل جھکی اٹلی ہوئی آنکھوں میں وحشت اور گرسنہ چمک ہویدا ہو رہی تھی۔ وہ رینا کو چند تاپنے اسی طرح گھورتا رہا پھر اسی ہوساکی سے دھیرے سے بڑبڑایا۔

”کاش! اس فرنگی حیدر کی بیٹی کالی دیوی کے چرنوں میں نہیں چڑھانا ہوتی تو میں اس کے سرخ و سپید اور سنگ مرمر سے نکارے بدن کے اوش (خرد) مزے اڑاتا، خیر.....“

”گرو جی! تو پھر یہ کنیا حاضر ہے، چننا کیوں کرتے ہو؟“ کوئی کی تو پھر اسی سے اس وادی میں ان خوب صورت لڑکیوں (انگریز کنیاؤں) کی۔ قریب کھڑے ایک سیوک دار نے خردہ مگر اہٹ سے کہا تو بدری ناتھ اس کی طرف ”بی بی! نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اومرہ.....! کچھ بھول کر بھی ایسا مت سوچنا۔ ہمارے مطلب یہ کنیا ایک ہی ہوتی ہے اور وہ یہی ہے، بڑی مشکل سے ڈھونڈنا پڑتا ہے ان کو..... جو نواری بھی ہو اور ملید پڑی والی دیکھ لی گئی۔ جاؤ اسے خانے میں لے جا کر ال دوار خبردار! کوئی اس کنیا سے کھلوڑ کا خیال تک بھی

انہں میں نہ لائے۔“ پاس کھڑے دونوں چیلوں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یوں بے ہوش رینا کو اس کے سیوک کار پجاریوں نے نہ لانے میں لے جا کر ڈال دیا۔

پہرہ رات کسی بھاری سہل کی طرح سرک رہی تھی۔ تہ لانے میں سہل کے تیل کے جلنے چراغ بھی مدھم پڑنے لگے تھے، اسی وجہ سے وہاں کا گھٹا گھٹا ماحول مزید وحشت ناک سا دکھائی دیتا تھا۔

خانے میں حسب سابق موجود کچھ اور قیدی لڑکیاں، ڈش پر گہری نیند میں ادھر ادھر پڑی بے سدھ سو رہی ہیں۔ رات کا آخری پہرہ تھا۔ رینا بھی بے ہوشی کے زیر اثر تھی۔ اسے ابھی تک نہیں معلوم تھا کہ وہ آزادی ترنجی پڑی تھی۔ اسے ابھی تک نہیں معلوم تھا کہ وہ

کون سے جہنم کدے میں پہنچادی گئی تھی۔ تھوڑی دیر اور بیت گئی تو شاید قدرتی طور پر عالم خواب میں ہی دل میں اٹھنے والے ہول کے سبب اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی پچھلی پچھلی آنکھوں میں خوف و وحشت عود کر آئی تھی۔ وہ بار بار یوں اپنا سر جھٹکتی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی، مگر کھڑے ہونے کی اس میں سکت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ایک ذرا کوشش میں اس کا سر اس بری طرح گھوما کہ اس نے پھر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کی۔

اب وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے ارد گرد بے ترتیب سوئی پڑی لڑکیوں کو دیکھنے جاری تھی۔ اس کی کشادہ، دلکش اور پچھلی ہوئی نیلی آنکھیں عالم خواب میں بھی اس کے حسن کا عجیب احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ رینا فطرتاً باہمت اور بہادر لڑکی تھی۔ لیکن اس اچانک صورت حال پر قدرتی طور پر وہ بھی خوف زدہ سی ہوئی تھی مگر فوراً ہی اس نے ذرا خوف کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پہلے اس بات پر غور کرنے لگی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

تب ہی اس کے خوابیدہ ذہن سے دھند چھنے لگی تو وہ سوچنے لگنے کے قابل ہوئی۔ یوں اسے اور اک ہونے لگا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور یہ کن لوگوں کی شرارت ہو سکتی تھی؟ پہلا غدشہ جو بالکل غیر مبہم تھا، وہ اغوا کا تھا۔ اسے سوتے میں کسی بے ہوشی کی دوا سونگھا کر بالکل بے سدھ کر دیا گیا تھا۔ دوسرا خیال اگرچہ بہیم پر کسی گروہ سوچ سکتی تھی کہ اسے یوں اغوا کرنے والے کون ہو سکتے تھے۔

”کالی دیوی کے پجاری، بدری ناتھ، پرس رام.....“ یہ نام ایک تواتر کے ساتھ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے کیونکہ اس علاقے میں ان کے سوا اور کون اس کا دشمن تھا۔ اس کے دل میں ایک بار پھر جانے انجانے خوف کی لہر ابھری۔

وہ ایک بار پھر اپنے گرد ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس پر یہ بصیانت کا انکشاف ہوا کہ وہ کسی عمارت کے تہ خانے میں ہے اور جڑ لڑکیاں اسے یہاں ادھر ادھر بے ترتیب انداز



میں سوئی پڑی نظر آ رہی تھیں، ان کی حیثیت قیدیوں سے بڑھ کر تھی۔

رینا ایک بار پھر متوحش سی ہونے لگی۔ اس نے دو تین بار اپنے سر کو جھکا بوجھ کچھ کم محسوس ہونے لگا تو اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑے ہونے کی ہمت کی۔

تھوڑا سا چکرایا، قدم لڑکھائے، وہ سنبھلی اور اپنی جگہ قائم رہی۔ پھر اس نے ایک قدم بڑھایا۔ اس کا رخ اس سنگی زینے کی طرف تھا جو اوپر ایک چکر گھوم کر تارکی میں غائب ہو رہا تھا۔ وہ وہاں تک چلی گئی اور سنگی رینگ نما دیوار کا سہارا لیے قدم بچے طے کرنے لگی۔

زینہ مختصر ثابت ہوا، ایک ہی چکر گھوم کر اسے دروازے کے آگے نظر آ گئے جو بند تھا۔ وہ واپس لوٹ آئی۔

الم نصیب بالی جی نیند سونے کی عادی تھی۔ کسی آہٹ پر وہ ایک دم جگی جی نیند سے بیدار ہو گئی اور پھر رینا پر اس کی نگاہ پڑی۔ وہ چونک گئی۔ رینا سانس کے رخ پر تھی۔

”مم..... ماریا!.....“ بے اختیار بالی کے سونے کے لیے سے کپکپاتی آواز برآمد ہوئی۔ رینا چونکہ ایک انگریز لڑکی تھی اسی لیے بالی اسے ماریا سمجھی۔ پہلے تو وہ خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں یہ ماریا کی روح تو نہیں۔

اس کے پکارنے پر رینا نے اس کی جانب گردن موڑ کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہو گئیں۔ بالی نے دیکھا یہ ماریا نہیں تھی اور ہونجی کیسے کتنی تھی بھلا.....؟ وہ تو ظلم کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ تو کیا یہ کسی اور فرمن دوشیزہ کو بھی اپنے بھیا تک مقصد کے لیے اٹھالائے تھے؟

اس کے آواز دینے پر رینا فوراً اس کی جانب لپکی۔ وہ ”ماریا“ کے نام پر چونکی تھی، کیونکہ یہ نام اسے کرچین لگا تھا۔ ”میں ماریا نہیں رینا ہوں..... تم کون ہو؟“ رینا نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ بالی اب پرسکون سی ہو گئی تھی لیکن جواب دینے کے بجائے غور سے رینا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رینا کو یہ لڑکی بہت ہی مڑھال اور دکھی نظر آتی تھی۔

بالی جو اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی اب دوبارہ فرش پر بیٹھ گئی۔ یوں رینا نے بھی اس کے پاس ہی جگہ سنبھالی۔ بالی اب تھکانے کی چٹنی چٹنی چھت کو دیکھنے لگی۔

”سسٹر..... امیری بات کا جواب نہیں دو گی؟“ رینا نے اسے بار لکھے میں نرمی اور اتھاہمت سے پوچھا۔ ”مجھے کن لوگوں نے انور کیا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے؟ شش..... شاید تم لوگ بھی قیدی ہو۔“

جیسا کرنے والے ہیں۔“ بالی کے کپکپاتے سونے کے لیے یہ الفاظ برآمد ہوئے تو رینا کے چہرے پر پھر خوف کی لہر ابھری پوچھا۔

”ماریا یوں تمہی اور ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا تھا؟“

”بہت گھٹاؤ نا ظلم کیا تھا اسے چاری انگریز لڑکی کے ساتھ.....“ بالی نے جیسے خالی خالی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جماتے ہوئے کہا پھر ایک دم اپنی ایک تک نگاہ رینا کے چہرے پر جمادی، بولی۔

”تم..... تم بھی انگریز ہو نا.....؟“

”ہاں.....“ رینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کنواری ہو.....؟“ بالی نے پوچھا تو رینا کو اس کا یہ سوال عجیب لگا۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی ابھری اور اس نے بہت دھیرے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر پوچھا۔

”تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“

جواب میں بالی کے پشمرہ چہرے کا پچھلایاں مزید گہرا ہو گیا۔ اسی لکچے میں بولی۔

”اس لیے کہ تمہاری یہ خوبی معترب تمہارے لیے عذاب بننے والی ہے۔“

”تم مجھے کیوں خوف زدہ کر رہی ہو آخر.....؟“ رینا جھلائی گئی۔ ”آخر صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتی ہو کہ.....“

”سنو.....“ بالی نے اس کی بات کاٹ کر جیسے میکانیکی انداز میں کہا اور پھر ہولے ہولے اسے سب بتا دیا۔ رینا جتنی حوصلہ مند اور بہادر رہی لیکن ماریا کے انجام اور یہاں کی حقیقت کا سنتے ہی ہول سی گئی۔ خوف جیسے ایک آہنی سائے کی طرح اس کے خوبصورت چہرے پر چسپاں ہو کر رہ گیا۔

کئی تانے کے لیے تو وہ گنگ سی ہو کر رہ گئی۔ تاہم اس کا ایک اندازہ تو بالکل درست لگا تھا کہ وہ کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری تاجھ کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور اس وقت مندر ہی کے ایک قید خانے میں موجود ہے۔ بالی کی زبانی رینا یہ ساری رام کھانسنے کے بعد پورے جی جان سے ہولا کر رہ گئی۔

”یہ ظلم کی انتہا ہے۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ”ایک جیتے جاگتے انسان کو اس قدر سفاکی سے ہلاک کر دینا جیسے کوئی جانور ذبح کیا جاتا ہو۔ کیا تم لوگ اس قدر انجان ہو ان پجاریوں کے گھٹاؤنے ظلم سے.....؟ مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔“

رنگ آسمان

قص کرتی ہیں۔“

”انگراں پجاریوں کے پاس اتنی خوب صورت دایاں اور موجود ہیں تو پھر یہ لوگ یہاں اس تھکانے سے کیوں ہر روز غورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں؟“ رینا نے پوچھا۔

”یہ شیطان کے پجاری ہیں اور ہوس کے بھی..... انہیں وہ لڑکیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں جو ان کے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں، رحم کی ہیمک ہانتی ہیں اور رو کر التجا بھی کرتی ہیں۔“ بالی نے بتایا۔ رینا کچھ سوچتے ہوئے نفرت آمیز لکچے میں جیسے خود کلامیہ بڑبڑائی۔

”تم شاید ٹھیک کہتی ہو، بالی! شیطان فطرت آدمی کی مکروہ شخصیت کا ایک یہ پہلو بھی ہے حد کر بہر انگیز ہے کہ وہ دکھی اور مجبور انسانوں کی بے بسی اور لاچارگی سے حظ اٹھاتا ہے۔ جانے اس طرح وہ اپنے کون سے ناپاک جذبے کی تسکین چاہتا ہے۔“

اسی وقت چمکی کی نگاہ ان دونوں پر پڑی اور وہ تھکانے میں ایک خوب صورت سی سہرے بالوں اور گوری چڑی والی انگریز دوشیزہ کو دیکھ کر پہلے تو حیرت رہ گئی، پھر اس کے سانولے چہرے پر معنی خیز اور مگرا نہی مسکراہٹ ابھری، وہ اپنی جگہ سے کھکی اور ان کے قریب آ گئی۔ بالی اس کی طرف بڑی شاکہ نگاہوں سے دیکھتی رہی، جبکہ رینا کی نگاہیں بھی چمکی پر جمی ہوئی تھیں۔

چمکی، رینا کے قریب آ گئی اور اس کی طرف عجیب سی مسکراتی نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے ایک ہاتھ سے رینا کی سنہری زلفوں سے کھینچتی رہی، پھر ہاتھ کی ایک انگلی اس کے مرمریں گال پر رکھی اور جیسے اس کی نرم اور پر لطیف ملائمت کو چھوئی ہوئی گردن تک لے گئی، پھر اس کے برہنہ سنگ مرمر جیسے بازو تک پھیرتی ہوئی اس کے دلنشین لبوں تک لے آئی، تب ہی اسے ایک پھیر کو کیا ہوا کہ اس نے آگے بڑھ کر رینا کے نرم و گداز اور گلابی لبوں پر اپنے سانولے ہونٹوں سے بوسہ لینا چاہا کہ رینا نے اسے ایک ہاتھ سے پرے دھکیلا۔

چمکی پر عجیب کیفیت طاری تھی، وہ پھر لپکی لیکن اس بار بالی نے اسے بری طرح سے دیوبج لیا اور دانت چسپ کر غصے سے بولی۔

”یہ کیا ہے ہودہ حرکت کر رہی ہے تو بھی..... ہوش میں تو ہے تو.....؟“

چمکی کو بالی پر غصہ آ گیا اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”ہاں! ہم انجان ہیں، کیونکہ ان پجاریوں کو ہم دھارک سمجھتے ہیں۔“ بالی نے لکچے میں کہا۔

”یہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اور اس کے پردے میں جو گھٹاؤ نا کھیل کھیل رہے ہیں، اس سے تو انسانیت بھی لرز مارتی ہے۔ یہ جہالت ہے۔ یہ پجاری بدری تاجھ اور اس کا شیطانی نولا میرا بھی دشمن تھا۔“ بالآخر رینا نے انکشاف کیا تو بالی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں!“ رینا نے آہستہ سے کہا اور اپنی رام کھانسی سنا ڈالی۔ بالی حیران ہو گئی۔ پھر بڑے دکھ سے بولی۔

”ماریا بھی آپ کی طرح بہت بہادر تھی میم صاحب! لیکن بے چاری کی ان شیطانیوں کے آگے نہیں چل سکی۔ یہ بہت خطرناک اور شیطانی طاقت رکھنے والے پجاری ہیں۔“ ”میں نے ان شیطانیوں کا بھانڈا پھوڑنے کا پکا عزم کر رکھا ہے۔“ رینا نے ایک بار پھر عزم سے کہا پھر اسے نونکا۔ ”میرا نام رینا ہے۔ مجھے میم صاحب مت کہنا۔ تمہارا کیا نام ہے؟“

”بالی۔“ ”دیکھو بالی! اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو تم اور تمہاری یہ ساتھی قیدی لڑکیاں میرا ساتھ دیں گی؟“ اس کی بات سن کر بالی اسے حیرت سے دیکھنے لگی، پھر اس نے قریب اور اصرار سے بولی قیدی لڑکیوں کی طرف دیکھا اور آخر میں اس کی نگاہ چمکی پر پڑی۔ بیکار اس کی آنکھوں میں خشک کسمائے ابھرے۔ وہ کسمسا کر جاگ رہی تھی۔ بالی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رینا سے بہت آہستہ سے کہا۔

”اسے اپنے منصوبے کے بارے میں کچھ مت بتانا۔“ ”کیا یہ قیدی نہیں ہے؟“ رینا نے بھی ایک نگاہ چمکی کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ ان پجاریوں کی خبر ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ بالی نے چٹنی آواز میں کہا۔ ”یہ پجاریوں کو اپنی مرضی سے خوش کرتی ہے اور بدلے میں خود بھی خوش رہتی ہے۔“ رینا اس کی بات کا مطلب تو سمجھ گئی تھی تاہم بولی۔

”اس قید خانے میں اور خوش.....؟“

”ہاں! اس کا خیال ہے کہ بہت جلد پجاری اسے دایاں کا روپ دے کر اپر مندر کے اس گھر میں شہرہ جگہ دے دیں گے جہاں اور بھی دایاں آرام اور بخشش سے رہتی ہیں۔ وہ ان پجاریوں کی خدمت گزار کر رہی ہیں، ان کا دل بھانسی میں،



دونوں ان سے چھپتے چھپاتے دہالے تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں تک کہ شاہ زمان نے گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ جزیرے کے ساحل سے دور تھے۔ ساحل پر بتیاں چمکتی نظر آ رہی تھیں، باقی اطراف کے علاقے میں تاریکی تھی۔

ایک ست شاہ زمان کو ایک لیاچر اور دو بیکری بحری جہاز لنگر انداز دکھائی دیا۔ اس میں بھی کہیں کہیں روشنی نظر آتی تھی۔ ایک سرچ لائٹ ساحل سے اور دوسری اس جہاز کے مستول پر نصب کی گئی تھی، جس سے دور دور تک سمندر اور جزیرے تک گردشی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

اس دو قیامت جہاز کو کچھ کر شاہ زمان کے سینے میں جوش کی ایک لہری سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ اس کا "شکار" یہی جہاز تھا۔

یہ وہی "سی ہاک" تھا جسے تباہ کرنے کا مشن اریہ اور شاہ زمان کو سونپا گیا تھا اور جس پر ہندوستان کا قومی اور نادر خزانہ لوٹ کرا فریقا کے راستے انگلستان لے جایا جانے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ دونوں پانی میں اتر چکے تھے۔ اریہ کو تیرا نہیں آتا تھا مگر شاہ زمان پانی کے اندر تھیں تیرنا جانتا تھا۔ اس نے اریہ کو سانس روکنے کی ہدایت کر دی تھی۔

شاہ زمان کے محتاط انداز سے کے مطابق یہاں پانی کم گہرا تھا، کیونکہ یہ ساحل کے قریب کا علاقہ تھا۔ باقی سپاہیوں کی "شفٹنگ" کشتیوں کے ذریعے لالچ اور ساحل سے جاری تھی۔

شاہ زمان، اریہ کو سنبھالے ہوئے تیزی سے پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا اپنے ایک محتاط انداز سے ساحل کی دوسری اور نسبتاً محفوظ جگہ پر جا کے ابھرا۔

راستے میں دو ایک بار اریہ کو سانس لینے کی ضرورت پیش آئی تھی اور شاہ زمان نے تھوڑا سا سطح آب سے ہر ابھار کر اسے آسپین کا ذخیرہ پیچھے چھوڑوں میں بھرنے کا موعن دیا تھا۔

اگر کسی گردشی سرچ لائٹ کے دائرے میں ان کی ذرا ایک جھلک بھی دکھائی دے جاتی تو یہ حد خطرناک ہوتا۔ خدا کا شکر کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس میں شاہ زمان کی ہوشیاری اور محتاط روی کا بھی دخل تھا۔

یہ دونوں جس جگہ سے ساحل پر آئے تھے، یہاں مونگے کی چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں۔ سلیٹن اور کالی توحہ سے زیادہ تھی جس سے سطح کافی پھسلواں ہو چکی تھی یوں یہ علاقہ بھی نیم دلدلی کہلاتا تھا۔ بڑی مشکوں سے رات کی تاریکی میں یہ دونوں سنبھلتے سنبھلتے نہایت ہوشیاری والی جگہ پر پہنچے تھے۔

لالچ نے گودی سے حرکت کی اور کھلے سمندر میں داخل آئے ہی فوراً رفتار بکڑ لی۔

بندرگاہ کی بتیاں دور دوری جا رہی تھیں۔ آسان صاف اور روشن تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا اور سمندر کے افق پر نکلے ہوئے مہاتی چاند کو لہریں چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ سمندر جوار بھانے کی کیفیت میں نظر آتا تھا۔

"ہمیں دھیان رکھنا پڑے گا ایک بات کا اریہ.....!" شاہ زمان نے سرگوشی کی۔

"کون سی بات کا؟"

"لالچ جزیرے کے ساحل سے لگتے ہی ہمیں اترنا پڑے گا کیونکہ اس نے واپس بندرگاہ کی طرف پلٹنا ہے۔ اہمیانہ وہم جہاں سے چلے تھے دوبارہ وہیں پہنچ جائیں اور ساری محنت بھی کا رت چلی جائے۔"

"میرا نہیں خیال کہ اتنی جلدی لالچ واپس کے لیے پلٹ جائے گی۔" اریہ نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "مراد خان نے بتایا تو تھا کہ یہی لالچ جزیرے پر متعین دوسرے سپاہیوں کو واپس لے کر رہی پلٹے گی، لہذا اس میں کچھ وقت تو لگے گا ہی....."

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔" شاہ زمان نے ہولے سے کہا۔ "لیکن ہماری ہاری کوشش یہی ہونی چاہیے۔"

"جلد بازی بھی تو خطرناک ہو سکتی ہے ہمارے لیے۔" اریہ نے خدشہ ظاہر کیا۔ "مت بھولو کہ ہم ایک خطرناک جزیرے میں قدم رکھنے والے ہیں جہاں خاد حیات اور اس کے ساتھیوں کو ان ظالم فرنگیوں نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

"ہوں..... لیکن اس وقت کرنل اینڈرسن تھا، اب بات اور ہے۔"

"پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔ کیا معلوم کیا متعین کردہ لالچ اس سے زیادہ خطرناک ہو۔"

لالچ کا سفر جاری تھا۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد لالچ کی رفتار کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ ٹھہری گئی۔ اب وہ آزاد موجوں کے سہارے بھروسے لپٹی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ دونوں فوراً اپنی لپٹ میں گاہ سے نکلے۔ ان کا رخ دہالے کی طرف تھا۔ وہ

جانتے تھے کہ اس وقت دونوں نہایت خطرے میں تھے۔ کسی کی بھی ان پر نگاہ پڑ جاتی تو انہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جاتا۔

لالچ میں انہیں کچھ شوہ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اطراف میں کچھ سائے بھی متحرک نظر آئے، وہ

فرش پر اترتو اس نے دیکھا، کچھ نے رینا کو بڑے برے طریقے سے زدوکوب کر رکھا ہے۔

بدری ناچھ نے اپنے دونوں تومند چیلوں سے تھکا۔ نہ انداز میں کچھ کہا۔ وہ دونوں بیک وقت حرکت میں آئے اور آگے بڑھ کر رینا کو کچھ کی گرفت سے چھڑایا۔ کچھ اس وقت پھری ہوئی تھی اور پھری سے بال کسی چڑیل کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

وہ دونوں اسے دیوچ کر بدری ناچھ کے پاس لے آئے۔ بدری ناچھ کچھ کو بڑی قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں سیکو کار چیلوں نے کچھ کو دایم بائیں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ کچھ کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ کچھ خوف زدہ ہی نگاہوں سے اپنے سانسے کھڑے منہ میں بھرے ہوئے مہا پجاری بدری ناچھ کو کٹے جا رہی تھی کہ

اچانک بدری ناچھ نے اپنے جھولتے ہوئے چولے کے اندر سے ایک تیز دھار قرو لی نکال لی۔ اس کی تیل جیسی بڑے بڑے ابھرواں ڈیلوں والی آنکھوں میں وحشت اور جلاو صفت سفاکی اتری ہوئی تھی۔ وہ قرو لی اس نے کچھ کے پیٹ

میں بھونک دی۔

تہ خانے کے سلیٹن زور اور تنگ و تاریک وحشت ناک ماحول میں کچھ کی جگر پاس پیچ ابھری۔ تصانی صفت بدری ناچھ نے قرو لی کچھ کے پیٹ میں گھونپنے ہی اسے اوپر سینے تک بڑا چکا لگا دیا۔ بد نصیب کچھ کا جسم کھل گیا۔ گردن ڈھلک گئی۔ سیکو کاروں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ دھب سے فرش پر گر گئی۔ خون کی چھچھری میں پڑا اس کا جسم بھی جھٹکے کھار ہا تھا پھر ذرا ہی دیر بعد اس کا نیم ادھرا وجود ساکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔

اس ظلم و بربریت اور تنگ انسانیت منظر کو کچھ کرکئی قیدی لڑکیوں کے منہ سے خوف کے مارے چہچیں خارج ہوئیں۔ رینا نے بھی خوف و دہشت کے مارے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد ہی لالچ کے ٹنگے اور سلیٹن زدہ فرش میں "گھر گھر اہٹ" ابھری۔

اریہ اور شاہ زمان محتاط ہو گئے۔ وہ لالچ کے جس محفوظ گوشے میں چھپے ہوئے بیٹھے تھے، وہاں خاصی تاریکی تھی۔

"شاید لالچ روانہ ہو رہی ہے۔" اریہ نے سرگوشی کی۔ "ہاں! دوسری شفٹ کے سپاہیوں کو جزیرے کی طرف پہنچایا جا رہا ہوگا۔" شاہ زمان نے بھی ہولے سے کہا۔

"تیرا کیا جاتا ہے؟ پرے ہٹ تو....." کہتے ہوئے کچھ نے خود کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑایا اور پھر رینا کی جانب سرکی تو اس بار رینا نے بھی اس کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کا زوردار چھپڑ اس کے گال پر رسید کر.....

تہ خانے میں "چٹان" کی زوردار آواز ابھری اور کچھ کے ہوش ٹھکانے آگئے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کسی خونخوار ملی کے مانند غراتے ہوئے جارحانہ انداز میں رینا پر چھپٹی، لیکن بالی پھر درمیان میں حائل ہوئی اور کچھ کو دیوچ کر فرش پر لٹا دیا۔ وہ اب اس کے سینے پر سوار ہو چکی تھی اور اس کا گلا دبوچنے لگی۔

رینا حیران پریشان یہ منظر دیکھنے لگی۔ کچھ نے لینے لینے اپنے ایک ہاتھ کا ٹھوس بنا کر بالی کے چہرے پر رسید کیا، بالی کے حلق سے کراہ خارج ہوئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو کچھ کسی چھپلی کی طرح تڑپ کر اس کے نیچے سے پھسلتی ہوئی نکل گئی۔

ادھر چھپڑ کھا کر بالی نے بھی غصے سے ہونٹ بھیج کر ایک زوردار چھپڑ کچھ کے منہ پر مار دی اور ساتھ ہی اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ و نوح ڈالا۔ کچھ کے حلق سے چیخ بلند ہوئی اور پھر وہ دونوں کسی وحشی جنگلی بیوں کی طرح آپس میں قسم

گھٹتا ہوئیں۔

رینا انہیں چھڑانے کو لپکی۔ دیگر قیدی لڑکیاں بھی اس شور شرابے کی وجہ سے جاگ گئی تھیں۔ کوئی انہیں چھڑانے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ کچھ ڈری کبھی نگاہوں سے ان کی لڑائی دیکھ رہی تھیں۔ کسی کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کے آثار تھے تو کوئی دیکھنے کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کچھ اور بالی کی لڑائی جاری تھی۔ بالی، کچھ کے مقابلے میں دہلی پٹلی اور نازک سی تھی اور یہی کچھ کم و بیش رینا کا بھی حال تھا جبکہ ان کے برعکس کچھ ایک جنگجو قسم کی گھڑی عورت تھی۔

اس نے بالی کے پیٹ میں لات رسید کی تو وہ چیخ مار کر اس سے الگ ہو گئی۔ رینا کو فصر آگیا اور اس نے ایک چھپڑ کچھ کے مارنا چاہا جو گردن پر لگا، کچھ نے رینا کو دیوچ لیا۔ ادھر بالی بے چاری اپنا پیٹ پکڑے مارے اذیت و تکلیف کے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ نے خونخوار ملی کی طرح رینا کو دیوچ لیا تھا۔

اسی وقت تہ خانے کا دروازہ کھلا۔ مہا پجاری بدری ناچھ اپنے دو چیلوں کے ساتھ کچھ کی زینے طے کرتا ہوا تہ خانے کے



ان دونوں کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔  
 اریہ کی حالت زیادہ نازک ہو رہی تھی۔ اطراف میں پختلی  
 عجیب جباتاتی تیز بوسے دماغ بھی سن ہوا جارہا تھا۔  
 وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنی بے ترتیب سانسیں  
 درست کرتے رہے۔ اس کے بعد اطراف میں ایک نظر  
 ڈالتے ہوئے شاہ زمان نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔  
 ”اریہ! ہمیں اپنے شمن کے آغاز سے پہلے اپنے لیے  
 کوئی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہوگا تب ہی ہم آرام سے  
 کوئی حکمت عملی ترتیب دے سکتے ہیں۔“

جواب میں اریہ بولی۔ ”میرا نہیں خیال کہ ہمیں یہاں  
 کوئی مطلوبہ محفوظ ٹھکانا مل سکتا ہے، شاہ زمان!“ وہ اس کی  
 بات پر سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔  
 شاہ زمان کو مستفسر آنظروں سے اپنی جانب تکتا پا کر وہ آگے  
 بولی۔ ”یہ شمن جلد انجام تک پہنچانے کا متقاضی بھی ہے۔ مراد  
 خان ہی نہیں مجھے نواب شہباز خان کی بھی اس شمن سے متعلق  
 باتیں یاد ہیں۔“

”شاید تمہاری بات ٹھیک ہو۔“ شاہ زمان اب اس کی  
 طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”لیکن میں یہ قصہ ہی ہمیشہ کے لیے  
 پاک کر دینا چاہتا ہوں۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”میں اس جزیرے کو ہاک سمیت تباہ کر دینا  
 چاہتا ہوں تاکہ پھر بھی یہ جزیرہ اس تاریخی چوری کا سبب نہ  
 بن سکے۔“  
 ”لیکن یہ کیسے ممکن ہوگا شاہ زمان؟ ابھی تو ہمیں یہ  
 بھی نہیں پتا کہ یہ جزیرہ کتنا پھیلا ہوا ہے؟“ اریہ نے  
 کہا تو شاہ زمان اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے  
 ہوئے مسکرا کر بولا۔

”تم بہت ذہین ہو لیکن یہاں مار کھا گئیں۔ میرا  
 مطلب ان فرنگیوں کی یہاں کین گاہ کو بھی برا دکھاتا تھا۔“  
 ”اوہ..... یہ مطلب تھا تمہاری بات کا..... میں واقعی  
 اتنی سی بات نہ سمجھ سکتی۔“ وہ بھینپ کر بولی تو شاہ زمان محبت  
 سے اس کے گیلے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔  
 ”جو انسان بہت ذہین اور بہادر بھی ہو تو اس سے یہ  
 چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز ہو جاتا معمولی بات ہے۔ آؤ کچھ  
 کھالیں لیں۔“

اریہ نے بھی پیار بھری مسکراہٹ سے شاہ زمان کے  
 ہاتھ پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھ دیا۔  
 ساحل کے کسی اونچے چبوترے سے نصب سرج لائٹ

کی گردش روشنی کا دائرہ ان کے اطراف میں آ کر دور  
 ہو جاتا تھا۔ وہ ایسے رخ اور ایسی جگہ پر براجمان تھے جو سطح  
 مرتفع بھی تھی اور قدرے ڈھلوانی بھی۔ تاہم پھر بھی وہ دونوں  
 محتاط تھے۔

مراد خان نے انہیں روانہ ہوتے وقت ایک تھملا پکڑا دیا  
 تھا جو شاہ زمان نے اپنی پشت سے باندھ لیا تھا۔ اس تھیلے کے  
 اندر بجھائی ہوئی پھلی کے قتلے، ابلے ہوئے چاول اور پانی  
 کا ایک مشکیزہ تھا۔ وہ کھالیں کرانہوں نے پیپٹ کی آگ  
 بجھائی، کیونکہ تیرنے کے سبب انہیں بھوک لگ رہی تھی۔

وہ دونوں تھکاوٹ اور تیندھ بھی محسوس کر رہے تھے۔ معا  
 ہی اریہ نے لرزتی ہوئی آواز میں شاہ زمان سے کہا۔  
 ”وز..... زمان! دیکھو ذرا..... ہم..... میری..... پشت پر کوئی  
 شے ریگ رہی ہے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بے اختیار چیخ پڑی۔  
 زمان بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے بنا دیکھے انداز سے  
 اریہ کی پشت پر ہاتھ مارا تو مدھم مدھم سی روشنی میں ایک بچھو  
 اسے رینگتا ہوا نظر آ گیا جو جلد ہی تاریک جھاڑیوں میں گم  
 ہو گیا۔

رات کے سناتے میں اریہ کی چیخ کی آواز خاصی دور  
 تک گونجی تھی اور اسی وقت ان کے قریب میں لہرائی سرج  
 لائٹ ایک مقام پر ٹھہر گئی۔

اس دہری پریشانی پر شاہ زمان پریشان ہو گیا۔ تاہم  
 اس نے اریہ کو سنبھالا جو مارے درد کے بلبلانے لگی تھی۔ شاہ  
 زمان جانتا تھا کہ اسے جنگی بچھونے کاٹ لیا ہے.....  
 جس کا درد انسان کو ایک لمحہ کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔  
 درد بڑا تارہتا ہے اور یہی حال اریہ کا تھا۔

اس نے ڈنک والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر زخم کو سہلایا تو  
 اریہ اور مزید تکلیف سے کراہیں خارج کرنے لگی۔ اسے شاید  
 احساس ہو گیا تھا کہ اس سے کسی بھیما تک غلطی ہو چکی تھی جو ان  
 کی اب تک کی ساری محنت پر پانی پھیر گئی تھی۔

ٹھیک اسی وقت ایک دھماکا ہوا۔ دونوں چونک  
 پڑے۔ تاریک آسمان پر کوئی شے بلاست ہوئی تھی۔ شاہ  
 زمان سمجھ گیا کہ روشنی کا سسٹل فائر کیا گیا تھا۔

اس نے فوراً اریہ اور خود کو بچھو جھکا لیا۔ وہ جگہ یہاں  
 سے زیادہ دور نہ تھی جدھر فرنگی سپاہیوں کا ٹھکانا تھا۔

”چلو اٹھو اریہ! ہم! تیر کر، اب یہاں ہمارا زیادہ دیر  
 رکنا مناسب نہیں۔“ اس نے اریہ کو سنبھالتے ہوئے ابھی اتنا  
 ہی کہا تھا کہ اچانک روشنی کا ایک سیلاب ان پر پڑا اور ان کی

رنگ آسمان

پانی پھٹی آنکھوں نے اپنے ارد گرد چار پانچ مسلح وردی پوش  
 فرنگی سپاہیوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں نارنجیں اور  
 رائفیں تھیں۔

”ہاٹ.....“ کوئی فرنگی آفسر گلا پھار کر درشتی سے چیخا  
 تھا۔ اریہ اور شاہ زمان کے چہروں پر سناتے ثبت ہو کر رہ  
 گئے تھے۔

”ہاتھ اوپر کرلو..... جلدی! اور نہ گولیوں سے بھون  
 دیے جاؤ گے۔“

ان کے درمیان میں موجود ایک نیشنل قدامت و فرنگی  
 گورے نے تھمکانہ دہشتی سے کہا۔ اس کے ہاتھ میں چرخنی دار  
 بی نال والا پستول تھا۔ اس نے کھنٹوں تک ٹیکر پکڑ رکھی تھی،  
 سر پر ہیٹ تھا۔ اس کے ہمراہ چار رائفل بدست گورے سپاہی  
 پوس کھڑے تھے۔ شاہ زمان کو دراز قامت گورا ان کا کمانڈر  
 ہی دکھائی دیتا تھا۔

شاہ زمان نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے۔

”تم بھی، سانسیں لڑکی.....؟“ گورے کمانڈر نے  
 اریہ کی طرف دیکھ کر پرٹش آواز میں کہا اور فائر کر دیا۔

رات کی خاموشی میں گولی چلنے کا دھماکا بڑے زور سے  
 گونج رہا تھا اور اریہ کی چیخ نکلی تھی۔ شاہ زمان کا دل ایک لمحے  
 دھک سے دھک رہ گیا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس فرنگی نے اریہ  
 کو گولی تو نہیں مار دی ہے، لیکن وہ اپنی جگہ ایسے ہی کھڑی تھی۔  
 فرنگی نے اسے ڈرانے کے لیے اس کے قریب بیروں میں  
 گولی داغی تھی جو زمین میں بیوست ہو گئی تھی۔

”یہ تکلیف میں ہے، اسے بچھونے ڈنک مارا ہے۔“  
 شاہ زمان نے اریہ کو..... بیروں کھڑے دیکھ کر طمینان کی  
 سانس لی اور ان سے بولا۔

کمانڈر نے اپنے دوستاقتیوں سے تھمکانہ انداز میں  
 ہاتھ کہا۔ وہ آگے بڑھے اور ان دونوں کی تلاشاں لے  
 لیں۔ پھر ان کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے  
 گئے اور پشت پر رائفلوں کے بٹ مارے ہوئے انہیں دھکیلے  
 اسے ایک طرف کو چل پڑے۔

نارنجیں روشن تھیں۔ یہ لوگ جنگی جھاڑیوں کے درمیان  
 پہلے ایک پگھنڈی نما راستے پر چل پڑے۔ چند قدموں  
 بعد ہی شاہ زمان کو آگے ایک چوکی کے آثار نظر آئے۔ وہ سمجھ  
 گیا کہ یہ لوگ اسی چوکی سے اچانک ان کے سر پر آ کر مسلط  
 ہوئے تھے۔

اریہ چلتے چلتے اوندھے منہ گری۔ شاہ زمان گھبرا گیا۔  
 ایک فرنگی نے اریہ کو بازو سے پکڑ کے بڑی بیدردی کے ساتھ

شاہ زمان نے دیکھا، اریہ کی حالت بڑی ناگفتہ بہ  
 ہو رہی تھی۔ اس کا کولہ چہرہ اس وقت کلا گیا تھا، جسم پسینے سے  
 ہچکا ہوا تھا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اور اس سے چلنا  
 تو درکنار کھڑا بھی نہیں ہو جا رہا تھا۔ اریہ کی حالت زار دیکھ  
 کر شاہ زمان تشویش زدہ ہو گیا اور اسی لہجے میں فرنگی سے بولا۔  
 ”اس کی حالت بے حد نازک ہے، خدا کے لیے کچھ  
 کرو اس کے لیے..... اسے خطرناک بچھونے کاٹ لیا ہے۔  
 ہم سے بڑی غلطی ہوئی جو ہم نے کشتی تباہ ہونے کے  
 بعد تیرتے ہوئے یہاں آ کے جان بچائی۔“

شاہ زمان نے چالاکي سے کہا لیکن اریہ کی حالت  
 بہر حال نازک تھی۔ اسی وقت کسی گاڑی کی تیز روشنی ان  
 پر پڑی۔ ایک بغیر ہڈ والی جیپ ان کے قریب آن کھڑی  
 ہوئی۔

☆☆☆

راج محل میں پچھورام وہ واحد شخص تھا جسے پیش  
 آئند حالات کا اچھی طرح اندازہ ہی نہیں بلکہ پوری جان  
 کاری بھی تھی کہ اب آگے کیا ہونے والا تھا؟ کم و بیش یہی کچھ  
 فوجی بھی جانتی تھی، جسے راج محل کے کین ”تھلی گاہ“ کی ایک  
 ایسی دھواں سمجھے ہوئے تھے جس نے اب پوجا پاٹ کو ہی اپنا  
 مقصد بنالیا تھا جبکہ کوئی اس کے اصل ”مقصد“ کو نہیں جانتا تھا  
 کہ یہ دونوں ہی کس طرح اندر ہی اندر راج محل کی جڑیں  
 کھوکھلی کرنے میں مصروف تھے۔

پچھورام نے بغاوت کا جوج بور کھا تھا، اس کے نتائج  
 کا اگرچہ ابھی وقت نہیں آیا تھا تاہم اس نے بڑی مکاری کے  
 ساتھ ایک بالا ضرور مار لیا تھا۔ اس نے ناگرہ فوج کے نائب  
 سالار آتما سنگھ کو ساتھ ملا لیا تھا۔

”دلی سے ہمیں اور مہاراشٹر پونا سے گولکنڈہ کی ریاستوں  
 تک انگریز حادی ہو چکے ہیں۔ ان سے لڑنا اپنی بربادی کے سوا  
 کچھ نہیں، کیا بہتر نہیں کہ ان سے ساز باز کر کے پیش و آرام سے  
 زندگی گزاری جائے اور اقتدار کے مزے بھی لوٹے جائیں؟“  
 پچھورام نے نائب سالار کو جب پورے طور پر اپنا ہم  
 خیال ہوتے دیکھا تو یہ سب کہہ ڈالا۔

”اقتدار.....؟“ چچا لیس سالہ آتما سنگھ حیرانی اور کچھ  
 مسرت سے پچھورام کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں! اقتدار..... جواب یہاں ناگرہ میں چند  
 گھڑیوں کا مہمان ہے۔“ پچھورام بھوس اچکا کر اپنی بات  
 پر زور دیتے ہوئے بولا۔



چھپر سکتی تھی، لہذا اس نے بھی فوراً اچھے وقت کے انتظار اور موقع محل کے مطابق کسی زخمی ناگن کی طرح کینچلی بدل لی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر مسکراہٹ کی ملمع کاری بج چکی تھی۔

”مہارانی جی! اپنے سنگھاسن کے لیے تیار ہو جائیں کہ اب تو ناگرہ کی چوٹیاں بھی آپ کی فتح و مند کے سکھ اور ڈمر و بجانے لگی ہیں۔“

بچھورام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوب لہک لہک کر کہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر اپنے لیے استقبالیہ مسکراہٹ پر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے۔ نجوبائی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نشست سے اٹھی اور اپنے صحت مند وجود کی دلکشی کو بچھورام کے کچھی سے بازوؤں کے حوالے کر دیا۔

نجوبائی کے لیے اب اس کا وجود دن بہ دن ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا، مگر وہ مجبور تھی اور موقع کی منتظر بھی۔ سو ایک ملکہ ایک غلام کی یہ ”جھلمیں“ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ کچھ بھی نہ ملے ہوئے کو اچانک بہت کچھ مل جائے تو وہ سیر ہونے کے بعد اور گرسنہ ہو جاتا ہے، بچھورام کا بھی یہی حال ہونے لگا تو بالآخر نجوبائی نے اسے دھیرے سے اور محبت سے..... لگ کر دیا اور اٹھلا کر بولی۔

”آخر پتا تو چلے، اب تم کون سا تیر چلا کے آرہے ہو؟“

”کوئی ایسا ویسا..... میری رانی..... مہارانی!“ بچھو رام بھی جیسے سرور میں آکر بولا۔ ”انگریز (انگریز) سرکار کی فوجیں روانہ ہو چکی ہیں۔ راج محل کے اندر میں نے جڑیں کاٹ ڈالی ہیں۔“

”راج محل کی یا اس مورکھ پر کتاب کی.....؟“ نجوبائی نے نفرت سے ہونٹ سیکڑ کر کہا۔ ایسے میں اس کا حسین چہرہ نفرت اور غیظ تلے عجیب ہی لگ رہا تھا۔

”ارے میری مہارانی! اسی مورکھ کی تو بات کر رہا ہوں۔ بھلا ہمارے اس سنگھاسن راج محل کو کیا ہو سکتا ہے۔“

بچھورام اسی طرح غنٹ کی طرح لہک لہک کر بولا۔

”تمہارے حامیوں کو میں اکٹھا کر رہا ہوں۔ اب بھی راج محل میں ہمارے وفاداروں کی کوئی کمی تھوڑا ہی ہے مہارانی جی!“

اس کی بات سن کر وہ بولی۔

”بچھورام! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ انگریز سرکار ہمیں کچھ نہیں دے گی، وہ یہاں اپنا قبضہ جمالے گی اور ہم سب قید خانے میں ہوں گے۔“ نجوبائی کے لہجے میں ہر اس اور خدشات تھے۔

اگلی چند ساعتوں کے بعد سالار کو، جو پہلے ہی کافی عرصے سے راج محل کی بدلی بدلی فضا کے باعث گولگولکا شکار تھا، بچھورام نے اسے نئی راہ بچھا دی تھی۔ وہ رام ہو چکا تھا۔

”ہم اقتدار میں آتے ہی سب سے پہلے تمہیں سینا پتی بنائیں گے، مہارانی نجوبائی کے ساتھ وفاداری کرنے پر قیمتی انعام و اکرام کی بارش الگ ہوگی تم پر۔“

آتما شکلا نے فوراً ساتھ دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ جنگ سے ہر کوئی خوف زدہ تھا۔ راج محل کے مقتدرہ کی رائے یہی تھی کہ انگریزوں سے ٹکر لینے کے بجائے ان سے وہی مذاکرات کامیاب بنائے جائیں جو مہاراجا چندر گپتا کی پالیسی تھی اور نئے راجا کی پالیسی ناگرہ کو جنگ اور تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہی ہے۔

پروپیگنڈے کی یہ لہریں ہواؤں کے دوش پر راجا پر تاب کمار کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں مگر وہ اسے کسی سازش کا شاخسانہ سمجھنے کے بجائے ایک روایتی اختلاف کا نام دے کر درگزر کرتا رہا۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب چھپے ہوئے سازشیوں کی چال کامیابی سے ہمکنار ہونے لگتی ہے اور..... وہی ہو رہا تھا۔

بچھورام جن جن کرایے آدمیوں کی تلاش اور ان کا ذہن خراب کرنے میں بہت پہلے سے ہی مصروف تھا۔ نائب سالار کو ساتھ ملانے کے بعد بچھورام نے رات کے اسی مخصوص پہر میں تخلیک گاہ کا رخ کیا جہاں کچھ دنوں سے وہ جانے سکا تھا۔ وجہ اس کی تازہ ترین مصروفیات تھیں۔

تخلیک گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے مہاراجا کی زرق برق پوشاک پہننا نہیں بھولتا تھا۔ وہ اپنی اوقات بھلا چکا تھا، نہیں جانتا تھا کہ یہ لباس فاخرہ اس پر کس قدر بھاری پڑنے والا تھا۔ پوشاک پہننے کے بعد اس نے سیدھا اندر کا رخ کیا۔ جہاں نجوبائی حسب سابق گرم صم بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر چونکی اور ہمیشہ کی طرح بچھورام کو اپنے مرحوم شوہر کا شاہانہ لباس پہنے دیکھ کر اس کے اندر نفرت و غیظ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

عورت کتنی ہی بری ہو، مگر وہ اپنے شوہر اور وہ بھی جو اچانک اور ناگفتہ بہ حالات میں داغ مفارقت دے چکا ہو، کسی دوسرے آدمی کو اس لباس میں کبھی نہیں برداشت کرتی اور پھر وہ بھی بچھورام جیسے ایک بے حیثیت شخص پر، جو اس کے غلاموں کا بھی غلام تھا، لیکن تقدیر نے بھی شاید نجوبائی کو اس کے کرتوتوں کی سزا ہی دی تھی جو اب بچھورام کی صورت میں اسے ہر وقت ملتی رہتی تھی۔ وہ ابھی اسے انکی جتنا بھی نہیں







نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر چائے اور ناشتا رینا سے ہی بنائے تو کہہ دے گی، اسے یقین تھا رینا انکار نہیں کرے گی۔

لیکن وہ تھی کہاں.....؟ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی سوچتی رہی، تب ہی اسے دوسرے گوشے سے اپنے بھائی رابرٹ کی غنودہ سی آواز سنائی دی۔

”چلو بھئی جاگ پر دووٹوں..... ناشتا بنا لو بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ شرابی تھا اور اسے صبح اٹھتے ہی سخت بھوک لگتی تھی۔

”برادر! رینا کہیں گئی ہوئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو تم بنا لو.....!“ رابرٹ کی آواز ابھری۔ ”مگر وہ گئی کہاں ہے اتنی صبح.....“

”پتا نہیں، میں خود حیران ہوں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”اجھا.....!“ رابرٹ کی گونگی آواز ابھری۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں پوری طرح جاگ چکے تھے اور رینا کو ادھر ادھر تلاشتے پھر رہے تھے۔ شوکی بھی رینا کے اس اچانک غیاب پر پریشان تھا۔ انہوں نے بستی والوں سے بھی رینا کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو ان کا تھا تھا۔

”رینا کو سوتے میں اغوا کر لیا گیا ہے۔“ اچانک جیسے شوکی نے ان کی سامتوں میں ایک دھماکا کر ڈالا۔

”کیا..... تمہیں کیسے پتا چلا؟“ گارشیا نے اس کی طرف پریشان کن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس گوشے کا باریک بینی سے جائزہ لے کر آیا ہوں۔“ شوکی نے بتایا۔ ”جدھر تم اور رینا سوتے ہو، وہاں اور باہر اطراف میں مجھے کچھ ایسے نشانات ملے ہیں جن سے مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ.....“

”مگر کون لوگ اسے اغوا کر سکتے ہیں؟“ رابرٹ نے درمیان میں کہا۔

”ان بد معاش پجاریوں کے سوا یہ حرکت اور کسی کی ہو سکتی ہے۔ میں ابھی کالی کے مندر جاتا ہوں۔“ شوکی ایک دم جوش میں آ گیا۔ رابرٹ خاموش تھا مگر گارشیا نے اس کا راستہ روک لیا، بولی۔

”نہیں، تم اکیلے وہاں مت جاؤ، وہ بہت خطرناک لوگوں کا ٹولہ ہے۔ میرا خیال ہے ان بستی والوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔“ اس نے آخر میں اپنا خیال پیش کیا تو رابرٹ استہزاء سے بولا۔

”یہ بے چارے بستی والے ہمارے کیا مدد کریں گے جو خود ہماری مدد کے محتاج ہیں۔“

شوکی کو اس کا تبصرہ برا لگا مگر وہ ایسے نازک وقت میں اس کے منہ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ تاہم بولا۔

”تم دونوں ادھر ہی رہو..... رینا کو میں خود ہی کالی کے مندر میں جا کر تلاش کروں گا، کیونکہ مجھے پکا یقین ہے یہ حرکت مہا پجاری بد رتی کا تھکے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔“

”بھد شوق..... ہم ادھر ہی تمہارا انتظار کریں گے۔“

رابرٹ نے فطری انداز میں کہا تو گارشیا نے برہمی سے بھائی کی طرف دیکھا اور اس کے کان میں کچھ کھسکھسکی، رابرٹ کو تب بات سمجھ میں آئی۔ راج محل جانے اور راجا پر تاب کمار سے ملاقات کا یہ سنہری موقع تھا۔ ورنہ تو وہ جذبہ رقابت تلے شوکی کو خطرے میں ڈالنے ہی لگا تھا۔

گارشیا نے ہی اسے احساس دلایا کہ یہ غلط ہوگا، شوکی ان بد معاش پجاریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ انہیں رینا کی جان ہی نہ خطرے میں پڑ جائے، پھر رابرٹ کی آنکھوں میں اپنا وہ دیرینہ منصوبہ بھی نظر آنے لگا تھا جو وہ سوچنا کے حوالے سے ترتیب دے رہا تھا۔

سوچنا کا خیال آتے ہی اس نے پہلی بار شوکی سے ذرا سنجیدگی سے وہی کچھ کہا جو گارشیا نے اسے بتایا تھا مگر شوکی نہ مانا، وہ اپنی ہٹ کا پکا ٹکڑا۔ اس نے ان دونوں بہن بھائیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اسے راجا پر تاب کمار سے مدد کی کوئی توقع نہیں ہے، لہذا رینا کی تلاش میں جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہوگا۔

شوکی اپنے مختصر سے ہتھیاروں کے ساتھ کالی کے مندر کی جانب بڑھ گیا۔

”چلو دفع کرو اس ضدی آدمی کو..... ہم راج محل چل کر راجا صاحب سے ملتے ہیں۔ ہائے کیسے عیش تھے جب ہم وہاں رہتے تھے۔“ رابرٹ شاہی محل (راج محل) میں گزر رہے ہوئے وہ دن بڑی حسرت سے یاد کر رہے تھے۔

اگلے ایک گھنٹے بعد دونوں بہن بھائی ایک گھوڑے پر راج محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے بھر میں چالاک رابرٹ نے اپنے دیرینہ رقیب شوکی کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تیار کر لی تھی، لیکن جب اس نے اس کے بارے میں اپنی بہن گارشیا کو بھی اپنا ہم خیال بنانا چاہا تو اس نے فقط ایک خدشے کا اظہار کیا کہ اس طرح کہیں شوکی کی زندگی کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔

مکار رابرٹ جانتا تھا کہ اس کی بہن شوکی کی محبت میں

گمراہ ہے، وہ اسے بھی بیوقوف بنانے کی غرض سے سبز باغ لگاتے ہوئے بولا۔

”دیکھو سسٹر! شوکی کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھنا ہی کرتا کیا ہوں اور دے بھی جب تک رینا زندہ ہے، شوکی بھی مجی گہوارا نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر میں اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔“

گارشیا نے زہریلی ناگن کی طرح پھر کر کہا۔ وہ اپنے ان خطرناک عزائم کا پہلے بھی بھائی کے سامنے اظہار کر چکی تھی۔

”بس، پھر وہی کرتی جاؤ اور دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔“ رابرٹ نے مکاری سے کہا۔ گارشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ رینا جن لوگوں کی نگاہ میں ہے، وہ ساری عمر وہیں رہے۔ تاہم ایک اور خدشے تلے بھائی سے گویا ہوئی۔

”اس بات کا خیال رہے کہ اصل حقیقت راجا صاحب کو پتا نہ لگنے پائے، ورنہ انہاں دونوں نہ ان کے عتاب کی زد میں آجائیں۔“

”یہ فکر ہو سسٹر! برادر ایسے کچے کام نہیں کرتا۔“ رابرٹ نے مسکرا کر کہا۔

یہ دونوں بہن بھائی رینا اور شوکی کے خلاف ایک نئی سازش لے کر ناکرہ پہنچ گئے۔ ان کی آمد کا سننے ہی راجا پر تاب کمار نے فوراً اسے جیتر انہیں اپنے روبرو طلب کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

”رینا کدھر ہے.....؟“

ان دونوں کو دیکھتے ہی ناگہرہ کے راجا پر تاب کمار کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ پھسلے تھے۔

دونوں مکار بہن بھائی رونے لگے اور اسی حال میں ان کے ہارے میں بتایا کہ اسے وہ مسلم لڑکا شوکت حسین عرف شوکی انوار کے لے گیا ہے۔

راجا پر تاب یہ سنتے ہی ایک دم جیسے چند ثانیوں کے لمحے میں آ گیا۔ اسے پہلے اپنی ساعتوں پر یقین ہی نہیں آ سکا، پھر دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو نہ پاسکا اور جوش غیظ تلے ایک دم اپنی نفست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہم نشین صاحب خاص بھی احتراماً اپنی پشتیں چھوڑ کر منسوبانہ کھڑے ہو گئے۔

”اس نوکر کی جرأت..... اتنی ہمت..... کیا وہ نہیں جانتا کہ رینا ہمارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے؟“

”جانتا تھا حضور! بہت اچھی طرح جانتا تھا۔“ شاطر رابرٹ نے مکارانہ فروتنی سے جواب دیا۔ وہ بھی اب

ہندوستانی ادب و آداب کے طور طریقے جان گیا تھا، اسی انداز میں آگے بولا۔

”اسی لیے تو رینا کو اتوں رات نیند کی حالت میں بے ہوش کر کے خاموشی سے اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔“

”لیکن..... شوکی بھلا یہ حرکت کیسے کر سکتا ہے؟“ راجا پر تاب کمار کا دماغ ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو گلو سے لہجے میں جیسے خود کلامیہ بولا۔ ”وہ تو بہ قول ان دونوں باپ بیٹی (رینا اور پروفیسر ہنری) کے ان کا بہت خیر خواہ اور بے حد قابل اعتبار ملازم تھا۔ میرا خیال ہے تم دونوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”ہرگز نہیں یور ہائینس!“ اس بار گارشیا نے لب کشائی کی۔ ”ہم بھی ابتداء سے ہی ان کے ساتھ رہے ہیں۔ شوکی کی نیت شروع ہی سے رینا پر خراب تھی۔ وہ موفتے کا منتظر رہتا تھا۔ میں نے اور برادر رابرٹ نے کئی بار رینگے اٹھوں شوکی کو رینا سے زبردستی دست درازی کرتے دیکھا اور چھڑایا تھا۔“

گارشیا نے یہ سفید جھوٹ اس صفائی سے راجا پر تاب کمار کے گوش گزار کیا کہ وہ اسے سچ سمجھ بیٹھا۔

”مجھے تو لگتا ہے یور ہائینس کہ شوکی کی پشت پر کسی خطرناک گروہ کا ہاتھ ہے۔ وہی گروہ جو انسانوں کو غلام بنا کر افریقہ اور عرب ممالک میں فروخت کیا کرتے ہیں۔“

رابرٹ نے بڑی مکاری سے ایسا نقشہ کھینچا کہ راجا پر تاب کمار بے چین ہی نہیں، سخت تشویش زدہ بھی ہو گیا۔

رینا کے ذکر پر وہاں موجود مصائبین نے ایک دوسرے کی طرف متنی نظروں سے بھی دیکھا تھا مگر کچھ کہنے یا بولنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔

مختصر یہ کہ راجا نے رابرٹ اور گارشیا کو مہمان گاہ میں بھیج دیا اور خود سات سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کروا کر رینا اور شوکی کی تلاش میں روانہ کر دیا۔

رابرٹ کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ راج محل میں آتے ہی اس نے بلا دیر سوچنا سے ملاقات کر ڈالی۔ سوچنا بھی ایک عرصہ اس سے دور رہ کر اس کے لیے اپنے دل و دماغ میں.... خدارا لوہے چینی سی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسا رابرٹ کے دور ہو جانے کے بعد ہی ہوا تھا۔

وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس کا دلہانہ پن دیکھ کر تو ایک لمحے کے لیے چالاک لومڑی جیسا رابرٹ بھی حیران و پریشان رہ گیا مگر دل ہی دل میں خوش بھی ہوا کہ شکار پسند سے دور رہتے ہوئے بھی دام میں تھا۔

اسے سوچتا ہے وہ آخری ملاقات اچھی طرح یاد تھی



جب اس نے فوج اور معصوم سوجھنا کے گل رخ بدن اور اس کے جذبات کو چھیڑتے ہوئے اپنی محبت کا راگ الا تھا اور اسے انگلستان کے آزاد اور مکمل ماحول کے بارے میں سبز باغ دکھائے تھے اور اس کی تعریف میں خوب گن گاتے ہوئے دور کے سہانے وصول بچائے تھے۔ نادان سوجھنا ابھی تک اس کی ان باتوں کے سحر سے نہیں نکل سکی تھی۔

وہ اسے خوب گرماتار ہا اور پھر وہی چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔

راج محل میں آج انہیں دوسرا دن تھا کہ ہر طرف ایک یہ شور مچ گیا کہ انگریز افواج نے ریاست ناگرہ پر دھاوا بول دیا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن ایک پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پیدہ سحر کی مگیاہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔

ریاست ناگرہ کی طرف جانے والے مل کھاتے پہاڑی راستے سے پرے اور بہت دور جہاں ہر دوڑ کا گھٹنا جنگل، سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں کی صورت میں آگے بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں ایک میدان اور قدرے سطح مرتفع کے مقام پر برش آری اور ملٹری فورس کوہ شمالی کی ان پہاڑیوں کے دامن تک پہنچنے کے لیے اپنی مسکری قوت کو جمع کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

اس مقام کو فرنگی عسکری منصوبہ سازوں نے اپنی جنگی اصطلاح میں ”تین حدے“ کا نام دے رکھا تھا۔ یہاں سب سے پہلے فرنگی اپنی پوری عسکری قوت کو جمع کرنے کے بعد فیصلہ کن قدم بڑھانے والے تھے۔ دوسری سے ایک اور..... دشوار گزار راستہ ناگرہ تک جاتا تھا جہاں سے راجا پر تاج کمار کے قلعے راج محل میں..... یہ آسانی اور موثر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس راستے سے صرف انگریزی فوج ہی داخل ہو سکتی تھی اور اسے بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

جیسا کہ مذکور ہوا یہ راستہ جسے ”روٹ زبرد“ کا نام دیا گیا تھا۔ بے حد تنگ، دشوار گزار اور تار مار تھا، جبکہ وہ راستہ جہاں پر انگریزی سمیت آرٹلری اور آرڈیننس (توپیں، گولہ بارود) کی آمدود شدہ آسانی ممکن تھی..... ”روٹ ون“ تھا۔ بڑے بڑے دوڑوں میں چار توپیں لاؤ کر اس مقام پر اتاری گئی تھیں۔

یوں اس تقریباً نصف بریگیڈ کی فوجی قوت کی کمانڈ بریگیڈیئر ڈان کیورشم کے سپرد تھی۔ میجر ڈی فارست اس کے

ہمراہ تھا جبکہ کرنل بلٹروڈ اپنی رجمنٹ کے ایک کمانڈنگ آفیسر جرنل کے ہمراہ اپنی ٹائلیٹ کے ساتھ ”روٹ زبرد“ کی جانب حکم ملتے ہی کوچ کر جاتا۔

دوسری جانب کرنل ایڈرسن اپنے ایک مددگار کپٹن رچرڈ کے ہمراہ مال گاڑی میں موجود تھا۔ فوری رابطے کے لیے ٹیلی فون کی تاریں زمین میں بچھادی گئی تھیں۔ جس مقام پر ”پکٹے“ نصب کرنا تھے، وہاں یہ بریگیڈ تین حصوں میں تقسیم ہو کر حملے کا ایک وقت آغاز کر ڈالتے۔

لہذا ”روٹ ون“ پر جہاں سے یہ آسانی انگریزی سمیت آرٹلری فوج ریاست ناگرہ پر حملہ کر سکتی تھی۔ یہاں سے پیش قدمی کے لیے عارضی طور پر ڈیرا ڈال لیا گیا۔ یوں اب وہ اپنے کمانڈر کی طرف سے اگلے احکامات کے منتظر تھے۔ جبکہ اسی راستے سے تقریباً سولہ سترہ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال جنوب کی طرف ریلوے لائن تھی۔ اور وہاں ایک چار بویوں والی مال گاڑی مناسب رفتار سے چلی آرہی تھی اس میں نوے بارہ اونچے دھانوں والی دو توپیں لدی ہوئی تھیں اور مساح افواج تھی۔ یہ سب ماہر توپچی (گنر) تھے۔ اس مال گاڑی نے اپنے ٹھیک مقرر کردہ مقام پر پہنچ کر رک جانا تھا۔

چنانچہ جب ”تین حدے“ پر تینوں ٹائلیٹ جمع ہو گئیں تو بریگیڈیئر ڈان کیورشم نے کرنل بلٹروڈ کو ”روٹ زبرد“ کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ فوراً روانہ ہو گیا۔ لہذا انہیں روانہ کرنے کے بعد ڈان کیورشم نے اپنی بریگیڈ کے ساتھ ”روٹ ون“ کی طرف پیش قدمی کر ڈالی۔

دوسری جانب آری مال گاڑی، جس میں کرنل ایڈرسن اپنے ساتھی کپٹن رچرڈ اور پوری آرڈیننس کمانڈ کے ساتھ موجود تھا، اپنا مقررہ سفر طے کرنے کے بعد ایک مقام پر رک گئی۔ اس کے بعد مال بویوں کے جھنگے کھولے گئے اور ان پر تختے لگا کر دو توپوں کو نیچے اتارا گیا۔ دیگر فوجی بھی چاق و چوبند انداز میں نیچے اتر آئے۔

ٹیلی فون کی بچھاٹی ہوئی تاروں سے ریسیور اور سیٹ خشک کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تینوں ریمشس کا آپس میں رابطہ قائم ہوتے ہی، انہیں جنگ شروع کرنے کا آرڈر مل گیا۔

یہ لوگ دو پہیوں والی توپیں دھکیلے ہوئے برابر پیش قدمی کرتے رہے۔ جب یہ ناگرہ کی سرحد کے بالکل قریب پہنچے تو کرنل ایڈرسن نے یہاں سے فوجیوں کو ”ایڈ وائس“

کرنے کی کمانڈ جاری کر دی۔

وہ ایسے رخ پر تھے کہ کپٹن وہ راج محل کو جنوبی سمت سے لٹا نہ بنا سکتے تھے، مگر یہ تب ہی ممکن تھا جب ریاست ناگرہ کی دیوار گرے۔

جنگ کا ہنگ بجتے ہی بیک وقت تین اطراف سے انگریز فوجیوں نے ریاست ناگرہ پر دھاوا بول دیا۔

☆☆☆

”نعرہ عجبیر..... اللہ اکبر.....“

جنوب مشرقی سرحد پر موجود اتحادی فوج کے سالار علی ریحان نے فرنگیوں کی طرف سے فائرنگ اور گولہ باری ہوتے ہی یہ نعرہ بلند کیا تھا۔ جنگ کی ابتدا ہو گئی تھی اور دونوں جانب سے بارود اور شعلوں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔ علی ریحان کے ہمراہ اس کے نائب کی حیثیت سے نواب شہباز خان کافر زنا اور جند بھی تھا۔ یہاں ان کے پاس پانچ ہاتھی سوار تھے۔ انہیں علی نے ابھی پیچھے رکھا تھا۔ ہاتھی پانچ ماہی سوار سرحد کی جنوب مغربی سمت میں تھے اور وہاں اقبال خان تھا۔ وہاں ایک توپ اور دراصل بردار سپاہی بھی تھے۔ باہمی سواروں میں بہترین تیر انداز اپنے ہودوں میں تیار بیٹھے تھے۔

علی ریحان نے اپنے دو بچیوں کو گولہ باری کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ ایک ایک گولہ پھاڑ دھا کا ہوا۔ دشمن کی طرف سے پھینکا ہوا ایک گولہ ان کے پکٹے کے بالکل سامنے صرف چند گز کے فاصلے پر گر ا تھا اور اس بھاری گولے نے زمین پر بہت گہرا گڑھا پیدا کر دیا تھا، اس کا بارود اطراف میں دوڑ دوڑ کر جلتی سکتی چنگاریوں کی صورت پھیلا تھا۔ علی کو تشویش ہوئی، اس نے چلا کر تو بچیوں کو حکم دیا۔

”اسی کی ڈگری پر گولہ داغو..... جلدی.....“

حکم ملتے ہی توپچی نے پھرتی سے اسپاتی چرخی گھمائی، بیرل کو آوی ڈگری پر ایڈجسٹ کیا اور تین پر شعلہ دکھا کر گولہ داغ دیا۔ یوں انہوں نے بھی جوابی حملہ تیز کر دیا۔

یہ ناگرہ کی وہ سرحدی حدود تھیں جہر سے دشمنوں نے اپنے ”روٹ ون“ سے پیش قدمی کی تھی اور راجا پر تاج کمار کے سینا پتی کے مطابق یہی وہ راستہ تھا جہاں سے فرنگی افواج بھاری نفری اور اسلحے کے ساتھ راج محل پر حملہ کرنے کی کوشش میں تھے۔

ناگرہ افواج ان سے سیدھے ہاتھ پر کوئی پندرہ فرخ کے واسطے پر تھی۔ اتحادی افواج کی جوابی گولہ باری کے

ساتھ ہی انہوں نے بھی فرنگیوں پر جوابی حملے کی ابتدا کر ڈالی تھی۔

میدان جنگ کے اس حصے میں اگلے کئی گھنٹوں تک عجمان کارن بڑا رہا۔ ناگرہ اور اتحادی افواج ابھی دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھیں جبکہ فرنگی افواج مسلسل جارحانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔

علی نے جب دیکھا کہ ان کی افواج مسلسل فرنگیوں کے دباؤ سے نہیں نکل پا رہی ہے تو اسے تشویش ہوئی۔ اس کے مطابق تین گھنٹوں بعد انہیں دھکیل دینا چاہیے تھا۔ اگر جنگ کی مسلسل یہی صورت حال رہتی تو ممکن تھا کہ فرنگی افواج ان پر چڑھ دوڑتی۔

اس نے فوراً تیز رفتار گھوڑے پر سواری کی اور آندھی طوفان کی طرح وہ ناگرہ کی افواج کے سینا پتی موج شک سے ملاؤہ اس وقت اپنے مورچے کے قریب ایک چھوٹا سا میدان میں موجود تھا۔ علی کو نور آس سے ملوایا گیا۔

علی کو اس بات کا احساس تھا کہ موج شک یا کوئی اور اسے اریہ کے بھائی شوشل کی حیثیت سے پہچان سکتا تھا۔ اس لیے اس نے احتیاط کے طور پر اپنے سر پر بجا بندا نہ انداز میں باندھے ہوئے صافے کو کچھ اس طرح چہرے پر بھی بھکا لیا کہ شکل پوری طرح واضح نہ ہو پائے۔ یوں بھی یہ جنگ کا میدان تھا، کسی کو کب اس کی صورت کا دھیان رہتا۔ راج محل میں بھی چند لوگوں نے ہی اسے دیکھا ہوگا، وہ اریہ اور شاہ زمان کی طرح زیادہ عرصہ وہاں کب رہا تھا۔ یوں جاسوسوں والی بات کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے پیش نظر اس نے ایسا کیا تھا۔

بہر کیف..... وہ اندر داخل ہوا تو اسے موج شک کو بڑے آرام سے بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ایک فرشی نشست پر گاؤٹیکے سے پشت کٹائے بڑے آرام سے بیٹھا تھا اور اس کے قریب..... طعام..... بھی رکھا تھا۔

”آؤ..... علی! تم شاید ہمیں یہ خوش خبری سنانے آئے ہو گے کہ ہم ان فرنگیوں کو کیا سامنے توڑ جواب دیے ہوئے ہیں۔“ فرستی میں ڈوبے ہوئے موج شک نے کہا۔

”بہت جلدی یہ خوش خبری بھی ہوگی..... اے حلیف ہر کاہ!“ علی نے مصلحتاً خبر سنانے کی عنوان رکھتے ہوئے اپنی گفتگو کی ابتدا کی۔ ”لیکن میں اس کامیابی کو زیادہ دیر مصلحت نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو فرنگیوں کو جنگ کا پانسہ پلٹنے کا بھرپور موقع مل جائے گا..... اور ان کا اگلا وار ہماری شکست ہو سکتا ہے۔“



”کیا مطلب؟“ موج سگھ چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی علی کو بھی اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ علی نے فریخت سنبھالی اور بولا۔

”جی ہاں! سچ سے جنگ کی ابتدا ہوئی اور اب کئی گھنٹے ہو چلے ہیں، مگر ہم مسلسل دفاعی صورت سے باہر نہیں نکل پارہے ہیں۔ ہمیں دو پہر سے پہلے پہلے دفاعی سے جارحانہ پوزیشن میں آ جانا چاہیے۔“

اس کی بات پر موج سگھ نے خفیف سی ہانک بھوں چڑھائی پھر اسے ایک ہنسی میں بدلے ہوئے کہا۔

”چتا کی ضرورت نہیں، ہم اور ہماری اتحادی فوج ان فرنگیوں کی نفری سے کہیں زیادہ ہیں، یہ اپنا اسلحہ اسی طرح ضائع کرتے کرتے سہ پہر تک خالی ہاتھ لوٹ جائیں گے۔“

علی کو اس کے یہ خیالات جان کر انوس ہوا بولا۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ہم کسی ایک پڑوسی ریاست سے برسر پیکار نہیں ہیں بلکہ برٹش گورنمنٹ کی ملٹری اور آری سے نبرد آزما ہیں، جو نفری سے زیادہ عسکری اہمیت کی حامل ہے، ان کا اسلحہ ہم سے زیادہ بھاری اور جدید ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا، ہم جاؤ اور جنگ کا یہی انداز اختیار کیے رکھو دیکھنا سہ پہر سے پہلے پہلے ہمارے تجربے کا نتیجہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔“ موج سگھ نے پر غور لہجے میں کہا اور علی کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کپٹے کی راہ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

علی جب سینا پتی موج سگھ کی چھو لہاری سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو ایک شخص ذرا فاصلے پر کھڑا بڑے غور سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

یہ موج سگھ کا نائب سالار آتما شکار تھا، یہ وہی شکار تھا جو پچھورام کا ہم خیال تھا۔ اسے کھد بد ہوئی کہ آخر اتحادی فوج کا یہ سالار اس کے سینا پتی کے پاس کیا کرنے آیا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اس نے فوراً سینا پتی موج سگھ کی چھو لہاری کا رخ کیا۔

”آؤ شکہ جی! کیا اس اتحادی فوج کے سالار علی نے تم سے بھی کچھ کہا۔“

”ایسا کچھ خاص تو نہیں، آپ سے کیا کہا اس نے۔۔۔؟“ شکا نے بڑی مکاری سے کہتے ہوئے اپنے لیے کوئی جھوٹ بولنے کی کوشش رکھنا چاہی۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا جب موج سگھ نے

اسے علی کی آمد کے بارے میں آگاہ کیا۔

”دیکھا، سینا پتی جی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ اتحادی بڑی چالاک کی کریں گے ہمارے ساتھ، اپنا اسلحہ اور فوج خرچ کرنے کے بجائے ہم پر اس کا دباؤ ڈالیں گے، آپ نے بہت اچھا جواب دے کر اسے لوٹا دیا۔“ شکا ایک دم بولا۔

درحقیقت شکا نے اپنے منصوبے کے مطابق ہی سینا پتی کو یہ پتہ پہلے سے ہی پڑھادی تھی جو اسل میں پچھورام کا ہی منصوبہ تھا کہ اس جنگ میں خود آگے ہونے کے بجائے اتحادی فوج کو ہی آگے بڑھنے دیا جائے اور اپنا اسلحہ بھی کم سے کم خرچ ہو۔

موج سگھ اپنی افواج کا ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا، جنگ میں کب مصلحت اور کب دور اندیشی سے کام لیتا تھا، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ ظاہر وہ اپنے نائب کی باتوں میں آگیا تھا، مگر اس نے بھی حالات پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

لہذا جب سہ پہر کو اس نے خود میدان جنگ کا جائزہ لیا تو اسے فکر تشویش نے آیا۔ جنوب مشرقی راستے پر فرنگی افواج کئی فرخ اور آگے بڑھ آئی تھی اور اب کسی وقت بھی وہ راج محل پر گولہ باری کرنے کی پوزیشن میں آسکتی تھی۔ موج سگھ جانتا تھا کہ اگر اس راہ سے ایک گولہ بھی راج محل کے اندر تو کیا اس کی فصیلوں کی تھوڑی دور بھی کرا تو اس کی شامت آجائے گی۔

وہ اپنا نقشہ بھلا کر اپنے کپٹے پر پہنچا اور اس نے حملہ تیز کرنے اور توپوں کے استعمال کی اجازت دے ڈالی۔

شکا نے یہ دیکھا تو اپنی غلٹیں جھانک رہ گیا۔

ادھر اتحادی افواج بڑی بے جگری سے فرنگیوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ لیکن انہیں بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جب تک ناگرہ کی فوج دشمن پر بھاری حملہ نہیں کرے گی، جنگ کا پانسانان کے حق میں نہیں پلٹ سکتا تھا۔

اجانک ایک ساعت ٹھنک دھماکا ہوا۔ فضا میں کئی انسانوں کی چیخیں ابھریں۔ خود علی اپنے کپٹے سے چند تھم دور جاگرا۔ ہر طرف بارود کی بو اور شعلوں کا رقص طاری ہو گیا۔ دشمن کے کولے نے ان کا ایک پلکا تباہ کر دیا تھا اور کئی سپاہی بھی مارے گئے تھے۔

علی نے توپ خانے کا رخ کیا تو یہ دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا کہ ایک توپ اٹنی پڑی تھی جبکہ دوسری توپ کے گرد تین سپاہی زمین پر پڑے تھے۔ اپنے مختصر اور عارضی توپ خانے کی یہ حالت دیکھ کر علی نے

نور دی اسے سنبھالنا چاہا تو اسے دیکھ کر چند سپاہی اس کی مدد کو لپکے۔

علی نے بہت تھک کر دشمن کے تودہ نما مورچے کا جائزہ لیا جس طرف سے وہ اپنی توپیں دھکیلنے ہوئے قریب تر لائے میں کامیاب ہو چکے تھے اور وہاں ایک گولہ سڑکی ڈگری برداشت دیا۔

علی کی طرف سے یہ جوابی گولہ تھا جو نٹانے پر لگا۔ اسے کئی فرنگیوں کے ناپاک وجود فضا میں اڑتے ہوئے نظر آئے۔ سپاہی علی کے اس بہترین نٹانے پر اس اٹ کر اٹھے۔ علی نے حملہ تیز کرنے کا حکم دے ڈالا اور ”سپاہیوں کو یہاں مقرر کرتے ہوئے ڈگری بتا کر وقفہ وقفے سے گولہ باری کرنے کی ہدایت کردی اور خود سنگین دار رائلز اور بارود کا تھیلہ سنبھالے دوسرے کپٹے کی طرف آیا۔ وہ سپاہی بے جگری سے دشمن سے نبرد آزما تھے۔

علی نے یہاں سے دو تین بارودی بم اچھالے، لیکن اس کی تشویش برقرار رہی۔ وہ بدستور میدان جنگ کے پانے کو فرنگیوں کے حق میں پلٹے دیکھ رہا تھا اور اس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ اسے ناگرہ کے سینا پتی موج سگھ پر سخت طیش آ رہا تھا جو اطمینان سے بیٹھا تھا مگر تھوڑی دیر بعد ہی اسے خوش گوار حیرت نے آن لیا جب اس نے جنوب مشرقی سمت سے آگے بڑھتی فرنگی افواج پر یکے بعد دیگرے گولہ باری ہوتے دیکھی۔ وہ سمجھ گیا کہ انھوں کی ہمت میں رہنے والے سینا پتی موج سگھ کو اب جا کے میدان جنگ کی صورت حال کا اندازہ ہوا تھا۔

”دیر آید درست آید۔“ علی نے زیر لب کہا۔

ناگرہ افواج کے صحیح معنوں میں حرکت میں آتے ہی اتحادی افوج کے بھی حوصلے بلند ہو گئے۔ علی نے بھی اپنی فوج کو بڑھ چڑھ کر دشمنوں پر دھاوا بولنے کا حکم جاری کر دیا۔ توپ خانہ اب اسی نے۔۔۔ سنبھال لیا تھا، تاہم اس نے پانچ ہاتھیوں پر سوار تیر اندازوں کو آگ کے تیر پھینکنے کا بھی حکم دے دیا۔

ذرا ہی دیر بعد آگے بڑھتی ہوئی دشمن افواج کی مملوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ بارہاں جا پہنچی جہاں سے علی تھی۔

یہ دیکھ کر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا، تاہم اس نے اب اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

یہی صورت حال جنوب مغربی سمت میں اتحادیوں کے نائب سالار اقبال خان کی تھی۔ اس نے دشمن کو پسپائی

اختیار کرتے دیکھ کر ان پر نہایت بے جگری سے تازہ توڑ حملے شروع کر دیے۔

ادھر متوقع فتح کو شکست میں بدلنے دیکھ کر بریگیڈیئر ڈان کیورشم بری طرح جھجھکا گیا۔ اس نے اپنے نائب میجر ڈی فارست کو اسی طرح حملہ جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود اپنے خیمے کا رخ کیا، جو اس نے اپنی فتح کو قریب محسوس کر کے خالی چھوڑ دیا تھا۔

وہاں آ کر اس نے ٹیلی فون کی چرخی گھمائی، مگر انداز۔۔۔ ٹیلی فون کا کارہ ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ عارضی طور پر بجھائی ہوئی لائنوں کو بھی نقصان پہنچا تھا، مگر کچھ بیٹھنے والا وہ بھی نہیں تھا۔ اس نے فوراً دو سپاہیوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر ”روٹ زبرد“ کی طرف روانہ کر دیا اور چند ہدایات بھی دیں۔

روٹ زبرد پر کرنل بلسر وڈ اپنی رجمنٹ کو لے کر پوزیشن سنبھال چکا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ اپنے نائب کپٹین رچرڈ کے ساتھ جتنی حکمت عملی پلان کر رہا تھا۔ ایک مقررہ حدود تک اپنی رجمنٹ سمیت ایڈوانس کرنے کے بعد وہ ٹھہر گیا تھا اور بریگیڈیئر ڈان کیورشم کے دو آدمی وہاں پہنچے۔

اسے چیف کمانڈر کی طرف سے انہیں حملے کی ہدایت مل گئی تھی لیکن کرنل بلسر وڈ کے مطابق ابھی وہ مطلوبہ مقام تک خاطر خواہ پیش قدمی نہیں کر پائے تھے۔ ڈان کیورشم کے پیچھے ہوئے گھڑسوار کا صد بھی ساتھ تھے۔ وہ حملے کے منتظر تھے تاکہ بریگیڈیئر ڈان کیورشم کی ہدایت کے مطابق وہاں جا کر اس حملے کی تصدیقی خبر اس کے گوش گزار کر سکیں۔

کرنل بلسر وڈ اپنی رجمنٹ کے ساتھ جس راستے سے گزر رہا تھا، وہ مذکورہ طور پر انتہائی دشوار گزار اور تنگ گھاٹیوں اور اندھی کھاٹیوں پر مشتمل تھا لیکن یہاں سے اگر انہیں اپنا مطلوبہ ہدف مل جاتا تو وہ کامیاب ہلا بولنے کی پوزیشن میں آ جاتے، لہذا کرنل بلسر وڈ کو اسی کا انتظار تھا۔ مگر ساتھ ہی اس کے ذہن پر ان دونوں تصدوں کی فکر بھی سوار ہو گئی تھی، جو ساتھ تھے۔

ایک مقام پر کرنل بلسر وڈ نے ایک عدر (سنگل لینس) دوربین آنکھ سے لگا کر دور سامنے کا جائزہ لیا تو اس کا دل فرط جوش سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ اپنی مطلوبہ منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے فی الفور اپنے فوجیوں کو حملے کے لیے پوزیشن تیار کرنے کا حکم دے دیا، یوں اب وہ اس کے آخری ٹیم کے منتظر تھے۔



## نہلے پہ دھلا

☆ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کب ہوتا ہے؟  
○ جب گوالے کی بھینس غلطی سے زیادہ پانی پی جائے۔  
☆ اگر آپ کو سلیمانی ٹوپی مل جائے تو.....؟  
○ بغیر لکیشن لڑے آسلی میں پہنچ جاؤں۔  
☆ اگر راتوں کو نیند نہ آئے اور دن کو چین نصیب نہ ہو تو کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟  
○ دماغی غلطی کی۔  
☆ کیا شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں؟  
○ بالکل..... اگر بکری شیر کے پیٹ میں ہو۔  
☆ محبوبہ اور بیوی میں کیا فرق ہے؟  
○ محبوبہ کو لاروں سے بہلایا جاسکتا ہے لیکن بیوی کو نہیں۔  
☆ آم کے آم اور مٹھلیوں کے دام کب وصول ہوتے ہیں؟  
○ اگر خوبصورت بیوی کے ساتھ ڈھیر سارا جیز بھی ہاتھ آئے۔  
☆ بھتی گڑگڑ میں ہاتھ کیسے دھوئے جاسکتے ہیں؟  
○ جب کسی مٹھلے کو ب سڑک جوتے پڑ رہے ہوں تو آپ بھی اپنا حصہ ڈال لیجیے۔  
مرسلہ۔ ریاضیٹ، حسن ابدال

## اعب

چٹا۔ ”ابا جان کار کی چالی دے دیں۔  
آج کان میں پارٹی ہے۔ 10 لاکھ کی کار میں جاؤں گا تو میرا رعب پڑے گا۔“  
باپ دس کا نوٹ پکڑاتے ہوئے۔ ”یہ لو..... میں لاکھ کی بس میں جاؤں گے تو زیادہ رعب پڑے گا۔“  
مرسلہ۔ جاوید اختر، رانا، پاکستان شریف

بھانڑیوں میں گر پڑا۔ دوسپاہیوں نے اسے بے دردی سے اٹاؤں، بکوں اور گھونٹوں سے مارنا پینٹنا شروع کر دیا۔  
شاہ زمان مہتا تھا، اس کے پاس کوئی ایسا موقع نہ تھا کہ وہ ان ظالم فرنگیوں کا مقابلہ کرتا۔ وہ اگر ایسا کرتا بھی تو اہل از وقت ہی کہلاتا، وہ انہیں اپنی طرف سے محتاط نہیں کرتا چاہتا تھا۔ گولہ خانی تک وہ انہیں بے وقوف بنانے کی اپنی سی کوشش کرتا چاہتا تھا۔  
جب مار کھا کر وہ بالکل نڈھال ہو گیا تو اسے دو لہجوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھالیا اور ایک طرف چل پڑے۔  
اب اس حشمتی دستے میں جیپ سے اترنے والے بھی پند فوجی شامل ہو گئے تھے۔  
یہ لوگ پیدل ہی پکٹے تک پہنچتے تھے۔ وہاں ایک بڑا سانیہرہ بنا ہوا تھا۔ ایک نبتا چھوٹا خیمہ بھی اس کے نفل میں نظر آ رہا تھا۔ نیم بے ہوش شاہ زمان کو اسی خیمے کے اندر لے جایا گیا اور اس کی شکلیں کس دی گئیں۔ باہر دوسرا پہرہ دار موجود رہے۔  
کافی دیر گزر گئی۔ شاہ زمان اپنے رکن بستہ وجود میں دردی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس کر رہا تھا، لیکن اسے اپنی تکلیف کی منطق پر داندھی۔ اریہ کی اسے زیادہ تشویش تھی۔ یہ خدشات ہی اس کے لیے سوہان روح بنے اسے تھے کہ اریہ دہری مصیبت کا شکار تھی۔ ایک یہ کہ وہ ٹرانٹ فوجی افسر اسے جانے کہاں لے گیا تھا اور دوسرے..... اریہ کو کچھوئے ڈس لیا تھا اور اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ جبکہ وہ خود یہاں بندھا اور بے بس پڑا تھا، وہ اریہ کی مدد کرنے سے بھی قاصر تھا۔  
یوں لمحہ بہ لمحہ اس کی بے چینی فزوں تر ہونے لگی۔ اریہ کو خود سے دور اور تشویشناک حالت میں پا کر اسے کسی لمحے میں نہیں آ رہا تھا۔ دل و دماغ جیسے سرخ آنسو جیوں کی لہر میں تھے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے جذباتیت ترک کرنے کی کوشش کی اور اس کے اندر کاروائی گور پلا، انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اسے اور اک ہوا کہ وہ ایک جنگجو جاہد ہے۔ ایک گور پلا ہے جو ہر قسم کے نازک حالات میں بھی اپنے حواس بحال رکھتا ہے اور اس کی توجہ کامرکز صرف اپنا مقیم کاڑھوتا ہے۔  
کافی وقت بیت چلا۔ کسی موٹر گاڑی کی آواز ابھری اور ساتھ ہی تیز روشنی خیمے کی دیواروں پر پڑی اور ہٹ گئی۔ شاہ زمان چونکا۔ تھوڑی دیر اور گزری تو خیمے کے اندر تین

سے لگا لی۔  
وہ یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا کہ راج محل کے اندر سے روشنیوں کے بجائے دھوئیں کی سیاہ کلیں کب اٹھتے دیکھے گا۔ پھر اسے دونوں ہی چیزیں نظر آ گئیں۔ روشنی بھی اور دھوئیں کی کلیں بھی۔  
پہلے وہ یہی سمجھا کہ دونوں نشانے خطا گئے، لیکن ایک حد تک اگرچہ ایسا بھی تھا، ایک گولہ تو راج محل کی جنوبی فصیل سے چند فٹ لگات لگات کے فاصلے پر باہر جنگل میں کہیں گرا تھا جبکہ دوسرا گولہ بہ مشکل فصیل تک پہنچ پایا تھا، وہ اندر تو نہیں گرا تھا مگر اسے فصیل کی منڈیر پر تباہی ضرور مچا دی تھی۔  
جس توپ کا گولہ قدرے نشانے پر لگا تھا، اسی توپچی کو بلسر وڈ نے فوری طور پر ایک ڈگری بڑھا کر دوسرا گولہ داغنے کا حکم دے ڈالا۔  
گولہ داغ گیا۔ کرنل نے دوبارہ اپنی آنکھ سے دور بین لگا لی۔ گولہ دھوئیں کی کلیہ چھوڑتا ہوا فصیل پار کر گیا اور ایک دھماکے سے اندر نہیں گرا تھا۔  
”گریٹ.....“ کرنل بلسر وڈ نے ایک ہاتھ کامکا بلند کر کے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔  
☆☆☆  
اریہ کی حالت بدستور غیر تھی۔ اس کا پورا جسم سینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ کانے جانے والی جگہ پر ہی نہیں اب اس کا پورا وجود درد اور تپ سے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ پچھو کا ڈنک یوں ہی تڑپا تڑپا کر مارتا ہے اور اریہ تڑپ رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی وہ درد و تکلیف سے کرا رہی تھی۔  
شاہ زمان اس سنگ دل انگریز کمانڈر کی منتیں کرتا رہ گیا تھا، اسی دوران جو بغیر ہڈ والی جیپ ان کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے اندر سے چار پانچ.....  
فوجی کدکڑے مار کھینچے اترے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ایک نے فوراً اس دروازہ قامت گورے کے آگے آ کر سیلیٹ کیا اور پھر دونوں میں کسی بات پر مختصر تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد نیم بے ہوش اور نڈھال اریہ کو دو فوجی سنبھالے ہوئے جیپ میں سوار ہوئے اور وہ دروازہ قامت کمانڈر بھی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھ گیا۔  
”گگ.....“ کہاں لے جا رہے ہو اسے..... رکو.....“  
شاہ زمان چلا یا۔ اسی وقت ایک فوجی نے شاہ زمان کے چہرے پر عین دار لٹکل کا کندہ سید کر دیا۔ شاہ زمان کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ خارج ہوئی اور وہ الٹ کر

کرنل بلسر وڈ کی کوبیاں سے دور دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان سے راج محل کی جنوبی فصیل کی ایک دیوار صاف نظر آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس فصیل کی بیرونی سمت پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر بکھرے ہوئے ہر دروارے باقی ماندہ بکھرے ہوئے جنگل سے خوف بھی آتا تھا کہ وہاں راجا پر تاب کمار کی فوج نہ گھات لگائے بیٹھی ہو۔  
”مشر بلسر وڈ! امیر اخیال ہے کہ سب سے پہلے ایک ساتھ دو گولے ان سرسبز ڈھلوانوں پر دانے جائیں۔“ اس کے نائب کیپٹن رچرڈ نے بلسر وڈ کا تذبذب بھانپتے ہوئے مشورہ دیا۔  
”اگر راجا کی فوج یہاں گھات لگائے بیٹھی ہوگی تو افراتفری کا شکار ہو کر ظاہر ہو جائے گی۔ پھر ہم مزید پیش قدمی کرتے ہوئے قلعے (راج محل) پر بے آسانی ہلا بول سکتے ہیں۔“  
کرنل بلسر وڈ نے غور کرنے والے انداز میں اپنے نائب کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔  
”لیکن..... اگر راجا کی فوج یہاں چھپی ہوئی نہ ملی تو ہمارے دوستی گولے نہ صرف ضائع چلے جائیں گے بلکہ ممکن ہے فصیل کی جانب سے ہم پر حملہ بھی کر دیا جائے۔ یوں دوبارہ ہم راج محل پر گولے داغنے کی پوزیشن کھودیں گے۔“  
کیپٹن رچرڈ خاموش ہو گیا۔ کرنل کو اپنا جواب مل گیا تھا۔ یوں بھی اس کے تیزی سے سوچنے ذہن میں اپنے چیف کمانڈر کی ہدایات گونج رہی تھیں.....  
”کرنل بلسر وڈ! اس جنگ میں سب سے زیادہ اہمیت تمہاری رہنمائی کی ہے، جو نہ صرف جنگ کا پانسا پلٹ سکتی ہے بلکہ اسے نتیجہ خیز بھی بنا سکتی ہے۔ تمہارا راستہ دشوار گزار ضرور ہے مگر اس کی منزل ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔“  
لہذا کرنل بلسر وڈ نے اسی وقت اپنی فوج کو خبردار کیا اور توپچیوں کو حکم دیا کہ دونوں توپیں ایک مقام پر ایڈوانس کر کے کھڑی کر دی جائیں اور بیک وقت دو گولے داغنے جائیں۔  
اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ جب توپیں آگ اگنے کے لیے بالکل تیار تھیں تو اس کے حکم کا انتظار کیا جانے لگا۔ بلسر وڈ نے ”فائر“ کہا۔ ٹھیک اسی وقت تلے اوپر دو دھماکے ہوئے۔ آٹھ اور دس پونڈ کے دو گولے شعلے اڑاتے ہوئے عمودی سفر پر روانہ ہوئے۔ ٹھیک نشانہ دیکھنے کے لیے بلسر وڈ نے وہی یک عدد سے والی دور بین اپنی ایک آنکھ



اسرار اور اس کا ایک کوئی دروازہ تھا، دوسرا چب سوار تھا، جو اسے یہاں لایا تھا، جبکہ تیسرا ان کا کوئی سامنی تھا۔

گورا کمانڈر چند تائے تک بڑی خشکیوں نظروں سے اس کی طرف گھورتا رہا پھر درستی سے بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”راجہ“

”شاہ زمان نے وہی نام بتایا جو اس کے اور اربہ کے بیچ لے لیا تھا، تاکہ ان دونوں سے الگ الگ پوچھا جا سکیں تو ان کا جواب ایک ہی ہو۔

”پورا نام بتاؤ؟“

”تھکماندر دشتی سے پوچھا گیا۔

”راجہ کمار“

”کام کیا کرتے ہو؟“

”مائی گیری کرتے ہیں، مچھلیاں پکڑتے ہیں صاحب!“

”شاہ زمان نے اپنا لہجہ معتدل مگر حقوڑا اختیار کئے ہوئے جواب دیا۔ کیونکہ اب انداز بدلنا اس خراٹ گورے فوجی کو کسی تشکیک میں مبتلا کر سکتا تھا۔

”تمہاری سامنی کا نام؟“

”وہ میری بھتیجی ہے جناب! کپتان نام ہے اس کا۔“

شاہ زمان نے فوراً جواب دیا۔ اس کے دل و دماغ میں اربہ سے متعلق یہی پہلے پہلی ہوئی تھی کہ اس گورے نے اسی مقصد کے لیے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا تاکہ ان سے پوچھنے والے سوالات کی مماثلت کو جانچ سکے۔ کیونکہ یہ بات ممکن تھی کہ اس نے اربہ کو ہوش میں لا کر ایسے چند سوالات اس سے بھی پوچھے ہوں۔

”یہاں اس جزیرے میں کیا کرنے آئے تھے تم دونوں؟“

”قد آور گورے نے پوچھا۔

”بتایا تھا آپ کو کہ ہماری مشقی ٹوٹ گئی تھی۔“

شاہ زمان نے بھی مصلحتاً مختصر جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاہم پھر فوراً ہی منت بھرے لہجے میں بولا۔

”صاحب! میری بھتیجی کہاں ہے؟ وہ کبھی ہے؟

”مجھے اس کی چٹا کھائے جاری ہے۔ میرا دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں، اس کے بغیر میرا جیون ویران ہو جائے گا صاحب!“

”بکواس بند کرو اپنی.....“

گورے کمانڈر نے درستی سے اسے ڈنپا۔ ”وہ ٹھیک ہے اور اس کا علاج کر دیا گیا ہے۔“

شاہ زمان نے یہ سنا تو اس کے اندر مسرت کی لہر چمکی۔ وہ دن بستہ ہونے کے باوجود اپنے جسم کو احسان مندانہ انداز میں حقوڑا اٹھ دیتے ہوئے بولا۔

”بڑی مہربانی آپ کی، بڑے دیا لو ہیں آپ سرکار..... میں اور کیا کہوں؟“

شاہ زمان کے جوابات اور اس کے انداز کو دیکھ کر گورے کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن کے تاثرات ابھرنے لگے تھے جسے شاہ زمان کی بھانپتی ہوئی عقابلی نظروں نے فوراً ڈال دیا تھا۔

”تم مائی گیری کرتے ہو یا جاسوسی؟“

گورے نے اس بار طنزیہ پوچھا۔

”میں..... صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہو آپ؟

میں اور کلینا تو ایک غریب جیدی پشتی مائی گیری ہیں، منشی بھی کرائے کی تھی۔ پہلے ہی ہم پر اتنا قرضہ چڑھ گیا یا پشتی بھی.....“

”رہے کہاں ہو؟“

”ہوڑہندی کے کنارے، ٹھیکروں کی پوروائی (بستی) میں۔“

”تم اگر جاسوس نہیں ہو تو پھر ہمارے سپاہیوں پر حملہ کیوں کیا تھا؟“

اس بار جیب میں لانے والے نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا۔

”معاف کر دیں سرکار!“

شاہ زمان نے اسی انداز میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”بات اپنی عورت کی ہو تو کون نہیں پھر جاتا، لیکن پھر مجھے آپ لوگوں نے مارا یہاں بھی تو ہے۔ پورا شیر دھڑکا رہا ہے میرا دودھ.....“

وہ آخر میں دانستہ کر رہا۔

”ہوں.....!“

فرنگی گورے نے ایک ہمارا بھری اور بولا۔

”ہم ہوڑہ بستی سے تم دونوں کے بارے میں پتا کریں گے۔ اگر تمہاری بات جھوٹی ثابت ہوئی تو تم اور تمہاری بھتیجی ہمیشہ کے لیے قیدی بنا دیے جاؤ گے، ورنہ رہا ہو جاؤ گے۔“

”سرکار! میں اور میری بھتیجی بے قصور ہیں۔“

شاہ زمان بولا۔ ”میری بھتیجی بہت نازک دل کی ہے، وہ میرے بغیر مر جائے گی۔ آپ پوری تسلی کریں مگر اسے یہاں میرے پاس.....“

”بکواس بند کرو اپنی.....“

کمانڈر نے اس کی بات کاٹ کر اسے جھڑکا اور اپنے ساتھ کھڑے ماتحت سے بولا۔

”اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ میں کل میج کپٹن صاحب سے بات کرتا ہوں، پھر ان دونوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔“

ماتحت نے اپنے سرکواشت میں جنبش دی تھی۔

وہ تینوں خیمے سے نکل گئے۔ شاہ زمان سوچتا رہا گیا۔ وقت گزرنے لگا۔ شاہ زمان کو اربہ سے متعلق یہ سن کر کچھ تسلی تو ہوئی تھی کہ وہ خیریت سے تھی اور اسے ہوش بھی آج کا تھا مگر فکر و تشویش اپنی جگہ موجود تھی کہ وہ ہنوز اس کی نظروں سے دور تھی اور وہ بھی یقیناً اس کے لیے اتنی ہی پریشان ہو رہی ہوگی۔

شاہ زمان کو انگریز کمانڈر سے باتیں کرتے ہوئے اتنا اندازہ تو ہو چلا تھا کہ وہ اس سے قدرے مطمئن ہوا ہے مگر پوری طرح نہیں، اگر اس نے ہوڑہندی کے کنارے آباد مائی گیریوں کی بستی سے ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو ان کی اصلیت آشکار ہو جائے گی، پھر ان دونوں کو یہ قول اس گورے کمانڈر کے، کپٹن جیمس کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ ان کا فیصلہ کرے گا۔ لہذا شاہ زمان اسے حقوڑی سی مہلت سمجھے ہوئے تھا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

فوجیوں کی مارنے اس کا بدن دکھا دیا تھا۔ اس نے قوت ارادی کا مظاہرہ کیا اور حوصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنے بکڑ بندوں..... پر پیچم زور آزمائی شروع کر دی۔

وہ ایک گوریلہ تھا اور اسے ہر قسم کی ٹریننگ دی گئی تھی، اس نے ایک خاص تکنیک سے اپنے ہاتھوں اور اکیوں کو حرکت دینا شروع کر دی تھی۔ اس طرح بکڑ بند اپنے نرم اور پھڑپھڑانے پرانے کے بعد انہیں حقوڑی مزید کوشش سے کھولا جاسکتا تھا اور وہ یہی کر رہا تھا۔

اسی ”کوشش“ میں اسے صبح ہو گئی۔ اسے خیمے کی دیواروں پر روشنی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسی وقت ایک سایہ ابھرا۔ شاہ زمان اپنی ”کوشش“ میں تھک کر چور ہونے لگا تھا، یوں اس نے کسی کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کوشش ترک کر دی۔

اسی وقت پردہ ہٹا اور ایک گوراسپاہی اندر داخل ہوا۔ وہ اس کے لیے کچھ کھانے پینے کو لایا تھا۔ اس نے قریب آ کر کھانا اس کے سامنے رکھ دیا، جو ایک بوسیدہ سی ٹرے میں تھا اور اس میں ایلے ہوئے چاول اور اس پر نجانے کیا ڈال رکھا تھا۔ پانی کا ایک گلاس بھی تھا۔

”سرکار! کیا آپ بتا سکتے ہو میری بھتیجی کپٹن اب کس حال میں ہے؟“

شاہ زمان نے اپنی آواز میں لاجت ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کے سینے میں پہلے ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے بکڑ بند کھول چکا تھا۔ اب بس ایک آخری گرہ باقی رہ گئی تھی جس کے لیے وہ

غیر محسوس انداز میں اپنی ”کوشش“ کی دوبارہ ابتدا کر چکا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اندر آنے والا یہ گوراسپاہی کیا تھا اور اس کے کندھے سے عکسین دار رفلکس بھی بھول رہی تھی۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر ”چھانے“ کے چکر میں تھا۔

اس کی بات سن کر وہ گوراسپاہی مکیٹکی سے مسکراتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا۔

”نمارا اائف بہوت شاندار اور کھوبصورت ہے، ہمارے افسر کمانڈر نے رینالڈ کا کھوب دل بہلائے گا وہ اور ہو سکتا ہے غم کوور ہائی بھی مل جائے۔“

اس گورے سپاہی کی اس یادہ گوئی نے شاہ زمان کا دماغ التاد یا لہذا یہ سننے ہی غیظ و غضب کا ایک طوفانی گولا سا شاہ زمان کے سینے میں اٹھا..... تب تک وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے بھیڑیے سے مشابہت گراہٹ سی اپنے حلق سے خارج کرتا ہوا وہ اس پر کسی جیتے کی طرح چھینا تھا کہ گورے سپاہی کو ایک ذرا سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

شاہ زمان کی اگرچہ ابھی تک دونوں ٹانگیں بندھی ہوئی تھیں لیکن، وہ انہی کے بل پر مخصوص انداز میں اچھل کر اس پر پڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے خیمے میں اس فرنگی سپاہی کی گردن آگئی اور پھر شاہ زمان جوش جنوں خیزی میں اسے دبا تا ہی چلا گیا۔

اس کے آہنی خیمے میں گورے سپاہی کی گردن چند لمحے پھنسی رہی اور وہ فریخ ہونے والے جانور کی طرح اپنے حلق سے خرخرات کی کھٹی کھٹی آوازیں نکالتا رہا، اس کے بعد ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

شاہ زمان نے اپنے اندر کا سارا غیظ اسے پلے کے پلے موت کی وادی میں وکیل کر نکالا تھا اور پھر اس خبیث کے جہنم واصل ہوتے ہی اس نے اس کی گن پر قبضہ جما لیا، اس کی مزید تلاشی لینے پر پٹنڈلی سے بندھی ہوئی قروٹی بھی نیا سمیت نکال لی، لیکن اس سے پہلے اس نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے دونوں بیروں کے بکڑ بند بھی کھول دیے تھے، اس سے پہلے کہ کوئی اندر آتا۔ شاہ زمان دبے پاؤں خیمے کے چھوٹے ہوئے پردے کی جانب بڑھا۔ ذرا پردہ کھسکا کر اس نے باہر جھانکا۔

صبح کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی تھی اور اسے پکے کی طرف صرف دو فرنگی سپاہی کھڑے نظر آئے۔ وہ کسی برتن سے پانی نکال کر منہ دھوئے اور کلیاں کرنے میں مصروف تھے۔

شاہ زمان نہایت احتیاط اور چابک دستی کے ساتھ



سوال کیا۔

جو نیر افسر لے سکتا تھا۔ وہ بھی ایسا جو نیر افسر جس کی شادی بھی نئی تھی ہوئی ہو اور مزید برآں بیوی بھی ساتھ ہو۔  
شاہ زمان نے یہ ساری باتیں غور سے سننے کے بعد اپنے ذہن میں رکھی تھیں۔

شاہ زمان یہ ساری باتیں سوچتا اور غور کرتا ہوا دوبارہ پکے میں داخل ہوا۔ پکے میں اس نے کچھ دقتی ہم، رائفلیں اور تھوڑی بہت تعداد میں بارود پڑا دیکھا۔ اس نے دو تین دقتی بموں کی باتیں سمجھ کر ان پر چیک دیے اور خود تیزی سے دوڑتا ہوا پکے سے دور چلا گیا۔

اس کے عقب میں ساعت شکن دھماکا ہوا اور سارا پکنا ہی شعلوں کی زد میں آ گیا۔ شاہ زمان یہاں افراتفری پھیلا دینا چاہتا تھا۔ اس نے اب اپنی شرٹ اتار چمکی تھی۔ تو اتنا جسم اب برہنہ تھا، فقط نیچے چست چٹون تھی اور اس کے بیٹ میں لگے ہوئے تین عدد دقتی بم، فاضل کو یوں کی بیٹی اور رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ تیزی سے مطلوبہ سمت کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ ایک جذبہ دل تھا، ایک جوش تھا جس نے شوکی کو دراندہ وار یہ قدم اٹھانے کے لیے اکسایا تھا۔ اسی سبب اس نے گارٹیا اور رابرٹ کے مشوروں کو بھی لائق اعتنا نہیں جانا تھا۔ شوکی حالات کی نزاکت کا ادراک کر چکا تھا، جانتا تھا کہ مشورے اور مدد لینے میں بہت دیر ہو جائے گی۔

رینا کی ذکیت یا بارہن کے ہتھے نہیں چڑھی تھی، اسے کالی کے مندر کے خطرناک اور وحشی، شیطان بچاری بدری تاجھ کے چیلے اٹھا کر لے گئے تھے اور جن کے ناپاک مقاصد بہت بھیا تک ہو سکتے تھے۔

گارٹیا اور رابرٹ راج محل سے مدد لینا چاہتے تھے جبکہ شوکی انہیں پہلے بھی آزمایا تھا۔ اس کے خیال میں وہ ان شیطان بچاریوں کے کالے کرکوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ لہذا ان شیطان بچاریوں کے مقابلے میں خود ہی میدان میں آنا زیادہ بہتر ہو سکتا تھا، اسی لیے شوکی نے سیدھا اسی طرف کارخ کیا تھا اور تنہا بھی تھا۔ وہ نہتا نہیں تھا۔

وقت اور حالات، پھر رابرٹ کی کج ادائیگیوں اور غاصبوں نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس کے پاس ڈرائیور احمد خان کا پستول تھا۔ اگرچہ وہ احمد خان کا بھی نہ تھا، اس نے بھی ابتدا میں ساتھ آنے والے جنرل مانگیل شاہ کے ایک فرنگی سپاہی کی لاش سے حاصل کیا تھا جس کا اسی ہم میں

”بھارتی“ ہاک کے بارے میں .....؟ وہ کب اس جزیرے سے روانہ ہونے والا تھا یا پھر کیپٹن جیس کے لگانے کے بارے میں پوچھتا۔ ممکن تھا وہ سپاہی اسے یہاں اس جزیرے میں دیگر فوجیوں کی نفری کے حوالے سے بھی کچھ بتا سکتا تھا۔

اسے بہر حال اپنے عظیم مشن کو اپنے محبوب و اپنی بہت سے مقدم رکھنا چاہیے تھا۔ بلکہ اس کا تو خود ار یہی ہے کہ اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ کبھی اگر ایک طرف اس کے مشن کی کامیابی اور دوسری جانب ار یہی کہ زندگی ہو تو اسے یہ دونوں دو چارے مشن کو ترجیح دینا تھی، تو کیا وہ ار یہی ہے کہ وہ وعدہ خلافی کا مرتکب ہوا تھا؟ وہ جیسے پانوں میں جھول کر رہ گیا۔ ایک دہرائے پر آن کھڑا ہوا، یوں جیسے وہ نچھاور میں ہو۔

پھر جلد ہی اس کے اندر ایک عداوت غیب ابھری۔ ”ہرگز غلط نہیں کیا تم نے شاہ زمان! ار یہی تمہاری بہت سی باتیں تھیں کہ میں ایک بھادر اور دلیر سپاہی بھی تو ہے۔ اس کی حیثیت اب مجھ پر ہی نہیں، ایک مددگار بھادہ کی بھی اختیار کر چکی ہے۔ ایسا اس نے ثابت بھی کیا ہے کہ وہ پہلے ایک بھادہ ہے اور پھر تمہاری محبوبہ۔ لہذا اس کی جان بچانا تمہارا فرض ہے۔“

واپس جہنم سپاہی کے ذریعے ار یہی کو اٹھانے والے اسر کا نام رینالڈ پتا لگا تھا۔ دوسرا سارجنٹ گریگ تھا۔ آخری فوجی نے ان دونوں کے بارے میں اسے یہ بھی بتایا تھا کہ کمانڈر رینالڈ درحقیقت کرنل اینڈرسن کا ہی نائب ہے اور اسے ہی اپنا افسر سمجھتا ہے۔ جبکہ اب اس کی جگہ نئے آنے والے افسر کیپٹن جیس کو اپنا افسر ہی نہیں مانتا، تاہم وہ اس کے احکامات ماننے کا بہر حال پابند تھا، لیکن سارجنٹ گریگ کیپٹن جیس کا آدمی تھا۔

کمانڈر رینالڈ اپنے افسر کرنل اینڈرسن ہی کی طرح ایک ظالم اور بے حد سفاک انسان تھا۔ ار یہی کو وہی اپنے لگانے پر لے گیا تھا۔ نیز وہ یہاں کے کئی اہم منصوبوں کے بارے میں پوری جان کاری رکھتا تھا جو کیپٹن جیس کے بھی علم میں نہ تھی، وہ صرف کرنل اینڈرسن کو ہی علم تھا۔

کمانڈر رینالڈ، یہ قول مذکورہ فوجی کے، وہ منصوبے کیپٹن جیس کے بھی علم میں لانا ضروری نہ سمجھتا تھا، وہ بس کیپٹن جیس کو ایک مجبوری کی بنا پر برداشت کیے ہوئے تھا، اس کا نہیں خیال تھا کہ کرنل اینڈرسن کی جگہ یہ نیا اور

اس طرح کہ ایک تو زمان نے اسے اس کی رائفل سے محروم کر دیا، دوسرے اسے آسانی سے دیوچے اور بے بس کیے ہوئے پکے کے اندر گھسٹ لایا۔  
”میرے سر پر اس وقت خون سوا ہے فرنگی کتے.....!“ شاہ زمان نے شیرجی غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

”مجھے میری ساتھی کا پتا بتا..... ورنہ کتے کی موت ماروں گا، تڑپاؤ تاکر..... بول تیرے اس سفید سورا کمانڈر رینالڈ نے میری ساتھی کو کہاں پر غماں بنا کر رکھا ہے؟“  
فرنگی سپاہی پر شاہ زمان کے لیے اور اس کے غیظ و غضب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یوں وہ کچھ فطرتاً ہی تھوڑا لاجمی ثابت ہوا۔ گھٹکائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”وہ..... وہ اسے کیپ فور میں لے گیا ہے۔“  
”کیپ فور کس طرف ہے؟“ شاہ زمان اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کے آہنی گھٹنے کو ٹھک کرتے ہوئے پھر غراٹو تو فرنگی سپاہی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز خارج ہونے لگی۔ شاہ زمان کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ جوش جنوں خیزی میں اس کا زخرا ہی دیوچ ڈالنے والا تھا۔ اس نے ذرا گرفت ڈھیلی کی مگر چھوڑ نہیں۔

”جھوٹ بولنے سے پہلے یاد رکھنا کہ میں تجھے بھی تصدیق کی خاطر اس مقام تک گھسٹا ہوا لے جاؤں گا اور پھر دیکھنا اپنا حشر جھوٹ بولنے کا۔“

یہ تہدید بھی کارگر ثابت ہوئی، وہ فر فر بتانے لگا۔ یہ سب اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد شاہ زمان نے اس کی گردن کو جھکادے ڈالا۔ ”ہن!“ سے مشابہ آواز اس انگریز سپاہی کے منہ سے برآمد ہوئی اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

یہ تھوڑا فرنگی سپاہی بھی ان میں شامل تھا جنہوں نے ار یہی کو بے دردی سے گھسٹا تھا۔ اسی لیے شاہ زمان نے اسے زندہ نہیں چھوڑا تھا، یوں بھی اس کے دل میں ہر فرنگی کے لیے ایسی ہی نفرت جاگزیں رہی تھی۔ یہ خاور حیات اور اس کے جری ساتھیوں کے قاتل بھی تو تھے۔

ایک ایسی شاہ زمان کو احساس ہوا کہ وہ ار یہی کی محبت میں اپنے عظیم کاذو کو فراموش کر رہا ہے..... اسے شاید اس فرنگی کو اپنی جلدی بالکینہ نہ کرنا چاہیے تھا۔ مشن سے متعلق کچھ اور بھی اس سے اٹھوانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ یہ سوچ کر شاہ زمان کے اندر کسک سی جاگی۔

”مثلاً..... اسے کیا پوچھنا چاہیے تھا؟“ اس نے خود

باہر نکلا اور خیمے کی ”چادری“ دیوار سے لگے، ان دونوں پر نگاہ رکھے، وہ خیمے کے عقب میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ ان دونوں پر ایک تو حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ گیا دوسرے اسے پکے کے اندر کا بھی نظارہ صاف نظر آ گیا۔

وہ پہلے بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے اندر کتنے فرنگی ہو سکتے تھے۔ اندر اسے ایک کو نلے والے کھلے گوشے میں صرف ایک ہی آدمی دکھائی دیا جو چوہے..... کے سامنے بیٹھا چائے یا کافی کی کپتلی آگ پر چڑھائے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ جب بھی نہیں تھی، صاف ظاہر تھا کہ ان کا کمانڈر اپنے نائب کے ساتھ نہیں گیا ہوا تھا۔

گو یا موقع غنیمت ہی نہیں اچھا سمجھتا تھا۔ تب ہی شاہ زمان نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ان دونوں پر بلا بول دیا۔ ایک کی پشت میں رائفل کی گتھیں گھونپ دی جبکہ دوسرے کی پشت پر اس زور سے لات رسیدی کہ اس کی ریزہ کی ہڈی تک مل گئی، کیونکہ وہ پکے کی گارے مٹی والی دیوار سے ٹکرا کر گرا تو اسے اٹھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی، حالانکہ وہ اپنی طرف سے بڑی پھرتی اور ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر شاہ زمان کو اس پر آخری اور کاری وار کرنے کے لیے اتنی مہلت ہی بہت تھی۔

پہلے والے کی پشت سے رائفل کی گتھیں نکال کر اس نے وہ گرے ہوئے دوسرے فرنگی کے پیٹ میں بھونک دی۔ وہ بھی اپنے پہلے والے ساتھی کی طرح ہل کے ہل ڈھیر ہو گیا۔

اس کھڑ بڑے ان کے تیسرے ساتھی کا چوٹک جانا لازمی امر تھا جس کا شاہ زمان پہلے ہی سے ادراک کیے ہوئے تھا۔ اس نے پکے کے اندر داخل ہونے کی بے وقوفانہ جلد بازی سے کام لینے کے بجائے اس کے باہر آنے کا انتظار کیا اور منڈیر کی مختصر آڑ سے اندر اس کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے جھانکا بھی۔

حسب توقع تیسرا ساتھی چو کنا انداز میں اپنی رائفل سنبالے اسی طرف آ رہا تھا۔

شاہ زمان جانتا تھا جب تک وہ باہر آ کر معاملے کی سن گمن نہیں لے لیتا، مدد کے لیے ہوائی فائر نہیں کر سکتا تھا اور وہی ہوا، وہ جیسے ہی باہر آیا تب شاہ زمان چو کنا جیتے کی طرح منڈیر پر چڑھا اور چپکے چپکے اس کی جانب گھسٹا ہوا اس کے سر پر پڑ گیا۔ اس کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس تب ہوا جب شاہ زمان نے شکاری جیتے کی طرح اس پر جھپٹا مارا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دیوچے زمین پر آ رہا مگر



## دھوکے بازوں کے آئینے میں روپ بدلنے مکاروں کا دلچسپ قصہ

ایک سے بڑھ کر ایک اس دنیا میں شاپکار ہے... وہ جو خود ایک شاپکار تھی تصویر کے روپ میں ایک اور شاپکار کا سودا کرنے نکلی مگر اسے کیا خبر تھی کہ بازار میں اسے شکاری ملیں گے... لیکن اس شکاری کو بھی تو کوئی احساس نہ ہو سکا تھا کہ یہ شاپکار خود کتنا بڑا شکاری ہے۔

## نیلے پہلے

زبیر حسین



جانچا اور کچھ نے دکان کے اندر آنے کی جرأت بھی کی لیکن اس کے باوجود اس پورے ہفتے اس کے سیل ریکارڈ پر صرف ایک تصویر درج تھی۔ یہ بہت پریشان کن صورت حال تھی۔ بھی ایک بوڑھی عورت اندر چلی آئی۔ جانے کیوں اسی وقت وہ سمجھ

و کٹر فلیٹ وڈ... فن مصوری کو اتنا جانتا تھا جتنا ایک لاکار تو وہی ہوا۔ چاروں پجاری جارحانہ انداز میں ایک بیک حرکت میں آئے۔ اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا فضا میں ابھرا تھا۔ (جاری ہے)

ظہر اس پر پڑ جانی تو معاملہ اس سے زیادہ بھی خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ شوکی کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کے ہاتھوں ایک سے زیادہ پجاری جہنم واصل ہو سکتے تھے۔

وہ ابھی عقی دروازے سے مندر کے اندر نہایت خاموشی سے داخل ہونے کے لیے پرتو لے ہوئے تھا کہ اچانک اس کے سامنے دائیں بائیں کی خود رو جھانپوں میں سے دو پجاری نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ترشول اور ستان نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑی خشک نظروں سے اسے گھورنے لگے، جبکہ شوکی انہیں دیکھتے ہی ٹھنک کر رک گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ دونوں مکار اور بد معاش پجاری اس کی گھات میں ہی بیٹھے ہوں گے۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کے عقب سے ایک غصیلی اور نفرت خیز آواز ابھری۔

”تم نے یہاں آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے ملے...!“

شوکی اس جانی بچانی آواز کو کن کرتیزی سے پلٹا تو دنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے دو پجاری اور چوکس کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ترشول اور قروایاں دلی ہوئی تھیں۔

یہ ظاہر شوکی ان چاروں بد معاشوں کے نرغے میں آ گیا تھا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور... تیزی سے چاقو اپنے دوسرے ہاتھ میں قفل کیا اور شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔

”ہاہا... ہاہا... ان کھلونوں سے ہمیں مت ڈراؤ چھو کرے! ہلے پاس اس سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار ہیں۔“ ایک پجاری نے بدست اور پر غرور قبضہ اپنے حلق سے خارج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

شوکی نے پستول کی نال انہی کی طرف کر رکھی تھی، لیکن اب بھی وہ خاطر خواہ پوزیشن میں نہیں آ سکا تھا کیونکہ اگر بیک وقت یہ چاروں بد معاش پجاری اس پر حملہ کر دیتے، جیسا کہ آج بھی کچھ یہی نظر آ رہے تھے، تو شوکی کے لیے مشکل ہو جاتی۔

”میں رینا کو لینے آیا ہوں... شرافت سے اسے میرے حوالے کر دو۔“

شوکی نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں لکارا تو وہی ہوا۔ چاروں پجاری جارحانہ انداز میں ایک بیک حرکت میں آئے۔

اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا فضا میں ابھرا تھا۔ (جاری ہے)

صرف چار گولیاں تھیں۔ ایک شکاری چاقو بھی تھا۔ شوکی نے دل میں پورا تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس کے سامنے بڑا پجاری بدی تھا تو بھی آگیا تو وہ اسے بھی گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ شوکی کو آج تک پروفیسر ہنری برنارڈ جیسے شفیق انسان کی ان رذیل شیطان پجاریوں کے ہاتھوں ہلاکت کا بہت دکھ تھا۔

شوکی ”خیرا“ دیکھنا جانتا تھا، وہ اسی نشانوں پر جیسے گھنے جنگل کے درمیان سے آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس کا جوش اور جذبہ نفوس تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کا یقین کی حد تک شہر درست تھا ہیروں کے وہ مشتبہ نشانات کالی کے مندر کی طرف ہی جا رہے تھے۔

شوکی راستے پھر اپنے گرد و پیش سے غماظ بھی تھا۔ کیا خبر ان کا کوئی سانس بھی گھات لگائے بیٹھا ہو۔ دوسرے اسے ان سانپوں کا بھی ڈر تھا لیکن آج شوکی بری طرح پھر اہوا تھا۔ اسے زہریلے سانپوں کی بھی پروا نہیں تھی، جو ہما پجاری کے اشاروں پر ناپتے تھے۔

وہ جلد ہی کالی کے مندر کے قریب پہنچ گیا۔ مشکوک قدموں کے نشانات اسے مندر کے اندر ہی جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔

اس نے وہاں رک کر مندر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں اسے غیر معمولی سناٹا ہی محسوس ہوا۔ اس کا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ کے نیچے اور پتلون کی بیلٹ میں پستول اڑس لیا اور اب اس کے ایک ہاتھ میں شکاری چاقو نظر آ رہا تھا۔

وہ اب دبے پاؤں مندر کے داخلی دروازے کے بجائے اس کی عقی سمت کی جانب نہایت احتیاط کے ساتھ سرکنے لگا۔ تب ہی اسے مندر کے داخلی دروازے سے دو پجاری گیر وے رنگ کے لبادوں میں باہر آتے نظر آئے مگر وہ پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

مندر کی پچھلی عمارت خاصی سائنوورہ نظر آتی تھی، جیسے برسوں سے کسی نے یہاں کی تعمیری مرمت ہی کروانا چھوڑ رکھی ہو۔

اس نے یہاں بھی گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ راستہ صاف پاکر وہ مندر کے عقی دروازے کو کسی طرح کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، ایک خندہ اس کے دل و دماغ میں یہ بھی ابھرا تھا کہ... اگر کسی چیلے کی







یقیناً کچھ کرے گا۔

☆☆☆

نام ہولی پرانی چیزوں کو بیچنے اور خریدنے کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے پاس بے شمار قسم کے فرنیچر، پرانے برتن، ٹیلی فون، پیٹنٹنگز، پرانی کتابیں اور کئی قسم کے آلات موجود تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہی اس نے ریسیور اٹھالیا۔ "نام ہولی بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں آپ کی کیا درخواست کروں؟" اس نے سگریٹ منہ سے نکالے ہوئے کہا۔ "نام! میں وکٹر بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ کیا یہ صحیح وقت ہے بات کرنے کا؟"

"میرے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب بولو۔" "گڈ! وکٹر بولا۔" "میں تمہاری طرف کچھ بھیج رہا ہوں۔" "سننے میں اچھا لگ رہا ہے۔"

"یہ بہت ہی اچھا ہے میرے دوست۔" "نام نے سگریٹ ایک طرف کیا اور غور سے وکٹر کی بات سننے لگا۔ وہ اور وکٹر کی بار ایک ساتھ کاروبار کر چکے تھے۔ جب بھی وہ اکٹھے کام کرتے تو وہ دونوں کے لیے زیادہ منافع بخش کام ٹھہرتا۔ نام کا قد چھوٹا لیکن جسمانی اعتبار سے وہ ذرا موٹا تھا۔ وہ غور سے اس کی بات سننے لگا۔

"جسمیں یقیناً ہے کہ وہ پیٹنٹنگ اصلی ہی ہے۔ اور نام کیا بتاتا ہے اس پر مصدقہ؟"

"ریگ ہائی۔" "وکٹر نے کہا۔ "میتھو ریگ ہائی۔ اور مجھے کوئی شک نہیں اس پیٹنٹنگ کے اصلی ہونے میں۔"

"میں بڑھیا کو کتنے پیسے آفر کروں؟"

"تم دوسو پچاس پاؤنڈ سے شروع کرنا اور چار سو پاؤنڈ سے اوپر نہ جانا۔"

"چار سو پاؤنڈ؟۔۔۔۔۔ یہ زیادہ نہیں ہیں۔" نام نے وضاحت چاہی۔

"اوہ نام۔۔۔۔۔ یہ اس سے دس گنا زیادہ کی پیٹنٹنگ ہے۔ تم بس یہ پیٹنٹنگ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ اس بار بہت بڑا منافع ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

"بیچ دو اسے یہاں۔"

"جس کی بھی وقت تمہارے پاس پہنچنے والی ہوگی۔ میں نے اسے ایک ہی میں بٹھا کر اور کرایہ دے کر جنہیں کال کی ہے۔"

"وکٹر۔ اتنی ہمدردی تو تم نے اپنی دادی سے بھی نہیں کی ہوگی۔" نام نے قہقہہ لگایا۔

"میں جنہیں اتنی بڑی ذلیل میں پانٹر بن رہا ہوں اور تم بجائے شکر یہ کہنے کے طنز کر رہے ہو۔"

"شکر یہ میرے دوست۔"

"یہ ہم تنہا کی جیت ہوگی۔" وکٹر نے کہا۔

"تنہا۔۔۔۔۔ تیسرا کون ہے؟"

"تم، میں اور ریگ ہائی۔"

اس سے پہلے کہ دونوں کے قہقہے ملتے، لائن کٹ گئی۔ اس کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک ٹیکسی اس کی دکان کے سامنے آ کر رکی ہے۔ اس نے سگریٹ نیچے پیچیک دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ اس نے مس پیٹنٹنگ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ نام نے ایک مدم میسکراہٹ کے ساتھ بڑھیا کو خوش آمدید کہا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"کیا آپ مسٹر نام ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ نام ہولی۔۔۔۔۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

"مجھے وکٹر فلیٹ وڈنے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"وکٹر فلیٹ وڈ؟"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں مسٹر وکٹر۔"

"بڑھیا نے کہا۔

"وہ تو لندن کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ ان کا تو ایک نام ہے۔ فین مصوری کی پہچان میں۔" نام نے اپنے آگے سے چیزوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس کچھ ہے بیچنے کو؟"

"بہت لمبی کہانی ہے۔" بڑھیا نے کہا۔

"آپ آرام سے بیٹھ جائیں پہلے۔" نام نے کرسی آگے کرتے ہوئے کہا۔

مس پیٹنٹنگ نے کرسی پر بیٹھنے ہی مختصر اساری داستان نام ہولی کے گوش گزار کر دی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔۔۔ ایک چیز جس کو آپ ایک عرصے سے اصل سمجھ کر رکھے ہوئے تھے، وہ اچانک نقلی نکل آئی۔"

بہت شرمندگی کی بات ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرے لیے نئی بات نہیں۔ میں کئی بار ایسی کہانیاں سن چکا ہوں جب بھی میرے پاس یہاں کوئی کچھ فروخت کرنے آتا ہے۔"

"لیکن میرے بھائی نے یہ آکشن سے خریدی تھی۔"

بڑھیا بولی۔ "میرے پاس اس کی رسید بھی ہے۔"

"رسید کی ضرورت نہیں مس پیٹنٹنگ۔" نام نے کہا۔ "میرے پاس ایڈگر کی وصیت کی کاپی بھی موجود ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ پیٹنٹنگ قانونی طور پر میری ہے۔ میں کوئی چیز چھپانا نہیں چاہتی۔"

"مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔" نام نے فوراً کہا۔ مس پیٹنٹنگ نے نام کو پیٹنٹنگ پکڑاتے ہوئے چہرے پر غمزہ ڈالتا کو چھپانے کی کوشش بھی کی۔

مس پیٹنٹنگ اب اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھیں۔ یہ جگہ اس کی گہری سے بہت مختلف تھی۔ یہاں تو ہر طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ نام نے پیٹنٹنگ کا گلابی ربن کھول کر اسے لاک کاغذ سے علیحدہ کیا اور پیٹنٹنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے بالکل ہی آہستہ لہجہ میں کچھ کہا۔ "ایڈگر بھل۔" بڑھیا نے غصے سے لہجہ میں کہا۔

"یہ کیسے کی طرف ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔"

"یہ اچھی ہے۔ مجھے ماننا پڑے گا۔" نام نے کہا۔ "بہت اچھی۔۔۔۔۔ مجھے یہ خریدنا ہوگی۔ یہ اصل نہیں ہے لیکن نقل میں بھی اس کا معیار بہت بلند ہے۔۔۔۔۔ وکٹر جیسا کہ اصل شخص ہی اصل اور نقل کا فرق کر سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب کہ تم اسے خریدو گے؟"

"یقیناً۔۔۔۔۔ لیکن قیمت بھی اس کے خریدنے پر منحصر ہوگی۔" نام نے کہا۔ "ویسے آپ کے ذہن میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟"

"مجھے بالکل معلوم نہیں۔" بڑھیا نے جواب دیا۔ "مجھے تو اندازہ ہوگا۔"

"ایڈگر کہتا تھا کہ اس کی قیمت چار ہندسوں میں ہوگی لیکن اب جب یہ اصل ہی نہیں تو کیا کہا جائے۔" بڑھیا نے اس کی طرف سے کہا۔

"دوسو پچاس پاؤنڈ کیسے رہیں گے اس کے لیے؟"

مس پیٹنٹنگ چونکی۔ "کیا یہی ہے آپ کی ذلیل؟"

"چلیں تین سو پاؤنڈ کر لیں۔"

"میں تو اس سے بہت زیادہ کا سوچ رہی تھی مسٹر نام۔" مس پیٹنٹنگ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اور میری بیٹی یوئسٹا اپنی پیشتر پری گزراہ کر لیں گی۔ اصل میں ہمیں ایک اضافی بیٹیوں کی ضرورت تھی اسی لیے اسے فروخت کرنا چاہ رہے تھے۔"

"تین سو پچاس پاؤنڈ۔"

"اگر میں نے اتنے کی فروخت کی تو یوئسٹا غصہ ہوگی اور ایڈگر تو قبر میں جنیں مارے گا۔"

"اور ریگ ہائی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اس کی نقلی پیٹنٹنگ فروخت کر رہا ہے تو وہ کیا کرے گا۔۔۔۔۔ ہر مصدقہ کا ایک ہمارا ہوتا ہے۔" نام نے جلدی سے کہا پھر اپنے پرس سے چار

## مذاہیات

ایک خوش شکل خاتون سوشل ورکر دعا می امراض کے اسپتال کے دورے کے دوران سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کانپ گئیں۔

کچھ آگے جا کر خوفزدہ آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ "خدا کی پناہ! کیسی خوف ناک صورت تھی، کیا یہ خطرناک ہے؟"

"کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے نالے والے انداز میں کہا۔

"پھر آپ لوگ اسے کونٹری میں بند کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟" خاتون نے تشویش سے پوچھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجبوری ہے کہ اس کو کونٹری میں بند نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔"

مرسلہ۔ قدرت اللہ نیازی

سو پاؤنڈ نکال کر کہنے لگا۔

"چار سو پاؤنڈ۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک پتی بھی اور نہیں۔"

"ہم ایک دوسرے کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

بڑھیا نے کہا اور اپنی پیٹنٹنگ کو پیک کرنا شروع کر دیا۔ "مجھے معاف کیجئے گا مسٹر نام۔" مجھے کسی اور جگہ کوشش کرنی ہوگی۔"

"آپ کو اس سے اچھی پیشکش اور نہیں نہیں ملے گی۔"

"دیکھیں گے۔"

"بہت سے تاجر نقلی تصویروں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔"

"اسے نقلی مت کہو۔۔۔۔۔ بڑھیا چلائی۔" مجھے غصہ آتا ہے۔"

"چار سو پچاس پاؤنڈ۔"

"کیا اس سے اوپر جاؤ گے؟"

میں پہلے ہی چار سو پچاس پاؤنڈ ذرا زیادہ کہہ گیا



آئی اور فٹ پاتھ کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے تین آدمی باہر آئے اور سڑک پار کر کے چرچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کے لباس سے گورڈن نے اندازہ لگا لیا کہ ان میں دو پادری اور ایک راہب تھا۔ وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا، تھوڑا سا اور بھی کر سکتا تھا۔

”تم دیکھو گے“ فادر ڈوکی نے ایبٹ جوزف اور برادر لیو کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”کہ اس گرجا میں اعلیٰ اقسام کی کئی پینٹنگز اور مجسمے ہیں۔ بشپ نے ایک ڈیلر سے کہا ہے کہ وہ فروخت کے لیے ان کی قیمت لگائے۔ ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم گرجا کا قرض

جیسے گورڈن نے اپنی گاڑی پارک کی۔ باہر نکل کر ایک چکر لگایا اور دوبارہ پینجر سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ چرچ کے مرکزی دروازے کو جانے والی سیڑھیوں پر نظر رکھ سکتا تھا اور اگر کوئی چرچ میں داخل ہوتا تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی کار وہاں آتی تب بھی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہتا۔ اسے سڑک خالی ہونے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں سیڑھیاں چڑھ کر چرچ میں داخل ہو سکتا تھا۔

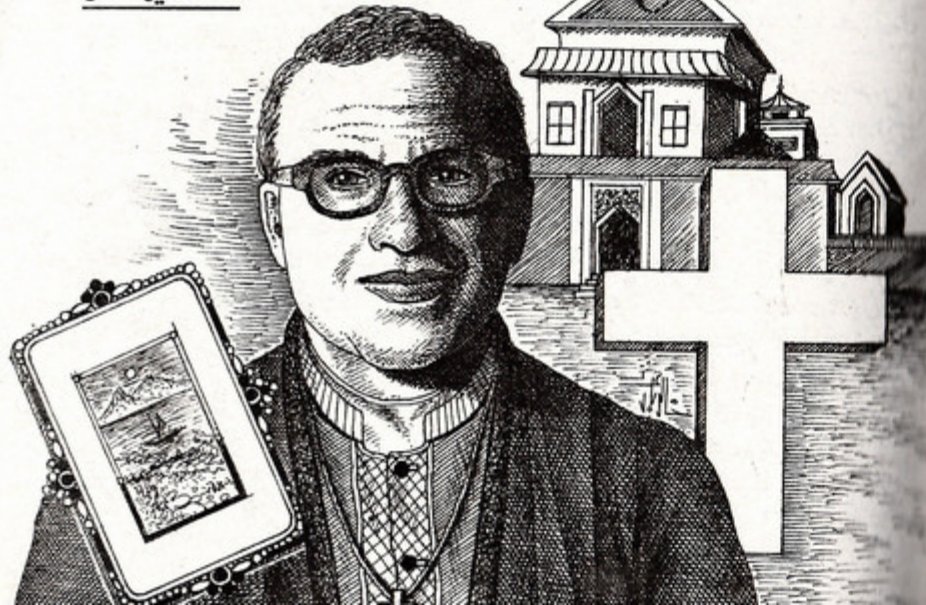
وہ اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہی والا تھا کہ ایک نیلے رنگ کی ہنڈا واشنگٹن اسٹریٹ سے سڑک پارک اسٹریٹ پر

### بنادٹی پاکیزگی کا پیرا من اور سے ایک چور کی کارستانی

مقام پرست کی پہچان یہی ہے کہ وہ ہر رشتے، ہر تعلق حتیٰ کہ ہر تقدس میں بھی مفاد کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر ہی لیتا ہے جیسے کہ اس تصویر کو مقدس سمجھنے والوں کے نظریات میں اختلاف تھا لیکن ان میں کوئی ایک ایسا بھی تھا جسے ان نظریات کی قطعاً کوئی پروا نہ تھی بلکہ اسے .... بھی اس نے اپنے فائدے کی خاطر چیرا لیا۔

## مقدس تصویر

شاہ زین رضوان



”ہاں وکٹر۔۔۔“

”تم پاگل ہو۔۔۔ بے وقوف۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”تعلقی پینٹنگ ہے۔“

”لیکن تم نے خود فون پر مجھے کہا تھا کہ بڑھیا اصلی

پینٹنگ لا رہی ہے۔“

”جب میری ٹیلیویزیون سے پینٹنگ باہر گئی تو اس وقت

تک وہ اصلی ہی تھی۔“

”تم سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ نام نے غصے سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ وہ اصلی پینٹنگ ہی تھی۔“

”پھر یہ سب کیسے ہوا؟“

وکٹر سوچنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد وہ سمجھ چکا تھا۔

”نام۔۔۔ اس بڑھیا نے ہمیں ہمارے ہی کھیل میں

گھسٹ دے دی۔ اس نے راستے میں ہی پینٹنگز تبدیل

کر لیں۔۔۔ وہ بوڑھی بھی نہیں بلکہ شیطان صفت عورت تھی۔“

☆ ☆ ☆

ایڈگر وہیں بیٹھا تھا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی

تھی۔ ایڈگر نے اس کی آواز سنی۔ وہ کوئی گانا گنتنا رہی تھی۔

ایڈگر اٹھا اور ایک کپڑے سے اسے پینٹنگ برش کو صاف

کرنے لگا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور اس کی نگاہ میں ایک پینٹنگ

تھی۔ ایڈگر بولا۔

”کتنے کمائے آج اس تعلقی پینٹنگ سے؟“

”پانچ سو پاؤنڈ۔“

”بہت خوب۔۔۔ آدھے دن کی کمائی اور وہ بھی پانچ سو

پاؤنڈ۔۔۔ لہذا۔“

”جہیں بھی تو آدھا دن لگتا ہے ایک تعلقی پینٹنگ کو تیار

کرنے میں۔“

”سو۔۔۔ آج میں کیا تھا تمہارے لیے؟“

”میرے مرنے ہوئے بھائی۔“

”اوہ۔۔۔ پچھلی بار میں تمہارا باپ تھا۔“

”چھوڑو ڈیزیز۔۔۔ تم ہی تو میرے سب کچھ ہو۔“

بولی۔ ”کتنی بانی رہ گئی؟“

”ختم ہو چکی۔ میں اسے مکمل کر چکا ہوں۔“

”تو آؤ، اب اس خوشی کو منائیں۔“ وہ خوش دلی سے

بولی۔ ”کہاں ہے شروب کی بوتل؟“

”یہ رہی۔“ ایڈگر نے اسے اشارے سے بتایا۔

”تم بیوقوف، میں برف لے کر آتا ہوں۔“

ہوں۔۔۔ چار سو پچاس یا پچھتر نہیں۔“

”کیا یہی اس کی قیمت ہے؟“ بڑھیا بڑبڑائی۔ بڑھیا

کی آنکھوں میں ایک ٹم تھا جو نام نے شدت سے محسوس کیا۔

نام کو معلوم تھا کہ اصل قیمت دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔ بڑھیا

اپنے آنسو پونچھ کر دوبارہ پینٹنگ کو باندھنے لگی۔ نام کو اب یہ

خوف تھا کہ اگر اسے باہر کوئی سچا تاجر مل گیا اور اس نے اس

بڑھیا کو اس کی اصل قیمت بتادی تو منافع بھی ان کے ہاتھ

سے جائے گا اور عزت بھی۔

نام نے ہمت کی اور کہا۔ ”پانچ سو پاؤنڈ۔۔۔ یا پھر

آپ جاسکتی ہیں۔“

☆ ☆ ☆

وکٹر آج بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی دکان بند کی اور

اپنے آپ کو سارا کاہد پتا ہوا نام کی دکان کی طرف جانے لگا۔

اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ دس گنا سے بھی کم قیمت پر اس

نے ریگ بانی کی اصل پینٹنگ حاصل کر لی تھی۔ نام کا منافع

نکال کر بھی اسے اچھے خاصے پیسے مل رہے تھے۔ جسکی کوکریا

ادا کرنے کے بعد وہ نام کے پاس آیا۔

”کیا تم وہ پینٹنگ لے چکے ہو؟“ وکٹر نے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔

”آخر کار۔۔۔“ نام نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ بوڑھی پانچ سو پاؤنڈ سے کم پر نہیں آئی۔“

”پانچ سو۔۔۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ چار سو سے

زیادہ نہ جانا۔“

”کیا فرق پڑتا ہے تم کہیں زیادہ کمالو گے۔“

”لیکن میں زیادہ سے زیادہ منافع چاہتا تھا۔“

”اسے پیسوں کی ضرورت تھی وکٹر۔“ نام نے

کہا۔ ”ایک سو پاؤنڈ سے کیا جاتا ہے تمہارا۔“

”چھوڑو اب۔۔۔“ وکٹر نے ہیزاری سے کہا۔ ”اب

ہمارے پاس ہے لیزرنگ کی تصویر۔ ریگ بانی کے ہاتھوں

سے تیار کی ہوئی۔“

”پچاری مس پلیٹین۔“

”تم اور تمہاری وہ بوڑھی بھیڑ۔۔۔ جسے ہم ذبح کر

چکے ہیں۔“

نام نے پینٹنگ اس کے سامنے کی۔ وکٹر بغور پینٹنگ کو

دیکھنے لگا۔ نام، وکٹر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا جب وکٹر کے

چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے۔

”تم نے پانچ سو پاؤنڈ اس کے لیے ادا کیے؟“



چکانے میں کام آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ بپ تمہیں اپنی خانقاہ کے لیے ان میں سے کوئی ایک چیز لے جانے کی اجازت دے دے گا۔

ایبٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس حلقے کے لوگ اپنے چرچ کا نقصان برداشت کر لیں گے؟“  
”انہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ جس چرچ میں ان کی شادیاں ہوئیں، ان کے بچوں کا نام رکھا گیا، ان کے پیاروں کی آخری رسومات ادا کی گئیں، اب وہ بند ہو رہا ہے۔ ان میں سے کئی ایک مستغنی ہو کر دوسرے چرچ میں چلے گئے اور باقی لوگ مایوس بلکہ ناراض ہیں۔“ فادر نے ایک بار پھر ہنسنے کی کوشش کی۔ ”لیکن نوجوان نسل باقاعدگی سے چرچ نہیں آتی۔ اس لیے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔“ ایبٹ جوزف نے کہا۔ ”بپ گرجا گھروں کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی لیے سخت فیصلے کرنا پڑے رہے ہیں۔ ان یادریوں کا کیا ہوگا جو اس گرجا کو چلاتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کا کیا مستقبل ہے؟“

”فادر سائمن کی عمر کافی ہو گئی ہے اور وہ معتزب ریٹائر ہونے والا ہے۔ نوجوان پادری اشارک جو اس کی معاونت کے لیے پولینڈ سے آیا تھا، وہ واپس جانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔“

”تو پیاری ہے۔“ برادر لیو نے سرگوشی کی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے اسی چھت پہلے بھی دیکھی ہو۔“  
”یہ لکڑی کی چھت ہے۔“ فادر ڈوکی نے وضاحت کی۔ ”اسے اتنی برس پہلے پولینڈ میں تعمیر کیا گیا تھا۔“  
”یعنی حلقے کے اصلی لوگ پولینڈ سے ہجرت کر کے آئے تھے؟“ ایبٹ جوزف نے پوچھا۔

”ہاں۔ ان میں سے کچھ اپنے ساتھ مصنوعی اشیاء لے کر آئے تھے۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں تھیں کیونکہ زیادہ تر ہجرت کرنے والے غریب تھے لیکن پولش پادری کچھ قیمتی چیزیں بھی لے کر آئے جیسے چاندی کے پیالے۔۔۔ اس چرچ میں بھی ایک بہت خوب صورت منبر کی صلیب ہے۔“  
”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ صلیب پولینڈ کے کس حصے سے لائی گئی تھی؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ کوئی پرانا آدمی اس بارے میں جانتا ہو۔“

”سچجی نہ۔“

تینوں آدمیوں نے پلٹ کر دیکھا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ ایک عورت سیاہ کوٹ اور نیلے پھولدار ...

اسکارف میں ملیں لٹکراتی ہوئی ان کے پاس سے گزری اور عبادت میں مشغول ہو گئی۔

”سچجی؟“ ایبٹ جوزف نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔  
”یہ روس کی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا شہر ہے۔“ فادر ڈوکی نے وضاحت کی۔

تینوں آدمی عبادت گاہ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ عورت ایک سینٹ کی پینٹنگ کے سامنے ٹھکی ہوئی تھی۔  
”یہ سینٹ کون ہے؟“ جوزف نے پوچھا۔

”سینٹ ہیڈوگ۔۔۔۔۔ پولینڈ کی ملکہ تھی، بہت ہی خیر اور حلیم کو کہ اس نے کبھی اقرار نہیں کیا لیکن وہ شاہانہ لباس کے بجائے نن کا لباس پہنتی تھی۔ کچھ لوگ اس سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ میں اس پینٹنگ کی تاریخ نہیں جانتا۔“

وہ بوڑھی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور ان تینوں کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”سینٹ ہیڈوگ۔۔۔۔۔“ اس نے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ نیپور سے آئی تھی۔“

فادر ڈوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تمہارا مطلب ہے محل سے؟“

اس عورت نے تائید میں سر ہلادیا۔ فادر ڈوکی نے سینٹ ہیڈوگ کی عبادت گاہ میں قدم رکھا اور پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ بوڑھی عورت کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”پھر تو یہ بہت قیمتی ہوگی؟“

”یہ ایک طویل دکھ بھری کہانی ہے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں یوں سمجھو کہ اسے تباہ ہونے سے بچایا گیا۔“  
”یہ کہہ کر وہ عورت مڑی اور لٹکراتی ہوئی گرجا سے باہر چلی گئی۔ فادر ڈوکی اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

ایبٹ جوزف اور برادر لیو کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ”وہ کیا کہہ رہی تھی؟“ جوزف نے فادر ڈوکی سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ نیپور کا محل سترھویں صدی میں بنایا تھا پھر یہ ایک امیر کیر خاندان ریڈزی ول کے تصرف میں آ گیا۔ وہ اس میں 1945ء تک رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنگ کے دوران نازیوں نے اسے لوٹا ہوگا۔ جنگ کے خاتمے پر کمیونسٹ حکومت نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ریڈزی ول خاندان اس حکومت کے خاتمے تک محل واپس لینے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں۔“

”ریڈزی ول۔۔۔۔۔“ جوزف نے کہا۔ ”یہ نام کچھ جانا بیچنا لگتا ہے۔“

”جیکو لین کینڈی کی بہن کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی۔“

”اوہ ڈیر!“ برادر لیو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔“ فادر نے جواب دیا۔ ”اس محل کا فرنیچر اور لٹیرا اپنے اصلی معیار کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ پینٹنگ بھی بہت قیمتی ہو۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریڈزی ول خاندان ہی اس کا اصل مالک ہو۔“ برادر لیو نے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔“ فادر ڈوکی بولا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ تصویر کب اور کیسے اس گرجا میں آئی۔“

ایبٹ جوزف قریب جا کر اس پینٹنگ کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس عورت نے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی قیمتی تصویر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پیچھے ایک المیہ ہے اور اسے تباہ ہونے سے بچایا گیا۔“ وہ فادری کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا وہ محل تباہ ہو گیا تھا؟“

”مجھے یقین ہے کہ نہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”اور نہ ہی میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ کوئی قیمتی تصویر ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو کہ اس میں زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔“  
ایبٹ جوزف نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور سینٹ ہیڈوگ کے تاج میں لگے ہوئے سبز پتھروں کو چھوتے ہوئے بولا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

فادر ڈوکی تصویر کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”یہ سبز پتھر، کیا تم سمجھتے ہو۔۔۔۔۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”یہ زردی طرح تو نہیں لگتے؟“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔“ جوزف نے کہا۔ ”ان پتھروں پر عجیب سی سفید باریک لائیں ہیں لیکن صاف نظر آتی ہیں۔“

”یعنی یہ زرد نہیں ہے۔“ برادر لیو نے کہا۔  
”اگر زرد نہیں تو پھر کیا ہے؟“ فادر ڈوکی نے پوچھا۔  
”میں نہیں جانتا۔“ جوزف بولا۔ ”لیکن بپ کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ ان پتھروں کی مالیت کا اندازہ لگوائیں۔“  
فادر ڈوکی نے اپنے ہاتھوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید بپ نے پہلے ہی اس کا انتظام کر دیا ہے۔“  
جوزف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم ڈیلر کی بات کر رہے ہو۔“

دروازے کھلنے اور قدموں کی آواز سن کر وہ تینوں ہونک پڑے۔ ”یہ کیسا ہی حلقے کے لوگ ہیں۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔ ”مجھے ان کی میننگ ہو رہی ہے جس میں گرجا بند

ہونے کی صورت حال پر غور کیا جائے گا۔ مجھے شبہ ہے کہ ان کے جذبات بہت شدید ہوں گے۔ کیا تم اس مینٹگ میں جانا پسند کرو گے؟“

برادر لیو چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”میں فادر سائمن سے اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ شاید وہ مجھے کچھ بلب دینا چاہ رہا ہے۔“  
”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ جوزف نے کہا۔ ”میں تم سے مینٹگ کے بعد ملوں گا۔“

برادر لیو چرچ سے باہر نکلا۔ اس نے سڑک کے دوسری جانب کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر سر ہلایا اور پادری کے گھر کی جانب چل دیا۔ نیچے مینٹگ روم میں جوزف اور فادر ڈوکی پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیسا کہ لوگ ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں سے جذبات کی شدت، اداسی، پریشانی، تجسس اور غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور ماتھے پر ریش پڑے ہوئے تھے۔ وہ صدائیں کر رہے تھے۔  
”کیا تمہاری کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ وہ اس کے دائیں بائیں کرسیوں پر براہمان ہو گئے۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔“

وہ بے چین شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور اس نے مینٹگ شروع ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم سینٹ ہیڈوگ کو بچانے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ہسپانوی چرچ میں ضم ہو جائیں۔ پھر اس نے اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مستر سائمن؟“

سائمن اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور اس نے اس تجویز کے حق میں رضامندی ظاہر کر دی۔ ناراض رکن جس کا نام مسٹر رابرٹ تھا، کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں ایک نکتے پر مسٹر سائمن اور مسٹر ولیم سے متفق ہوں۔ ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں کہ بپ کو چرچ بند نہ کرنے پر قائل کر سکیں جبکہ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اس کے اخراجات پورے کرنے کا کوئی راستہ نکال لیں گے۔ وہ ہماری کوئی بات نہیں سمجھے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ڈرامائی انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ بے چینی کے عالم میں اپنی نشستوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ رابرٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی ہم اپنے چرچ کے لیے کچھ نہ کر سکتے ہیں۔ کم از کم ہمیں اپنے ورثے کی ضرورت حفاظت کرنی



چاہیے۔ ہم اپنے بزرگوں کے احسان مند ہیں جو یہاں آئے کام کیا اور یہ چرچ بنایا۔“

پھر اس نے میز پر ہنگامے سے بٹہ لیا۔ ”ہمیں اپنی منبری کی صلیب کو بچانا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ سینٹ ہیڈوگ کی حفاظت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری نظر میں اس کی کیا اہمیت ہے کیونکہ وہ ہماری سینٹ ہے۔“

سب لوگوں نے تائید میں سر ہلادیا۔ ان میں سے ایک چلتا ہوا بولا۔ ”ہاں، ہمیں اس کو ضرور بچانا ہے۔“

”لیکن.....“ مسٹر ولیم نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ ”ہم اسے کس طرح بچا سکتے ہیں؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عنقریب ایک تاجر ان چن چنوں کا تحنیز لگانے آ رہا ہے۔ اگر اس نے سینٹ ہیڈوگ کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو ہم اسے کیسے روک سکیں گے؟ اس حلقے کو پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔“

مسٹر رابرٹ نے مسٹر ولیم کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ”ہم اسے بچالیں گے۔ میں نے مسٹر ہیک سے مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔“ اس نے تیسری قطار میں بیٹھے ہوئے ایک ہماری بھر کم شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”ہم اسے کس طرح بچا سکتے ہیں؟ آپ اسے چرچ سے چرائیں سکتے اور نہ ہی اس تاجر کو اسے لے جانے سے روک سکتے ہیں۔ اگر بپ نے اسے اجازت دے دی۔“

مسٹر ہیک نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اور مسٹر رابرٹ کئی سالوں تک ایک ساتھ کام کر چکے ہیں۔ ہم کوئی طریقہ نکال لیں گے۔ سینٹ ہیڈوگ خود نہیں بتائے گی کہ اس کی حفاظت کس طرح کی جائے۔“

مسٹر رابرٹ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ہم جان جائیں گے کہ کیا کرتا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی میننگ ختم ہو گئی۔ فادر ڈوکی اور جوزف گر جا کے درمیانی حصے میں آئے۔

”میں ایک بار پھر سینٹ ہیڈوگ کی پینٹنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جوزف نے کہا۔ ”مجھے ان سبز پتھروں کے بارے میں تجسس ہو رہا ہے۔“

ادھر کی منزل پر ایک شخص عمدہ تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”شاید یہی وہ تاجر ہے جسے بپ نے بلایا تھا۔“ فادر ڈوکی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

جوزف نے اس کا بازو پکڑا اور اسے روکتے ہوئے بولا۔ ”ایک منٹ صبر کرو۔“

وہ تاجر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”شاید اس نے ہماری بات سن لی۔“ جوزف بولا۔ ”آؤ اس سے بات کرتے ہیں۔“

”ہمارا خیال ہے کہ تم وہی تاجر ہو جسے بپ میکلین نے بھیجا ہے۔“ فادر ڈوکی نے کہا۔

اس شخص نے گھوم کر دیکھا اور بولا۔ ”ہاں، میں ہی ہوں اور تم؟“

”میرا نام فادر ڈوکی ہے اور یہ ایبٹ جوزف ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس گرجا کا یادری فادر.....“

”فادر سائمن۔“ ڈوکی نے کہا۔ ”میں قریبی چرچ سے آیا ہوں۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ پینٹنگ بیش قیمت ہے؟“

جوزف نے پوچھا۔

تاجر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میں نے اسے سرسری نظر سے دیکھا ہے اس لیے یقین ہے کہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے لیے مجھے اس کا تفصیل سے معائنہ کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”مجھے ذرا جلدی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد جوزف بولا۔ ”وہ حال شول کر رہا تھا۔“

فادر ڈوکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جیسا کہ اس نے کہا کہ وہ تصویر کا بغور معائنہ کیے بغیر اس کی قیمت کا تعین نہیں کر سکتا۔“

”اس نے ہمیں اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“

”اگر تم چاہو تو میں بپ سے اس کا نام معلوم کر سکتا ہوں۔“

”پلیز ایہ کام ضرور کرو۔“ جوزف پینٹنگ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم قریب میں مجھے کسی اچھی لائبریری کا پتا بتا سکتے ہو؟“

فادر ڈوکی نے کاؤنٹی لائبریری کے بارے میں بتایا اور وعدہ کیا کہ وہ فون کر کے اسے ڈیلر کے نام سے آگاہ کر دے گا۔

چند گھنٹوں بعد جوزف ایک کرسی پر بیٹھا فادر ڈوکی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ یہاں آکر ہمیشہ سکون محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ڈوکی کا کافی کا جگ لے کر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ”ایسی کیا بات معلوم ہو گئی جس نے تمہیں پریشان کر دیا؟“

”پریشان نہیں جبران.....“ یہ کہہ کر جوزف نے اپنی

جیب سے وہ تصویریں نکالیں جو اس نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ ”میں ان سبز پتھروں کے بارے میں جان گیا ہوں، وہ یا قوت ہیں۔“

”کیا یہ بہت قیمتی ہیں؟“

”ہاں۔ ایک قیراط کم از کم ایک ہزار ڈالر مالیت کا ہے۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس طرح کے تین یا چار پتھر سینٹ ہیڈوگ کے تاج میں جڑے ہوئے ہیں۔“

فادر ڈوکی نے کہا۔ ”اور یہ اتنی زیادہ مالیت نہیں کہ اس میں کوئی تاجر دلچسپی لے سکے۔ لہذا ہم غلطی پر تھے۔ کیا یہ پینٹنگ بذات خود بیش قیمت ہے؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”اس کے باوجود.....“ ڈوکی نے میز پر کافی کے پیالے رکھتے ہوئے کہا۔ ”بپ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تاجر اس پینٹنگ کو خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

جوزف نے اپنی بھوس اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا بپ نے یہ بتایا کہ اس تاجر نے کیا قیمت لگائی ہے۔“

”شاید تم نے اس کا نام تجس گورڈن بتایا تھا۔“

”صحیح اندازہ تو نہیں لیکن بپ اس بارے میں بہت پرجوش ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس تاجر نے بہت اچھی پیشکش کی ہے اور اس رقم سے ہمارے اسکول میں ضروری مرمت کا کام ہو سکے گا۔“

جوزف اور فادر ڈوکی کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر ڈوکی نے کہا۔ ”اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ پینٹنگ اتنی قیمتی نہیں ہے تو وہ تاجر اسے خریدنے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور اس نے ان پتھروں کی قیمت سے کہیں زیادہ کی پیشکش کی ہے۔“

جوزف اپنی ٹھوڑی کھچاتے ہوئے بولا۔ ”میری ریسرچ سے ایک اور امکان ظاہر ہوتا ہے۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ ایک مخصوص قسم کا یا قوت ہے جو دس سے آتا ہے۔ اس کی ایک کھپ اور ل کی پہاڑیوں سے سڑکی دہائی میں دریافت کی گئی تھی اگر ان کا رنگ چمک دار ہو تو بہت قیمتی ہیں اور اگر نہیں تب بھی ان کی مالیت ایک ہزار ڈالر زنی قیراط سے کم نہیں لیکن انہیں یاد ہے کہ اس بوڑھی عورت نے ہمیں اس پینٹنگ کی اصلیت کے بارے میں کیا بتایا تھا؟“

”تبیور..... وہ محل جس میں ریڈی ول خانداں رہتا تھا۔“

جوزف نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ”اگر یہ بات

درست ہے اور واقعی ریڈی ول خانداں اس پینٹنگ کا مالک تھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں لگے ہوئے یا قوت اٹھارہ سو ساٹھ کی کھپ کے ہیں اور ان کی قیمت بھی وہی ہے لیکن ریڈی ول خانداں سے تعلق کی بنا پر یہ اور پینٹنگ دونوں ہی زیادہ قیمتی ہو سکتے ہیں۔“

”کتنے قیمتی؟“

جوزف نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یقیناً اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو مسٹر گورڈن نے لگائی ہے اور اگر بپ اسے حقیقی قیمت پر فروخت کرنا چاہے تو اسے اس کا ماخذ ثابت کرنا ہوگا۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟“

فادر ڈوکی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔ مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسے اس پینٹنگ کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ وہ کیسے اور کہاں سے آئی ہے۔“

”لیکن وہ بوڑھی عورت جانتی ہے۔“

”اس نے یقیناً اس جانب اشارہ کیا تھا۔“

”تم اس عورت کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

فادر ڈوکی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”وہ پولینڈ کی رہنے والی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وہیں پیدا ہوئی ہوگی اور اس کا شمار سینٹ ہیڈوگ کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے۔ بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔“

”لگتا ہے کہ اس پینٹنگ سے اس کا گہرا جذباتی تعلق ہے۔ کیا تم اس کا نام اور پتا معلوم کر سکتے ہو؟“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فادر سائمن کے پاس کلیسا کے تمام لوگوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تصویر کا ماخذ ثابت کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے تو بپ یقیناً خوش ہوگا۔“

”مجھے یقین ہے کہ گورڈن کو اس تصویر کی اصلیت کا پتا ہے۔ ورنہ وہ کیوں اسے خریدنے کا خواہش مند ہوتا۔“

فادر ڈوکی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس کا جواب بہت آسان ہے، اس کے پاس ایسا کوئی گاہک ہے جو سینٹ ہیڈوگ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔“

جوزف نے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ عام طور پر جنگ عظیم دوم کی اشیاء مثلاً ہتھیاروں، جنموں اور دستاویزات کے سودے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ عظیم دوم کی چرائی ہوئی تصویروں اور نوادرات میں بھی اس کی دلچسپی ہے۔“



”گر سینٹ ہیڈ لوگ کی پیشین گوئی بھی اسی زمرے میں آتی ہے تو گورنر اس کی حقیقی قیمت جانتا ہوگا۔“

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے اور اسی وجہ سے وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”کیا وہ اس بارے میں بپ کو بتانے کا پابند نہیں ہے؟“

”اخلاقاً تو اسے بتادینا چاہیے۔ البتہ قانوناً اس پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔“

”پھر ہمیں اس بوڑھی عورت سے ضرور معلوم کرنا چاہیے۔ صرف وہی اس سے کوئل کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔“

جوزف نے کہا۔ ”میں اس عورت سے جلد از جلد ملنا چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اس کا نام پتا معلوم کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔“

اس شام جیسے گورنر دوبارہ چرچ میں داخل ہوا۔ اسے یہ پریشانی نہیں تھی کہ اس کے علاوہ وہاں اور کون ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ بپ یہ پیشین گوئی اسے ہی فروخت کرے گا اور اگلے روز یہ سودا طے پا جائے گا لیکن اس سے پہلے وہ ایک دفعہ اپنا اطمینان کر لیتا چاہتا تھا۔

گرچہ اس میں روشنی ہو رہی تھی اس لیے اسے نارچ نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہاں تین افراد اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ انہوں نے اس کی آمد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی نظر ایک شخص پر گئی اور گورنر کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ ایک طویل قامت بھاری بھر کم شخص تھا۔ گورنر ایک ستون کی آڑ میں ہو کر اس کے جانے کا انتظار کرنے لگا پھر وہ شخص ایک شیخ کی جانب بڑھا اور وہاں سے ایک کتاب اٹھالی۔ یہی کچھ اس نے دوسری ٹیپوں پر بھی کیا۔ گورنر سمجھ گیا کہ وہ چرچ کا دربان ہے۔ پھر وہ تصویر کی جانب بڑھا اور بخور دیکھنے کے بعد اطمینان ہو گیا کہ یہی وہ شاہکار ہے جس کی اسے عرصے سے تلاش تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگا تا چاہا مگر اس نے خود کو روکا اور بغلی دروازے سے باہر نکل گیا۔

”سب کچھ گھو گیا۔“ مسز وائو بڑبڑائی۔ ”اب میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں اس لیے اس کی حفاظت نہ کر سکی۔“

جوزف اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں دیکھ سکتا تھا۔ نازبوں نے پولینڈ میں بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ انہوں نے عظیم موسیقار چوپن کا مجسمہ مسمار کر دیا۔ وارسا

میں تباہی مچائی اور تشدد کے ذریعے حکومت کی۔ میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کی حفاظت نہ کر سکی۔ اسے پولینڈ واپس جانا چاہیے تھا۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میں بہت چھوٹی تھی اس لیے اس پیشین گوئی کو وہاں نہ لے جا سکی پھر میں خود ماں بن گئی اور پولینڈ پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ اب میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ وہ تصویر بھی واپس نہ جا سکے گی۔ یہ ایک اور المیہ ہے۔“

جوزف اس کی جانب جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”کیسا المیہ؟“

”وہ پولینڈ کا دل اور اس کی روح ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ جوزف نے پوچھا۔ ”پولینڈ میں سینٹ ہیڈ لوگ کی کئی پیشین گوئیاں ہیں اگر اس میں کوئی خاص بات ہے تو بتاؤ۔ شاید ہم اس کی حفاظت کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں۔“

”اس کی موسیقی پولینڈ کی آواز ہے۔ میرے باپ نے یہی بتایا تھا۔“

ایبٹ جوزف دم بخود رہ گیا۔ ریڈی ول خاندان کے بارے میں اس کی ریسرچ کے دوران جو اشارہ ملا، شاید وہ سچ تھا۔ ”اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا؟“

”میں بہت چھوٹی تھی جب اس کا انتقال ہوا لیکن مرنے سے پہلے اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اسے کہاں لے کر جانا ہے۔“ اس نے رد مال سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

”کہاں؟“ جوزف نے پوچھا۔ ”اس نے کہاں لے جانے کے لیے کہا تھا؟“

”وارسا کے ہولی کراس چرچ میں لیکن میں اسے لے جانے میں ناکام رہی۔“

جوزف کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے باپ کا کیا مطلب تھا۔ اس پیشین گوئی میں یقیناً پولینڈ کی موسیقی ہے۔“

اس نے مسز وائو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”امید کا دامن مت چھوڑو۔ ہم اب بھی اسے بچا سکتے ہیں۔“

ایک گھنٹے بعد جوزف نے کاؤنٹی لائبریری سے فادر ڈوکس کو فون کیا۔ ”مجھے مسز وائو سے پیشین گوئی کے بارے میں اہم معلومات ملی ہیں۔ میں اس وقت لائبریری میں ہوں لیکن جلد ہی اپنی ریسرچ ختم کر لوں گا۔ ہم رات کو بات کریں گے۔“

”ضرور۔ میرے پاس بھی کچھ اہم معلومات ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکتی تم آ جاؤ۔“

جیسے گورنر بہت ناراض تھا۔ وہ اس معاملے میں

گرچہ اسے کسی فرد یا پادری سے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا تعلق بپ کے مہکلین سے تھا جس کے پاس اس تصویر کو بچنے کا اختیار تھا اور وہ اس پر راضی بھی ہو چکا تھا۔ گورنر نے اس تصویر کی بہت زیادہ قیمت لگا لی تھی اور وہ کسی کو اپنی ریسرچ کے بارے میں بتانے کا پابند نہیں تھا۔

اس نے کئی سالوں تک ریڈی ول خاندان پر تحقیق کی تھی۔ شہزادہ انطونی ریڈی ول خود ایک اچھا موسیقار تھا۔ اس کے باوجود اس نے نو جوان موسیقار چوپن کو اپنے محل میں مدعو کیا۔ اس کے انتقال کے بعد مائیکل ریڈی ول اس کا وارث بنا لیکن پولینڈ کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے اسے جلا وطن ہونا پڑا۔ اس کا اسٹیٹ فیجر جان بچا کر بیس چلا گیا اور اپنے ساتھ سینٹ ہیڈ لوگ کی تصویر بھی لے گیا۔ گورنر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا پھر اسے معلوم ہوا کہ کئی عشروں بعد فیجر کا پوتا اس تصویر کو لے کر امریکا آ گیا اور اب وہ اس چرچ میں ہے۔

گورنر نے گھڑی دیکھی۔ وہ اس پادری سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہ رہا تھا تا کہ صبح پیشین گوئی کے سریدھا اثر پورٹ چلا جائے۔ ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے برا سامنہ بنایا۔ یقیناً وہ پادری اب یہ جیڈیائی اپیل کرنے آیا ہوگا کہ گرچہ لوگوں کو اپنے ساتھ یہ تصویر لے جانے کی اجازت دی جائے جس کو چاہیں وہ بحالت مجبوری جا رہے ہیں۔ اسے پادری سے ملنے سے انکار کر دینا چاہیے تھا لیکن کچھ سوچ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

اسے امید تھی کہ پادری اس سے جھگڑا کرے گا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس پر چرچ میں داخل ہونے اور تصویر چوری کرنے کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔ گورنر نے بھی اپنا غصہ نکالا اور پادری کو کھڑک ٹاک قسم کی دھمکیاں دیں لیکن وہ اس ضرب کے لیے تیار نہیں تھا جو پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ وہ پیچھے کی جانب گرا اور اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا پھر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

جوزف نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بہت دیر ہو گئی۔“

”جس کسی نے بھی یہ پیشین گوئی ہے، اس نے گزشتہ شب یہ کام کیا ہے۔“ فادر ڈوکس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حلقے کے لوگ چرچ کے تہ خانہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ مجھے بھی وہاں ہونا چاہیے۔ کیا ہم مسز وائو کا انتظار کریں؟“

جوزف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں انتظار کرنا

## تصدیق

ایک آدمی نے اپنی بیگم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ ”بیگم! مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔ صبح کے لیے میرے کپڑے دھو کر استری کر دینا اور میری پسند کی ڈش میرے آنے سے پہلے تیار رکھنا۔ کھانا آ کر کھالوں گا۔“

بیگم کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک اور منیج بھیجا۔ ”اور ہاں، میں بتانا بھول ہی گیا کہ میری پروموشن ہو گئی ہے اور اس دفعہ مجھے زیادہ سیکریٹری ملے گی۔ مہینے کے آخر میں ہم نئی کار بھی لے رہے ہیں اور پھر ڈھیر ساری شاؤپنگ کر کے کسی اچھی جگہ میرے لیے کھائیں گے۔“

بیگم کا فوراً جواب آیا۔ ”واؤ۔ کیا واقعی؟“

اس آدمی نے غصے سے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تو صرف یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ تمہیں میرے منیج مل بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ چلو جلدی سے اٹھو اور جو پہلے منیج میں کام ہوتا ہے وہی کرو۔“

مرسلہ۔ قدرت اللہ نیازی

ہوگا۔ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس کا رخ کس طرف جاتا ہے۔“

دو آدمی تہ خانے کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے اور پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مسٹر رابرٹ اور مسز ولیم ہال کے سامنے ایک میز کے پیچھے کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”یقیناً تم نے سن لیا ہوگا کہ سینٹ ہیڈ لوگ کی پیشین گوئی غائب ہے۔“ مسز ولیم نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔“

مسٹر رابرٹ نے کہا۔ ”ہم سب جانتے ہیں کہ بپ مہکلین کو وہ پیشین گوئی چاہیے تھی۔ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر بپ سے مل کر اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بپ نے وہ تصویر لی ہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”لوگ باقاعدگی سے یہاں عبادت کے لیے آ رہے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ عتریب یہ چرچ بند ہونے والا



ہے۔ ان میں سے تو کسی کی جرأت نہیں کہ وہ یہ حرکت کرے۔ البتہ بپ ایسا کر سکتا ہے۔ اسے کوئی روکے گا اور نہ کچھ پوچھے گا۔

ایک اور شخص نے پوچھا۔ ”کیا کسی نے بپ کو تصویر لے جاتے ہوئے دیکھا؟“

مسٹر رابرٹ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر دیکھا بھی ہوگا تو کون اس کی رپورٹ کر سکتا ہے اور کس سے کرے گا۔ یقیناً کسی نے بھی مجھ سے یا مسٹر ولیم اور مسٹر ہیک سے کچھ نہیں کہا۔“

جوزف نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ہیک نظر نہیں آ رہے۔ کیا کسی کو معلوم ہے کہ وہ کیوں نہیں آئے؟“

ایک آدمی نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ آج کام پر گیا ہے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں کام کرتا ہے؟“

”پبلک اسکول میں۔ وہ وہاں سیکورٹی گارڈ ہے۔“

جوزف دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مسٹر ولیم کی جانب سے مینٹگ ختم ہونے کا اعلان بھی نہیں سنا۔ فادر ڈوکی نے اس کا کندھا پکڑ کر بلایا تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ سب لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ رہے تھے۔

”اب یہ لوگ بپ کے پاس جا رہے ہیں۔“ ڈوکی نے کہا۔ ”لیکن وہاں ان کا گرم جوشی سے استقبال نہیں ہوگا۔“

”مجھے شبہ ہے کہ ان کے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ جوزف نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور مسٹر رابرٹ کو بھی یہ بات معلوم ہے۔ چلو تمہارے گھر چل کر بات کرتے ہیں۔“

☆☆☆

فادر ڈوکی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے یہ کیوں کہا کہ مسٹر ولیم کو بھی معلوم ہے؟ بپ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

جوزف نے ہنسنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے غور کیا کہ مسٹر رابرٹ نے ایک دفعہ بھی گورڈن کا نام نہیں لیا۔“

”شاید..... لیکن میرا خیال ہے کہ گورڈن بھی مشتبہ شخص ہو سکتا ہے۔“

”اگر وہ پینٹنگ لے گیا ہے تو اس میں بپ کی اجازت شامل ہوگی۔ کیا اس میں جڑے ہوئے یا قوت اتنے ہی قیتی ہیں؟“

جوزف نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، مجھے یقین ہے کہ اس پینٹنگ میں کوئی اور قیتی چیز بھی ہے۔ مسٹر گورڈن اس کے بارے میں جانتا ہے یا کم از کم اسے شبہ ضرور ہے۔“

”اور تم بھی اس بارے میں جانتے ہو؟“

”مجھے بھی شبہ ہے لیکن ہم اس بارے میں نہیں جان سکتے جب تک ہم اس کا معائنہ نہ کر لیں..... خصوصاً اس کی پشت لیکن ہمیں بہت دیر ہوگئی۔“

ڈوکی نے بھوس اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کی پشت؟“

جوزف بولا۔ ”میری تحقیق کے مطابق مائیکل ریز زری ول جب جلاوطن ہوا تو اس نے محل کی کئی بیش قیمت اشیا چھپا دیں تاکہ اس کی واپسی تک وہ محفوظ رہیں لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کے بیٹے نے کئی خاندانی قیمتی اشیا بھرس میں غلام کر دیں۔“

”کیا یہ پینٹنگ بھی اس میں شامل تھی؟“

”نہیں۔ اگر مسز ولنوک اطلاع درست ہے تو یہ تصویر اس کا دادا بھرس لے کر آیا تھا۔“

ڈوکی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کے پاس یہ پینٹنگ کہاں سے آئی؟“

”جب مائیکل جلاوطن ہوا تو اس وقت وہ اس کا اسٹیٹ فیئر تھا اور اپنی جان بچا کر بھرس چلا آیا۔“

”لیکن یہ تصویر..... کیا یہ اس کے لیے ذاتی اہمیت رکھتی تھی؟“

”اس سے بھی زیادہ۔ جب وہ 1915ء میں فوت ہوا تو اس نے یہ تصویر اپنے بیٹے یعنی مسز ولنوک کے باپ کے حوالے کر دی۔ اس وقت جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی اور پولینڈ غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو چکا تھا لیکن اس غلامی اور بربادی کی یادیں لوگوں کے دلوں میں تازہ تھیں۔“

ڈوکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج بھی ہیں۔“

”مسز ولنوک کے باپ نے عہد کیا کہ وہ اس پینٹنگ کی پوری طرح حفاظت کرے گا کیونکہ اس میں پولینڈ کا دل ہے۔“

فادر ڈوکی نے کہا۔ ”مسز ولنوک نے تمہیں بتایا ہوگا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟“

جوزف نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، وہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی جب وہ اور اس کا باپ نازیوں کے تسلط سے جان بچا کر امریکا آ گئے۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ بارہ سال کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ پینٹنگ کسی طرح پولینڈ کے چرچ میں پہنچا دی جائے لیکن

وہ پولینڈ واپس نہ جا سکی چنانچہ اس نے کئی سال پہلے اسے اس چرچ کو عطیہ کر دیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“

”مجھے یقین ہے کہ میں اپنی تحقیق اور جو کچھ مسز ولنوک نے بتایا ہے، اس سے کچھ اندازہ لگا سکوں۔“

میلی فون کی کھنٹی بجی۔ فادر ڈوکی نے فون اٹھایا اور سننے کے بعد بولا۔ ”کسی نے گورڈن پر اس کے ہونٹ کے کمرے میں حملہ کر دیا۔“

”کیا وہ مر گیا؟“ جوزف نے پوچھا۔

”نہیں، وہ اسپتال میں ہے اور اس نے ڈاکٹروں کو بتایا ہے کہ اس پر کسی پادری نے حملہ کیا تھا۔“ ڈوکی نے کہا۔ ”میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ فادر سامنسن نے یہ حملہ کیا ہوگا کیونکہ وہ بہت ضعیف اور کمزور ہے۔ البتہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”تم اس پادری کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“

ڈوکی نے سر جھٹکاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، فادر اسٹارک۔“

”میرا شک کسی اور پر ہے۔“ جوزف نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے کہ مسٹر رابرٹ نے کیا کیا تھا کہ سینٹ بیڈوگ ہمیں اس تصویر کی حفاظت کا طریقہ بتائے گی۔“

فادر ڈوکی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

”اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ آج مسٹر ہیک نے مینٹگ میں شرکت نہیں کی۔“

فادر ڈوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ بولا۔

”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مسٹر ہیک پادری کا روپ دھار کر گورڈن کے کمرے میں گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گورڈن نے وہ تصویر لی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہی ہوا ہے۔ اسی لیے مسٹر رابرٹ نے ایک دفعہ بھی گورڈن کا نام نہیں لیا اور سب کی توجہ بپ کی جانب کر دی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب وہ پینٹنگ مسٹر ہیک کے پاس ہے۔“ ڈوکی نے کہا۔

جوزف نے کہا۔ ”شاید یا پھر کسی ایسے شخص کے پاس جو اس کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو مسز ولنوک پولینڈ کی تاریخ اور اس کے اگلے سے اچھی طرح واقف ہے۔“

فادر نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ وہ کون ہے اور یہ پینٹنگ کیوں بیش قیمت ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ

پینٹنگ بیش قیمت کیوں ہے۔ ایک نوجوان پولش موسیقار نے ریڈ زری ول کی نوجوان بیٹی کے لیے دھنیں تیار کیں۔ اس نے ایک لوک دھن بھی تیار کی جو بہت مشہور ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے اور بھی دھنیں تخلیق کی تھیں جن میں پولینڈ کے اگلے کو بیان کیا گیا تھا لیکن وہ کم ہو گئیں۔“

”تم چو پن کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں اور اگر تمہیں یاد ہو کہ مسٹر گورڈن اس پینٹنگ کی پشت میں دھنیں لے رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس دھن کا کم شدہ ٹکڑا وہاں چھپا یا گیا تھا تاکہ وہ حملہ آوروں سے محفوظ رہے۔“

”چو پن.....“ فادر نے کہا۔ ”جو دارسا کے ہولی کر اس چرچ میں دفن ہے۔“

”ہاں اور اس کے لوگ گیتوں میں پولینڈ کے لوگوں کے جذبے اور بربادی کی پوری داستان بیان کی تھی ہے۔“

”کمرے کا دروازہ کھلا اور برادر لیو اندر داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور دونوں پادریوں کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔“

”مجھے یہ کام کل ہی کر لینا چاہیے تھا۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ فادر ڈوکی اور جوزف اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”اسی وجہ سے گورڈن زخمی ہوا لیکن وہ تصویر لے کر نہیں گیا تھا۔“

”پھر کون ہے؟“

”فادر سامنسن۔“

”اور وہ پینٹنگ کہاں ہے؟“

”راستے میں۔“ برادر لیو نے کہا۔ ”اسے پولینڈ لے جایا جا رہا ہے۔ فادر اسٹارک اسے لے کر گزشتہ شب روانہ ہو گیا ہے۔ فادر سامنسن نے مجھے بتایا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اسے یہ پینٹنگ پولینڈ واپس پہنچانی ہے۔“

”لہذا اسی لیے فادر سامنسن نے اسے چرچ سے ہٹا دیا۔“

برادر لیو نے اثبات میں سر ہلایا۔

فون کی کھنٹی بجی۔ فادر ڈوکی نے فون سننے کے بعد کہا۔ ”بپ بہت ناراض ہے۔ اس نے فادر سامنسن کو فون کر کے پوچھا کہ پینٹنگ کہاں ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ نہیں جانتا۔ اس وقت وہ کہاں ہے؟“

جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا لیکن اگر میں کبھی پولینڈ گیا اور مجھے ہولی کر اس چرچ جانے کا اتفاق ہوا تو میں اسے وہاں دیکھ سکوں گا۔“



# انجاشہ

ملک معصومہ حیات

سادگی کا چولا اور معصومیت کا روپ معاشرے میں انسان کو کتنا معتبر کر دیتا ہے... حتیٰ کہ وہ خطاوار ہو کر بھی سزاوار نہیں ٹھہر پاتا کیونکہ خود کو شک کے دائرے سے ہمیشہ دور رکھتا ہے مگر... کب تک۔ اس نے بھی شاید یہ نہ سوچا تھا کہ تفتیش کا جال دھیرے دھیرے ایک دن مجرم کو قید کر ہی لیتا ہے بس ذرا ہوشیار آفیسر کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر چالاک سے چالاک مجرم بھی ساری ہوشیاری بھول جاتا ہے۔ وہ تو پھر ایک سادہ فطرت اور معصوم صورت انسان تھا۔ بس ذرا کسی کے عشق میں ایسا قدم اٹھا بیٹھا جس کی نہ کوئی منزل تھی نہ مضبوطی۔

ایک لمحے ہوئے کس اور جس کے ہوئے

قندمیں کا انجاشہ

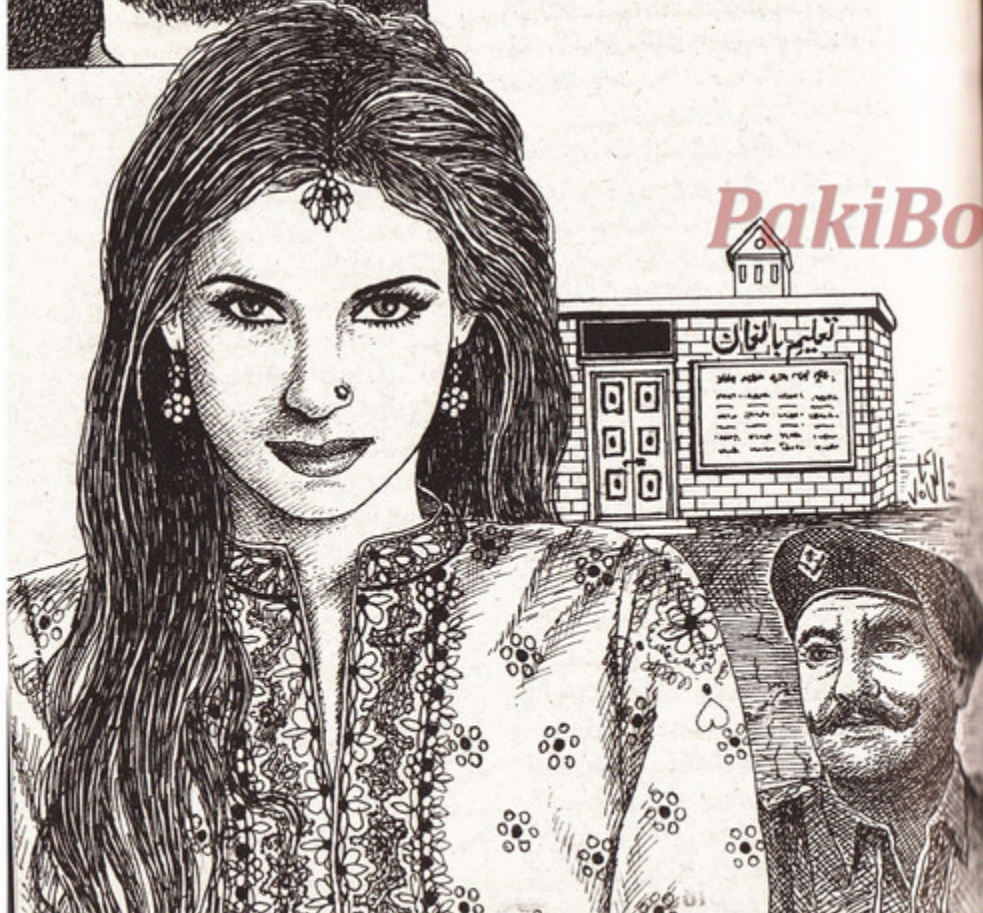
PakiBooks.Site

بجلی کی آنکھ چوٹی نے ملک کے طول و عرض میں آج کل عوام انسان کی زندگی کو پھر دغذاب کر رکھا ہے۔ جو لوگ صاحب حیثیت ہیں وہ بجلی کی کمی کو یو پی ایس اور جزیئر کی مدد سے پورا کر لیتے ہیں لیکن عوام کی اکثریت کا جینا دو بھر ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ یہ کہنت آتی کم اور جاتی زیادہ ہے۔ ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا، موضع کوٹ ڈوگراں کی بجلی چلی گئی ہے۔

ان دنوں میں قصبہ رسول پور تارڑ کے تھانے میں تعینات تھا۔ موضع کوٹ ڈوگراں میرے تھانے سے لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مذکورہ گاؤں کم و بیش پانچ سو نفوس پر مشتمل تھا۔ ایک مختار اندازے کے مطابق کوٹ ڈوگراں میں سو، سو اسو گھر ہوں گے۔ اطلاع کنندہ کا نشیل کو میں نے گھور کر دیکھا اور کہا۔

”ایقوب! کیا تم ہوش و حواس میں ہو؟“  
”جی ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

سپینس ڈائجسٹ 12 اگست 2018ء









تھا۔ اس سائڈ والے کمرے کے ساتھ ہی باورچی خانہ تھا۔ یہ پورا مکان بجلی مٹی سے تعمیر کیا گیا تھا اور خاصا ہوا دار تھا۔

خیردین کی بیوی بقیس ایک پست قامت خالص گھریلو عورت تھی، سادگی جس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خیردین سے اس راستے میں کافی بات چیت کر چکا تھا لیکن کام کی کوئی بات میرے ہتھے نہیں لگی تھی۔ اس حوالے سے بقیس نے بھی مجھے خاصا مایوس کیا۔ ان دونوں میاں بیوی سے حاصل ہونے والی معلومات کسی بھی زاویے سے گمشدہ بجلی کی بازیابی کے سلسلے میں کارآمد نظر نہیں آتی تھیں۔ دونوں کا بیان ملتا جلتا تھا۔ رات کو وہ تینوں گھر کے کچن میں سوئے تھے۔ لگ بھگ نصف شب یوندا باندی کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے اپنی چار پائیاں برآمدے میں لگا لیں اور گہری نیند سو گئے۔ صبح جب بقیس کی آنکھ کھلی تو بجلی اپنی چار پائی پر موجود نہیں تھی۔ بقیس نے خیردین کو چکا کر صورت حال سے آگاہ کیا اس کے بعد بجلی کی تلاش کا آغاز ہو گیا۔ وغیرہ!

”جب آپ لوگوں نے دیکھا کہ بجلی غائب ہے تو کیا تم دونوں میں سے کسی نے گھر کے داخلی دروازے کو چیک کیا تھا؟“ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”جی تھانے دار صاحب۔“ بقیس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بجلی کو گھر کے اندر نہ پا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا تھا اور وہ دروازہ بند تھا۔ اندر سے کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔“

میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا گھر کے اندر آنے یا باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“ وہ دونوں بیک زبان ہو کر بولے۔ ”نہیں جناب! بس، یہی ایک دروازہ ہے۔“

”مکان میں آمد و شد کا راستہ اگر اندر سے بند تھا اور اس دروازے پر کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجلی مذکورہ دروازے سے نہیں نکلی ہوگی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر کاشیبل کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”باسط اتم ذرا چھت پر جا کر گرد و نواں کا جائزہ لے کر آؤ۔“

”اوکے سر۔“ باسط یہ کہتے ہوئے میرے حکم کی تعمیل میں چل پڑا۔

میں نے خیردین کے مکان کا سروے کرتے ہوئے اس زینے کو دیکھا تھا جو بیٹھک اور ایک اندرونی کمرے کے بیچ میں سے اوپر کو جاتا تھا۔ باسط اسی کچے زینے کی جانب

بڑھا تھا۔ میں نے روئے سخن خیردین کی طرف موڑتے ہوئے گہری تنبیہ کی کہ۔

”تم نے بجلی کی تین گہری سہیلیوں کا ذکر کیا تھا۔ کیا وہ تینوں بھی کوٹ ڈوگر اس ہی میں رہتی ہیں؟“

”جی ہاں کل۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”فرزاند، صدف اور عارفہ دھری رہتی ہیں سرکار۔“

”ایک کام کرو۔“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”تم ان تینوں لڑکیوں کو یہاں لے آؤ۔ میں ان سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے، ان تینوں میں سے کوئی ضرور بجلی کے غیاب پر روشنی ڈال سکے گی۔ بس، مجھے ڈور کا کوئی ایسا سرا چاہیے جسے پکڑ کر میں دوسرے سرے تک پہنچ سکوں اور مجھے یقین ہے، تلاش کی اس ڈور کے دوسرے سرے بجلی سے لازماً ملاقات ہوگی۔“

خیردین اس انداز میں گردن کو حرکت دینے لگا جیسے میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔ اس نے فرماں برداری سے کہا۔

”ٹھیک ہے جناب۔ میں ابھی ان تینوں کو بلا کر لاتا ہوں۔“

خیردین کے جانے کے بعد میں نے بقیس کی معیت میں گھر کے اندرونی حصے کا بھی جائزہ لے لیا۔ مجھے کسی کمرے سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جو بجلی کی تلاش میں مددگار ثابت ہو سکتا۔ میں تمام کمروں کا گونا گونا جھانک کر برآمدے میں پہنچا تو چھت پر سے باسط کی آواز آئی۔

”ملک صاحب! آپ ذرا اوپر آئیں۔“

”خیریت۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

کاشیبل کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بقیس کو ادھر برآمدے ہی میں چھوڑا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے کچے زینے کی جانب بڑھا۔ خیردین کے مکان کی چھت عقب سے ایک دوسرے مکان کے ساتھ لی ہوئی تھی۔ میں نے باسط کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”ہاں بھئی باسط! بتاؤ تم مجھے کیا دکھانا چاہتے ہو؟“ وہ مجھے اپنے ساتھ خیردین کی چھت سے ملحقہ دوسری چھت کے کنارے پر لے گیا پھر ایک زینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ دیکھیں ملک صاحب۔ یہ زینہ اس پچھواڑے والے مکان کے اندر آتا ہے۔ خیردین کے گھر کا کوئی بھی

انجام بہ شر

فرد چھت کے راستے اس مکان میں یہ آسانی اتر سکتا ہے اور پھر اس مکان کا دروازہ کھول کر باہر جاسکتا ہے۔“

”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو۔“ میں نے باسط کی سوچ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے کہا۔ ”بجلی اس راستے کے ذریعے غائب ہوئی ہے۔؟“

”جناب! امیراؤ بن تو یہی کہہ رہا ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”بانی آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔“

کاشیبل باسط کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس گھر کے اندر اتر کر معلوم کیا ہے کہ وہاں کون رہتا ہے؟“

”نہیں ملک صاحب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کسی کے گھر میں اس طرح داخل ہونا مجھے اچھا نہیں لگا حالانکہ اس زینے سے نیچے اترنا بہت آسان کام ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو باسط۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بلا اجازت یوں کسی کے گھر میں اترنا سراسر غیر اخلاقی اور غیر قانونی فعل ہے۔“ لٹانی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم باہر جا کر پچھواڑے والے اس گھر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ میں جب تک بجلی کی ماں کو کریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔ میں جاتا ہوں اس طرف۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

”ہم دونوں چھت سے نیچے اتر آئے۔ اس دوران میں یوندا باندی کا سلسلہ رک گیا تھا۔ کاشیبل خیردین کے گھر سے نکلا تو میں بقیس کو لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

”بقیس بی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری بیٹی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے اور میری یہی کوشش ہے کہ جلد از جلد بجلی کو تلاش کر کے تمہارے حوالے کر دوں۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب۔“ وہ مغموم لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“

”اگر میں بجلی کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ تم پر میرا کوئی احسان نہیں ہوگا بقیس بی بی۔“ میں نے اپنا تپ بھرے انداز میں کہا۔ ”بلکہ اس طرح میں اپنا فرض نبھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ باقی جہاں تک تمہاری دعا

انجام بہ شر

کا تعلق ہے تو۔“ میں نے تھوڑی دیر کو رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اللہ تو سب کا بھلائی کرتا ہے لیکن انسان اکثر اپنے غلط فیصلوں کے ذریعے اپنا برا کر لیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔“

اس نے پلٹتیں جھپکائیں پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”تھانے دار صاحب، آپ کی آخری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر تم جانتی ہو کہ بجلی بازیاب ہو جائے تو تمہیں مجھ سے غلط بیانی نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا سچا اور کھ جواب چاہیے مجھے۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟“

”جی، اب آگئی سمجھ۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے دگی لہجے میں بولی۔ ”میں بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میری تو شہید خواہش ہے کہ بجلی ابھی اور اسی وقت مجھے مل جائے۔“

”ابھی اور اسی وقت بجلی نہیں ملی تو بھی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔“ میں نے حوصلہ بخش لہجے میں کہا پھر گھر کے داخلی دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”آج صبح جب تم دونوں میاں بیوی سو کر اٹھے تو دروازہ بند تھا اور اندر سے کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی لیکن بجلی غائب تھی۔ یہی نا؟“

”جی۔ ایسا ہی ہے۔“ وہ نجف سی آواز میں بولی۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ بجلی گھر کے دروازے سے باہر نہیں گئی۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اور یہ بھی طے ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اگر اس کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہو تو یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ دونوں اس بجرمانہ کارروائی سے بے خبر رہتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں، اس کڑی نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ بس، میں تو یہی دعا کر رہی ہوں کہ اللہ خیر کرے اور میری بجلی صحیح سلامت ہو۔“

”بقیس بی بی! امیری بات غور سے سنو۔“ میں نے کسمیر انداز میں کہا۔ ”مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ

انجام بہ شر



”بابا جلالہ فجر کی نماز گاہوں کی مسجد میں باجماعت ادا کرتا ہے ملک صاحب۔“ کاشیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلے گا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نہ صرف یہ کہ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا تھا بلکہ اس کی کنڈی بھی چڑھا دی تھی۔“

”اوہ.....“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر بتقیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بجلی کس راستے سے گئی ہے یہ تو پتا چل گیا۔ اب مجھے سراغ لگانا ہے اس بندے کا جس کے ساتھ وہ فرار ہوئی ہے۔ اگر وہ بندہ مجھے لے گیا اور مجھے تعین ہے کہ وہ ضرور ملے گا تو.....“ بجلی بھی اس کے ساتھ ہی ملے گی۔“

”آپ..... یہ کہنا چاہ..... رہے ہیں کہ.....“ بتقیں بی بی بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”بجلی گھر سے بھاگ گئی ہے.....“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ بجلی اپنی مرضی سے غائب ہوئی تھی۔ گھر میں اس کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا جو سچا جاتا کہ وہ فرار یا خودکشی کے ارادے سے نکلے ہوگی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی اور یہ ”کسی“ میرے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ بجلی کی گمشدگی کا متحرک تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر بجلی کو باز یاب کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ یہی ملے تھا کہ وہ ”کسی“ اگر مومن کوٹ ڈوگراں کا دستیک تھا تو وہ بھی بجلی کی طرح گاؤں سے غائب ہوگا۔

لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد خیر دین دو لڑکیوں کو لے کر آگیا۔ ان میں سے ایک صدف اور دوسری عارفہ تھی۔ فرزانہ کے بارے میں خیر دین نے بتایا کہ اس کا بچہ بیمار ہے اس لیے وہ اپنے بچے کو چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ فرزانہ شادی شدہ تھی اور اس کا ایک سال کا ایک لڑکا تھا۔ فرزانہ کی شادی دو سال پہلے ہی گاؤں کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ صدف اور عارفہ، بجلی کی طرح ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں۔ ان کی عمریں علی الترتیب اٹھارہ اور سترہ سال تھیں۔

میں میں انہیں منٹ تک ان دونوں لڑکیوں کا انٹرویو کرتا رہا لیکن مجھے کوئی بھی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے بجلی کی تلاش میں کوئی مدد مل سکتی۔ صدف کے حوالے سے ان دونوں کا موقف بھی وہی تھا جو بتقیں کا تھا۔ انہوں نے اس

اوائے کہا۔ ”میں نے تھوڑی دیر پہلے کسی دوسرے راستے کا کر لیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، بجلی تم دونوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے مکان کی چھت پر پہنچی ہوگی اور پھر بابا جلالہ کے مکان میں اتر کر اس کے دروازے سے باہر نکل گئی ہوگی۔ کیا تم لوگوں نے بابا جلالہ یا اس کے گھر والوں سے پوچھ گچھ کی؟“

”بابا جلالہ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے۔“ بتقیں نے بتایا۔ ”اس نے شادی نہیں کی اس لیے بیوی بچوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے قریبی رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ ہم نے اسے ہمیشہ اکیلا ہی دیکھا ہے۔“

بتقیں کی زبانی مجھے بابا جلالہ کے بارے میں مزید پتا چلا کہ اس کا اصل نام جمال دین تھا لیکن وہ بابا جلالہ کے نام سے کوٹ ڈوگراں میں مشہور تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے چھوڑ تھی۔ اس نے ایک گدھا پال رکھا تھا جو اس کے لیے سواری اور دھندے کے کام آتا تھا۔ بابا جلالہ اپنے گھر میں مٹی کے برتن تیار کرتا تھا اور پھر ان برتنوں کو گدھے پر لاؤ کر گاؤں گاؤں محوم کر انہیں فروخت کر کے اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتا تھا۔ اپنے گھر کے سارے کام صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا بابا جلالہ اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے حال میں مست رہنے والا بندہ تھا۔ بابا جلالہ وقت نمازی بھی نہیں تھا۔

میں بتقیں بی بی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا کہ کاشیبل لوٹ آیا۔ اس دوران میں باسط نے بابا جلالہ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات اکٹھا کر لی تھیں جو بتقیں کے بیان سے لگ بھگ تھیں۔ باسط نے بابا جلالہ سے بات بھی کی تھی۔ مجھے کاشیبل کے چہرے پر دبا دبا سا جوش دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس کوئی خاص خبر ہے۔ میں نے اسے کرارے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بھئی! اور کی کیا رپورٹ ہے؟“

”میرا اندازہ صد فیصد درست نکلا ملک صاحب!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”بجلی آدھی رات کے بعد اور فجر کی اذان سے پہلے کسی وقت اپنے گھر سے بابا جلالہ کے گھر میں پہنچی تھی اور پھر اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔“

”کیا بابا جلالہ نے بجلی کو اپنے گھر سے نکلنے دیکھا تھا؟“

”جی ہاں! میں نے اسے نظر اری لہجے میں استفسار کیا۔ ”یا اس نے بجلی کو چھت سے اپنے گھر میں اترتے دیکھا ہو.....!“

”ایسی کوئی بات نہیں ملک صاحب۔“ وہ رسائیت برے لہجے میں بولا۔

میں پوچھے بغیر بندہ سکا۔ ”پھر کیسی بات ہے باسط؟“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے استفسار کیا۔ ”البتہ کیا؟“

”خادم حسین کو چوان کا لڑکا بجلی میں دلچسپی رکھتا تھا۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”لیکن بجلی نے مجھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

”خادم حسین کے لڑکے کا نام کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اور وہ کیا کرتا ہے؟“

”اس کا نام اصغر ہے جی۔“ بتقیں نے بتایا۔ ”اور وہ بس آوارہ گردی کرتا ہے یا پھر بجلی کو کچھ رکھنڈی آہیں بھرتا ہے۔“

بجلی کی گمشدگی کا معاملہ رفتہ رفتہ ڈھب پڑ رہا تھا۔ اصغر کا نام سامنے آنے پر مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ بعد ازاں یہ لڑکا اس کیس کی ایک کڑی ثابت ہوگا۔ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے بتقیں بی بی سے پوچھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بجلی بھی اصغر میں دلچسپی رکھتی ہو؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا نے دار صاحب!“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہی ہو؟“

”میں نے اور خیر دین نے اس کے حوالے سے بجلی سے بات کی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”بجلی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اصغر کو پسند کرتی ہے۔ اگر بھی خادم حسین کو چوان یا اس کی بیوی زبیدہ اصغر کا رشتہ لے کر آئیں تو ہم انہیں واضح طور پر جواب دے دیں۔ اگر بجلی کی اصغر میں ذرا سی بھی دلچسپی ہوئی تو وہ اتنی سخت بات بھی نہ کرتی۔“

”مختلف طور پر تو تمہاری بات بالکل درست ہے بتقیں بی بی۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دل کے معاملات میں منطق اور عقل کی نہیں چلتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بجلی بھی اصغر کو پسند کرتی ہو اور اس نے اپنی پسندیدگی کو چھپانے کے لیے اس قسم کی بات کی ہو.....!“

”آپ کی مرضی ہے جو بھی سمجھیں تھانے دار صاحب۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے حقیقت آپ کو بتادی ہے۔“

”تمہارے گھر کے پیچھے کس کا مکان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں بابا جلالہ رہتا ہے۔“ بتقیں نے بتایا۔ ”آپ

نے سوال کیوں کیا؟“

”تمہارے گھر کی چھت بابا جلالہ کے گھر کی چھت کے

ساتھ ملی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے

بجلی جہاں بھی ہے، صبح سلامت اور بخیریت ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور میں نے اس کے جانے کا راستہ بھی دریافت کر لیا ہے۔“

”کون سا راستہ؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”وہ راستہ میں بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس سے پہلے تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا اور..... بہت سوچ کچھ کہ جواب دینا ہوگا کیونکہ اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر بجلی تمہیں بھی نہیں ملے گی۔“

آخری جملہ میں نے اس کے جذبات میں پھل چانے کے لیے ادا کیا تھا۔ اس جملے کا بتقیں پر گہرا اثر ہوا اور وہ تڑپ کر بولی۔

”تھانے دار صاحب! آپ ایسی بات تو نہ کریں۔ بجلی ہماری بہت ہی لاڈلی بیٹی ہے۔ ہم اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ رو دھانی ہو گئی۔ ”آپ کسی بھی طرح بجلی کو ڈھونڈ نکالیں۔ میں سوئے رب کی قسم کھاتی ہوں کہ آپ مجھ سے جو بھی سوال کریں گے، میں اس کا سولہ آنے سچا اور گہرا جواب دوں گی۔“

”بجلی کی ابھی کہیں مشکلی نہیں ہوئی..... اور ابھی تک آپ لوگوں کے سامنے اس کا کوئی رشتہ بھی موجود نہیں۔“ میں نے انہی کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”لیکن حالات و واقعات یہ بتاتے ہیں کہ بجلی اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کسی کے ساتھ گئی ہے..... کسی مرد کے ساتھ!“

بتقیں بی بی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میں نے جو نکتہ اٹھایا تھا اس کے حوالے سے بتقیں کے ذہن میں کچھ تھا ضرور۔ وہ چند لمحات تک توتلی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر سرسراہتی ہوئی آواز میں بولی۔

”لگ..... کون..... کس کے ساتھ گئی ہے وہ.....!“

”یہ تو تم نے مجھے بتانا ہے بتقیں بی بی!“ میں نے غصہ بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں کوٹ ڈوگراں میں بجلی مرجہ آیا ہوں۔ یہاں کے کسی مرد سے واقف نہیں ہوں میں۔ تم بتاؤ، کیا بجلی کا گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ کوئی چکر چل رہا تھا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ

جلدی سے بولی۔ ”میری بجلی کا کسی مرد میں دھیان نہیں تھا،

ہاں البتہ.....!“



امر کی تصدیق کی کہ اصغر، بجلی سے محبت کا دعوے دار تھا لیکن بجلی کو اس کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ اصغر کا یکطرفہ عشق تھا۔ اس صورت حال نے میرے ذہن کو الجھا دیا اور میں خیر دین کے گھر سے نکل کر خادم حسین کو چوان کے گھر کی سمت چل پڑا۔ اصغر، خادم حسین کا بیٹا تھا۔

خادم حسین کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم ایک منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت خادم حسین گھر کے اندر موجود نہیں تھا تاہم اس کی بیوی زبیدہ کو جب پتا چلا کہ میں اس علاقے کا تھا تو اس نے مجھے اور بجلی کی گمشدگی کے حوالے سے نفی تیش کر رہا ہوں تو اس نے مجھے اور باسط کو گھر کے اندر بلا لیا۔ ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد اس نے بتایا۔

”خادم حسین تانگا لے کر گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی شام تک ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں زبیدہ بی بی۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تم ہی سے چند سوال کر لیتا ہوں۔ آخر اصغر تمہارا بیٹا بھی تو ہے۔“

میں نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور بولی۔ ”جی، بالکل۔ اصغر میرا اور خادم حسین کا بیٹا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ تو بجلی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں پھر میرے اصغر کا کیا ذکر.....؟“

زبیدہ کی عمر پینتالیس سال رہی ہوگی۔ وہ سانولے رنگ کی ایک فربہ اور پست قامت عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص نوعیت کی ہوشیاری پائی جاتی تھی۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ اصغر کے علاوہ ان کے دو بچے اور بھی تھے اور یہ دونوں لڑکیاں تھیں۔ پندرہ سال کی زبینہ اور بارہ سال کی نسیم۔ اصغر کم و بیش بیس سال کا تھا۔

”جب تمہارے بیٹے کا نام بجلی کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو پھر بجلی کی گمشدگی پر سب سے پہلے اصغر ہی کا ذکر آئے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ہے کہ نہیں؟“

”یہ کیا بات کر دی آپ نے۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اصغر کا بجلی سے کیا واسطہ.....!“

”واسطہ ہے تو میں تمہارے دروازے تک پہنچا ہوں تا۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے بیٹے کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ اصغر بجلی کے عشق میں گرفتار تھا۔“

”یہ اصغر کا پاگل پن ہے تمہانے دار صاحب۔“ وہ

اکٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں ہزار بار اس نالائق کو سمجھا چکی ہوں کہ عشق و شوق کے چکر میں سوائے خواری کے کچھ نہیں رکھا۔ میں نے کیا کھٹ لیا جو وہ کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے گا۔“

بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں ادا سی اتر آئی تھی۔ میرے کیریدنے پر اس نے بتایا کہ اس نے خادم حسین سے محبت کی تھی۔ ان کی شادی بھی ہوئی لیکن زبیدہ کے بیان کے مطابق خادم حسین نے اس کی وہ قدر نہیں کی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ پھر زبیدہ کو یہ بھی افسوس تھا کہ خادم حسین میں ترقی کرنے کے جراثیم نہیں تھے۔ وہ کوچوانی میں خوش تھا جبکہ زبیدہ کی خواہشات کہیں زیادہ تھیں۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ عاشقی اصغر کی کھٹی میں شامل ہے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”وہ اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھا رہا ہے.....؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تمہانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اصغر اندھا ہو گیا ہے جو بجلی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے ورنہ وہ لڑکی اس قابل نہیں کہ اسے کوئی ایسے گھر کی عزت بنائے۔“

یہ ایک نئی بات سامنے آئی تھی۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے زبیدہ کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیوں..... بجلی میں ایسی کون سی خرابی ہے کہ اسے گھر کی عزت نہیں بنایا جاسکتا؟“

”بس رہنے دیں تمہانے دار صاحب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”میرا منہ نہ کھلوا میں تو اچھا ہے۔“

”میرے خیال میں تم منہ کھول ہی تو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ہو سکتا ہے، میں حقیقت کی تہ میں اتر کر بجلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں.....!“

”پتا نہیں جناب، اس بجلی نے کیسے کیسے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ”پچھلے دنوں تار انے میرے پتر کو سنگین نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔“

زبیدہ بی بی ایک پر ایک انکشاف کیے جا رہی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ تار کون ہے؟“

”نذیراں ماچھن کا لڑکا۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ”نام تو اس کا ستارے لیکن پورے پنڈ میں وہ تار کے نام سے مشہور ہے۔ اکثر لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بڑا بد معاش بنا پھر تا ہے۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ میں نے اس کے بیان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تار انے تمہارے بیٹے



کو کیوں دھمکی دی تھی؟“

”تارا نے اسفر سے کہا کہ بجلی سے دور رہو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ اس نے بتایا۔ ”تارا بجلی کو اپنی جان کا سمجھتا ہے۔“

”میں نے بجلی کے معاملے میں خیر دین اور بقیے سے تفصیلی بات کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے تارا کا کوئی ذکر نہیں کیا اور تم کہہ رہی ہو کہ تارا بجلی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے؟“

”وہ دونوں اپنی اکلوتی بیٹی کے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ”انہوں نے بے جالا ڈیپار سے بجلی کو لگا ڈیا ہے۔ وہ خود اور صدفی بن چکی ہے مگر خیر دین اور بقیے اسے ابھی تک دودھ پیتی معصوم بچی سمجھتے ہیں۔“

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ زبیدہ بجلی اور اس کے والدین کے لیے اپنے دل میں ایسے جذبہ بات نہیں رکھتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ بجلی نے اس کے بیٹے کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس معاملے میں ماہیں بہت حساس ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کا بیٹا اپنی منکوحہ میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تو انہیں پریشانی لاحق ہو جاتی ہے، بجلی تو پھر بھی ایک غیر لڑکی تھی۔

”زبیدہ!“ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ”میں تارا کو خود دیکھ لوں گا کہ وہ کتنا بڑا بد معاش ہے۔ ابھی تو میں تمہارے بیٹے سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ بتاؤ اصغر کہاں ہے؟“

”اصغر تو گھر میں نہیں ہے جی۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ اس کے جواب نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ گھر میں نہیں تو پھر کدھر گیا ہے؟“

”وہ پنڈی بھٹیاں گیا ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کب گیا ہے وہ پنڈی بھٹیاں؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میرا اتنا نہجی رسول پور تارڈ پنڈی بھٹیاں اور حافظ آباد کے درمیان واقع تھا۔ کوٹ ڈوگر اس سے پنڈی بھٹیاں جانے کے لیے رسول پور تارڈ سے گزرنا پڑتا تھا۔

”اصغر کل دوپہر میں گھر سے نکلا تھا جی۔“ زبیدہ نے بتایا۔ ”ادھر پنڈی بھٹیاں میں میری بڑی بہن صفیہ رہتی ہے۔“ اصغر اپنی خالہ کے پاس دو چار دن کے لگا۔

پھر زبیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بڑا عجیب اتفاق نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ چند لمحات تک حذب نظر سے مجھے جھکتی رہی پھر شک آلود لہجے میں بولی۔ ”کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ اصغر، بجلی کو بھگا کر لے گیا ہے؟“

”بالکل، میں ایسا ہی سوچ رہا ہوں زبیدہ بی بی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”آپ میرے پتر کو اس معاملے میں نہ ٹھنسیں جی۔ بجلی نے سچی اسے گھاس نہیں ڈالی، اس کے ساتھ بھاگے گی کیسے!“

”میں نے ایک امکانی بات کی ہے۔“ میں نے۔۔۔ بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں گہرا رابطہ ضابطہ ہو مگر بجلی نے اس بات کو گاؤں والوں سے چھپا رکھا ہو۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا نہ دار صاحب۔“ وہ پورے یقین سے بولی۔ ”میں اصغر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کی تسلی کے لیے میں آپ کو صفیہ کا مکمل ایڈریس دیتی ہوں۔ آپ پنڈی بھٹیاں جا کر چیک کر لیں۔ انشا اللہ! میرا بیٹا آپ کو ادھر ہی ملے گا اور بجلی اس کے ساتھ نہیں ہوگی۔ صفیہ آپ کو یہ بھی بتائے گی کہ اصغر کل کتنے بجے وہاں پہنچا تھا۔“

”وہ تو میں لازمی چیک کروں گا۔“ میں نے غصے لہجے میں کہا۔ ”دیے تمہارا کیا خیال ہے، اگر بجلی اصغر کے ساتھ نہیں گئی تو پھر وہ کہاں غائب ہوئی ہے؟“

”میری جوتی جانے وہ کہاں غرق ہوئی ہے۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”اس کمینے نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ جب تک وہ گاؤں میں بھی تو میرے اصغر کو اس نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اب کہیں دفع ہوئی ہے تو پولیس ہمارے دروازے پر آگئی ہے۔۔۔۔۔ پھر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں بولی۔

”میرے سونہریا! ہمیں اس مصیبت سے نکال۔۔۔۔۔!“ میں مزید پندرہ تیس منٹ تک زبیدہ سے سوال و جواب کرتا رہا تاہم کوئی مفید بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے پنڈی بھٹیاں میں اس کی بہن صفیہ کا ایڈریس نوٹ کیا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔

اگر بجلی کسی بھی زاویے سے اصغر میں کوئی دلچسپی نہیں

انجام دے رہی تھی تو پھر ان کا ایک ساتھ کہیں جانا خارج از امکان تھا کیونکہ ان کے کوٹ ڈوگر اس سے نکلنے کے اوقات میں کم از کم بارہ گھنٹے کا فرق تھا۔

”ملک صاحب! اب کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟“ اس نے مجھے سے پوچھا۔ ”بجلی کا معاملہ تو ایک جگہ آ کر رک گیا ہے۔ کیا آپ دوبارہ خیر دین کے گھر جا رہے ہیں؟“

”اگر خیر دین سے ملاقات کی ضرورت پیش آئی تو ادھر کا پھر بھی لگا نہیں گے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فی الحال تو میں تارا کی خبر لینا چاہتا ہوں۔ ذرا پتا تو چلے کہ وہ بجلی کا چوکیدار کیوں بنا ہوا ہے۔ اگر زبیدہ نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو مجھے امید ہے، تارا سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوگی۔“

خادم حسین کو چوان کے گھر سے نکلنے ہوئے میں نے زبیدہ سے نذیراں ماچھن کے گھر کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ تارا، نذیراں ماچھن کا انکوٹا اور بگڑا ہوا بیٹا تھا اور مبینہ طور پر وہ گاؤں میں فنڈا گردی کرتا تھا۔

”مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ کانٹنیل نے تائیدی انداز میں کہا۔

اس وقت یوندا باغی کا سلسلہ رکا ہوا تھا تاہم ابھی تک آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یعنی کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ نذیراں ماچھن کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوئے تو ایک دروازہ قامت شخص نے میرے نزدیک آ کر شانت لہجے میں کہا۔

”السلام علیکم تھانے دار صاحب!“ اس شخص نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور عریض تھیں اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن فوری طور پر یاد نہ آ سکا کہ آج سے پہلے ہماری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔

”والیکم السلام!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا نام ماسٹر عنایت ہے۔“ وہ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بدستور شانت انداز میں بولا۔ اس نے میری نگاہ میں جیسے استفسار کو پڑھ لیا تھا اسی لیے اس نے اپنا تعارف کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اپنی بات چیت اور انداز سے وہ ایک تعلیم یافتہ اور سمجھ دار انسان لگتا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”ماسٹر صاحب! مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں؟“

”یہ ہماری پہلی ملاقات ہے جناب۔“ وہ رسائیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کچھ دیر پہلے مجھے خیر دین کے گھر کے آس پاس دیکھا ہو۔ جب مجھے پتا چلا کہ تھانے دار صاحب بجلی کی کمشدگی کے سلسلے میں تفتیش کرنے کوٹ ڈوگر اس آئے ہیں تو میں اپنے گھر سے نکل کر سیدھا خیر دین کے گھر پہنچا تھا لیکن جب تک آپ خادم حسین کے گھر کی طرف چل پڑے تھے چنانچہ میں بھی ادھر ہی آگیا اور اب آپ سے ملنے کا موقع میسر آگیا۔“

اس کی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے ٹوٹنے والے انداز میں پوچھا۔ ”ماسٹر جی! خیریت تو ہے نا۔ آپ مجھ سے ملنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہو رہے تھے؟“

”خیریت کہاں ہے جناب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس گاؤں سے ایک جوان جہان لڑکی غائب ہوئی ہے۔ میں آپ سے اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ پتا چلے، آپ نے بجلی کی تلاش کے سلسلے میں اب تک کیا پیش رفت کی ہے۔۔۔۔۔ لہذا فی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”کوٹ ڈوگر اس ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ہم سب لوگ یہاں ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا اور حتی المقدور دوسرے کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ میں جانتا ہوں، بجلی کی کمشدگی کو خیر دین اور بقیے سخت پریشان ہیں۔ مجھے بھی اس واقعے کا سخت افسوس ہے۔ اگر میں بجلی کی تلاش کے حوالے سے آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو مجھے ضرور بتائیں۔ آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔“

ماسٹر عنایت ایک پر غلوص اور ہمدرد انسان ہونے کے ساتھ ساتھ سخت باتوئی شخص بھی تھا۔ بہر حال اس کے اخلاص اور انسان دوستی کے پیش نظر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ماسٹر جی! آپ کی اس پر غلوص پیشکش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اگر آپ کا تعاون بجلی کو ڈھونڈنے میں مفید ثابت ہوا تو یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ کوٹ ڈوگر اس پر بھی آپ کا احسان ہوگا لیکن اس ڈگر پر قدم رکھنے سے پہلے آپ کو چند باتیں ذہن نشین کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کون سی باتیں جناب؟“



”بکلی نہ تو غائب ہوئی ہے اور نہ ہی اس کی غیر موجودگی کو گمشدگی کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اب تک کی تحقیق کے مطابق وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی اور خوشی سے گئی ہے اور اس امر میں مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ کوٹ ڈوگراں کے کسی وسٹیک کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے اور ظاہر ہے، وہ جس شخص کے ساتھ بھی گئی ہے وہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں ہوگا۔“ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”اوہ۔۔۔“ وہ ایک پرتشویش اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے تھانے دار صاحب۔ آپ اسی لیے خادم حسین کے گھر گئے تھے کیونکہ اس کا بیٹا اصغر اس وقت کوٹ ڈوگراں میں موجود نہیں۔“

”بالکل ٹھیک!“ میں نے ماسٹر عنایت کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”بکلی کی ماں نے مجھے بتایا ہے، اصغر بکلی پر بری طرح فریفتہ تھا لیکن اصغر کی ماں نے بتایا ہے کہ بکلی کی گمشدگی سے بارہ گھنٹے پہلے اصغر اپنی خالہ سے ملنے پنڈی بھٹیاں چلا گیا تھا یعنی گزشتہ روز دوپہر میں اور اب زبیدہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ تارا بد معاش بھی بکلی پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا اور چند روز پہلے اس نے اصغر کو کوئی خطرناک دھمکی بھی دی تھی۔ اس نے اصغر سے کہا تھا کہ وہ بکلی سے دور رہے یعنی تارا بھی بکلی کا امیدوار ہے اسی لیے میں نذیراں ماچھن کی طرف جا رہا ہوں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”زبیدہ نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی۔ میں نے بھی کل دوپہر کے بعد سے اصغر کو گاؤں میں نہیں دیکھا اور۔۔۔ تارا کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ جو بچے باپ کی عدم موجودگی میں پل بڑھ کر جوان ہوتے ہیں ان کی شخصیت میں بہت سی کمی رہ جاتی ہے۔ اولاد کی صحت مند پرورش کے لیے سر پر باپ کا سایہ قائم ہونا بہت ضروری ہے۔ اس سمجھنے نے دو تین بار میرے ساتھ بھی بدتمیزی کی ہے۔ اس کے بعد سے میں نے اس سے کتراتا شروع کر دیا ہے۔ تارا کو آپ ایک بگڑا ہوا جوان سمجھ لیں۔“

”ماسٹر جی! بگڑے ہوئے انسانوں کو سیدھا کرنا مجھے خوب آتا ہے۔“ میں نے فطرتی انداز میں کہا۔ ”تارا کی آپ گھر نہ کریں۔ اسے میں دیکھ لوں گا۔ آپ نے رضا کارانہ طور پر تعاون کی پیشکش کی ہے تو پھر اپنا کام بھی سمجھ لیں۔“

وہ ہنسنے لگا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دھم کریں جناب۔“

”آپ کوٹ ڈوگراں کے اسکول ماسٹر ہیں۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”کسی بھی اسکول میں پڑھانے والا وہاں کے ایک ایک فرد سے اچھی طرح واقف۔۔۔“

”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ میں کوٹ ڈوگراں میں بسنے والے ایک ایک بندے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”جب یہاں کوئی اسکول ہی نہیں تو پھر آپ کس چیز کے ماسٹر ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جناب! اصل بات یہ ہے کہ میں اس گاؤں کا واحد پڑھا لکھا آدمی ہوں اس لیے لوگوں نے میرا نام ماسٹر رکھ دیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام تو عنایت ہے مگر کوٹ ڈوگراں میں ”ماسٹر عنایت“ کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ گاؤں میں ایک اسکول ہو مگر یہاں کے لوگوں میں اپنی اولاد کو پڑھانے لکھانے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو یہاں آکر پچیس گیا ہوں۔ بس، صفدر واپس آجائے، پھر میں چلا جاؤں گا۔“

”کیا آپ کا تعلق کوٹ ڈوگراں سے نہیں ہے؟“ وہ باتوں میں شخص ذرا دیر تو سمجھتا ہوں نے پوچھا۔

”نہیں جناب! وہ فیملی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کچھ عرصہ پہلے میں اپنے ایک دوست صفدر سے ملنے یہاں آیا تھا۔ پھر ایک روز صفدر کہیں چلا گیا اور میں اس کی راہ دیکھ رہا ہوں لیکن میں جب سے یہاں ہوں، میں نے اس گاؤں میں علم کی شمع روشن کر رکھی ہے۔ میرے بار بار کے سمجھانے پر کچھ لوگ میرے پاس پڑھنے آنے لگے ہیں مگر وہ سب بڑی عمر کے ہیں۔ آپ میرے اس مشن کو تعلیم بالغاں کہہ سکتے ہیں۔“

وہ اللہ کا بندہ شروع ہوتا تھا تو پھر کہنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر اسنا پڑ گانے کی غرض سے کہا۔

”ماسٹر جی! تعلیم بالغاں اور تعلیم مظالم پر ہم پھر کسی وقت فرصت میں تفصیلی بات کریں گے۔ فی الحال، میرے لیے سب سے اہم معاملہ بکلی کو صومند کانا ہے اور اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ آپ کوٹ ڈوگراں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب آپ میری بات دھیان سے سنیں۔“

لحائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی تو وہ منظر نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ قبل اس کے کہ اس کی زبان کا فٹل کھل جاتا، میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

انجام بہ شر

”یہ بات تو میں طے کر چکا کہ بکلی گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگی ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ بکلی کو بھگا کر لے جانے والا بندہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں۔ میں نے اصغر کے گھر کو چیک کر لیا ہے اور اب نذیراں ماچھن کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں خیر دین کے گھر جاؤں گا۔ آپ کے پاس لگ بھگ ایک گھنٹا ہے۔ اس دوران میں آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس وقت کوٹ ڈوگراں کے کتنے مرد گاؤں میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کے لیے یہ کام مشکل تو نہیں ہوگا۔۔۔؟“

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے سر کو ہٹائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ فکری نہ کریں تھانے دار صاحب۔ میں ایک گھنٹے سے پہلے آپ کو پورٹ پیش کرتا ہوں۔“

”اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنے ذہن میں یہ نکتہ بھی محفوظ رکھنا ہے۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”اصغر اور تارا کے علاوہ گاؤں کا اور کون کون سا مرد بکلی کو پسند کرتا تھا یا یہ کہ بکلی یہاں کے کس بندے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ آپ میری بات تو سمجھ گئے ہوں گے؟“

”جی بالکل۔“ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا تھانے دار صاحب۔ ”وہ پوچھنا تو کچھ عجیب تھا۔“

ماسٹر عنایت کے جانے کے بعد کا فٹیل باسط نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ بندہ تو کام کا لگتا ہے۔“

”ابھی صرف لگتا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جب ماسٹر عنایت کوئی کام کر دکھائے گا تب اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ بندہ کام کا ہے یا نہیں!“

”یہی آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ملک صاحب!“ باسط نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جب ہم نذیراں ماچھن کے گھر پہنچے تو وہ اپنے کام سے ”فارغ“ ہو چکی تھی اور تارا مچھنی کے ایک تسلے میں آنے والے ہاتھ دھو رہی تھی۔ نذیراں نے اپنے گھر کے باہر گلی میں دروازے کے قریب ہی تورو لگا رکھا تھا جہاں وہ گاؤں والوں کے لیے روٹی لگانے کی خدمات انجام دیتی تھی۔ خود کو اور تورو کا بارش اور دھوپ سے بچانے کے لیے نذیراں نے تورو کے اوپر ایک چھپر سا ڈال رکھا تھا۔ نذیراں کے علاوہ بعض لوگوں نے اپنے گھروں کے اندر بھی تورو لگا رکھے تھے۔ نذیراں یہ کام کاروباری بنیادوں پر جاری رکھے ہوئے تھی۔

”یہ بات تو میں طے کر چکا کہ بکلی گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگی ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ بکلی کو بھگا کر لے جانے والا بندہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں۔ میں نے اصغر کے گھر کو چیک کر لیا ہے اور اب نذیراں ماچھن کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں خیر دین کے گھر جاؤں گا۔ آپ کے پاس لگ بھگ ایک گھنٹا ہے۔ اس دوران میں آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس وقت کوٹ ڈوگراں کے کتنے مرد گاؤں میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کے لیے یہ کام مشکل تو نہیں ہوگا۔۔۔؟“

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے سر کو ہٹائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ فکری نہ کریں تھانے دار صاحب۔ میں ایک گھنٹے سے پہلے آپ کو پورٹ پیش کرتا ہوں۔“

”اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنے ذہن میں یہ نکتہ بھی محفوظ رکھنا ہے۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”اصغر اور تارا کے علاوہ گاؤں کا اور کون کون سا مرد بکلی کو پسند کرتا تھا یا یہ کہ بکلی یہاں کے کس بندے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ آپ میری بات تو سمجھ گئے ہوں گے؟“

”جی بالکل۔“ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا تھانے دار صاحب۔ ”وہ پوچھنا تو کچھ عجیب تھا۔“

ماسٹر عنایت کے جانے کے بعد کا فٹیل باسط نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ بندہ تو کام کا لگتا ہے۔“

”ابھی صرف لگتا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جب ماسٹر عنایت کوئی کام کر دکھائے گا تب اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ بندہ کام کا ہے یا نہیں!“

”یہی آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ملک صاحب!“ باسط نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جب ہم نذیراں ماچھن کے گھر پہنچے تو وہ اپنے کام سے ”فارغ“ ہو چکی تھی اور تارا مچھنی کے ایک تسلے میں آنے والے ہاتھ دھو رہی تھی۔ نذیراں نے اپنے گھر کے باہر گلی میں دروازے کے قریب ہی تورو لگا رکھا تھا جہاں وہ گاؤں والوں کے لیے روٹی لگانے کی خدمات انجام دیتی تھی۔ خود کو اور تورو کا بارش اور دھوپ سے بچانے کے لیے نذیراں نے تورو کے اوپر ایک چھپر سا ڈال رکھا تھا۔ نذیراں کے علاوہ بعض لوگوں نے اپنے گھروں کے اندر بھی تورو لگا رکھے تھے۔ نذیراں یہ کام کاروباری بنیادوں پر جاری رکھے ہوئے تھی۔



باورچی خانے وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا تیار کرنے کے لیے اس کا تنور ہی کافی تھا۔ تاہم صحن کی ایک دیوار کے ساتھ میں نے چولہا بنا دیکھا تھا اور اس کے نزدیک ہی چند برتن بھی نظر آرہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک پینڈ پب بھی نصب تھا جس کے نیچے پتھر کا ایک دو فٹ چوڑا مستطیل ٹکڑا پڑا تھا جو یقیناً برتن اور کپڑے دھونے کے لیے ایک پلیٹ فارم کا کام دیتا تھا۔ گھر کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس وقت ہم تینوں کے سوا اس گھر کے اندر اور کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔

”آدمی بات والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا نے دار صاحب!“ وہ ابھن زدہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کہا کہ کچھ کھلائے پلائے بغیر مجھے جانے نہیں دوگی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میری بات کی تھی نا تم نے؟“

وہ تیزی سے پلٹیں چھپکاتے ہوئے بولی۔ ”جی!“ ”بس تو پھر تمہاری آدمی بات کا مطلب یہ ہوا کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس“ کھلائے پلائے“ میں سے“ کھلائے“ کو نکال دو اور ”پلائے“ کی مدد میں ہمیں ٹھنڈا پانی پلا دو۔“

”اوہ..... ٹھیک ہے جی۔“ وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ لوگوں کے لیے چائے کی ٹھنڈی مکینیں لے کر آتی ہوں۔“

اگلے چند لمحات میں نذیراں ماچھن ہمیں مکھن والی ڈانٹے دار کی سرور کرنے کے بعد ایک موڑھے پر ہمارے سامنے براجمان ہو چکی تھی۔ قبل اس کے کہ میں پوچھتا چھ کا آغاز کرتا، اس نے سوال داغ دیا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے باہر مجھے بتایا تھا کہ آپ کو بجلی کا پتا چل گیا ہے۔ آپ نے اسے کہاں سے پکڑا ہے؟“ ”ابھی پکڑا نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”صرف اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔“

میرے معنی فیز انداز نے اسے سپردِ خاطر کر دیا، بے صبری سے مستغرق ہوئی۔ ”آپ کو کیا معلوم ہوا ہے؟“

”میری کبجلی اس گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھ انداز میں کہا۔ ”وہ مل گیا تو بجلی بجلی مل جائے گی اور..... مذکورہ مرد تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔“

”میں.....!“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر متحجب انداز میں مجھے سمجھنے لگی۔ ”آپ بھی بڑی دھڑکی ناپ کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔ نہ میں کیا بجلی کی کوئی چوکیدار لگی ہوئی ہوں جو مجھے اس بات کی خبر ہو کہ بجلی اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگی ہے۔“

بجلی کے ذکر پر نذیراں کے لہجے میں تخیلی اتر آئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ شاز یہ عرف بجلی کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے لہجے میں کہا۔

”تم نہ سہی مگر تمہارا بیٹا تو بجلی کا پھرے دار بنا بیٹھا ہے نا.....“

”اوہ.....!“ وہ ایک بیک پریشان ہوئی۔ ”نہ میرے تارا کا بجلی سے کیا لینا دینا۔ آپ اسے بجلی کے ساتھ تھی کیوں کر رہے ہیں؟“

”جو کرنٹ اور تار کا رشتہ ہے وہی نا بجلی اور تارا کے بیچ بھی ہے۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا بیٹا اس گاؤں میں بدعاشی کرتا پھر رہا ہے اور خود کو بجلی کا نگہبان سمجھتا ہے۔ اس نے خادم حسین کو چوان کے لڑکے اصغر کو دھکی دیا تھی کہ وہ بجلی سے دور رہے ورنہ وہ اصغر کا حشر نشر کر دے گا۔ اس قسم کی خطرناک باتیں تو وہی شخص کر سکتا ہے جو بجلی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ تارا کا بجلی سے کیا لینا دینا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ..... کو کسی نے..... غلط بتایا ہے تھانے دار صاحب، تارا کوئی غنڈا بدعاش نہیں۔ بس، وہ ذرا غصے کا تیر ہے۔ غلط بات برداشت نہیں کرتا۔ فوراً مرنے مارنے پر تھل جاتا ہے اور جہاں تک بجلی کا معاملہ ہے تو.....“ وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”بجلی اس گاؤں کی لڑکی ہے۔ اگر اسے خود اپنی عزت کا خیال نہیں تو اس میں میرے بیٹے کا کیا قصور۔ اصغر اگر بجلی کے لیے بھجوں بنا پھرتا ہے تو یقیناً بجلی ہی نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ تارا کی تو وہ اصغر سے کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی اس کا بجلی سے کوئی تعلق واسطہ ہے۔ تارا نے اصغر کو شخص اس لیے ڈرانے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ گند خانہ ختم ہو۔ کوٹ ڈوگراں کے اور بھی گھروں میں جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ اصغر، بجلی کی محبت میں جس قسم کی گھٹیا کرکٹیں کرتا ہے اس سے گاؤں کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے جی۔“

انجام دہ شہر

”تمہارا بیٹا کتنا شریف اور کتنا بدعاش ہے اس کا اندازہ میں خود لوگوں گا۔“ میں نے اس کی منطقی وضاحت کو گھر نظر انداز کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ وہ ہے کہاں؟ اس گھر میں تو وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا.....!“

”تارا منڈھورا کلاں گیا ہوا ہے۔“ نذیراں نے جواب دیا۔

منڈھورا کلاں نامی وہ گاؤں موضع کوٹ ڈوگراں سے دو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔ کوٹ ڈوگراں سے منڈھورا کلاں تک پندرہ بیس فٹ چوڑا ایک سوا (چھوٹی نہر) بہتا تھا اور منڈھورا کلاں اسی سوئے کے کنارے پر آباد تھا۔ نذیراں کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وہ منڈھورا کلاں کب گیا ہے؟“ ”آج صبح جی۔“ اس نے بتایا۔

”وہ منڈھورا کلاں کس سے ملنے گیا ہے؟“ میں نے نذیراں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اور اس کی واپسی کب تک ہوگی؟“

”ہوسکتا ہے، وہ آج شام ہی کو لوٹ آئے اور یہ بھی ممکن ہے، وہ کل واپس آئے۔“ نذیراں نے عام سے لہجے میں بتایا۔ ”منڈھورا کلاں میں تارا کا ایک دوست منظور حسین رہتا ہے۔ تارا اسی کے پاس گیا ہے۔“

تارا کے گاؤں سے غیاب نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اپنے خدشات کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

”تارا آج صبح کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟“

”وہ آرام سے ناشتا کر کے گیا ہے تھانے دار صاحب۔“ نذیراں نے منظرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”میرا خیال ہے، وہ آٹھ بجے کے قریب گیا ہے۔“

بجلی نصف شب کے بعد اور اذان فجر سے پہلے کسی وقت اپنے گھر سے نکلی تھی۔ اگر بجلی اور تارا کی روانگی میں کوئی تعلق تھا تو پھر بجلی نے تین چار گھنٹے تارا کے بتائے ہوئے کسی مقام پر گزرا ہے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ کسی سمت روانہ ہو گئے ہوں گے۔ یہ میرا ایک مفروضہ تھا۔ ابھی تک میں بجلی اور تارا کے درمیان کسی تنیدہ ربط ضبط کا سراغ نہیں لگا پایا تھا۔

”تھانے دار صاحب!“ مجھے ادھیڑ بین کی کیفیت میں جہاد دیکھ کر نذیراں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اگر آپ یہ سمجھ

رہے ہیں کہ میرا تارا بجلی کو بھگا کر کہیں لے گیا ہے تو آپ بالکل غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔ آپ اپنے کسی بندے کو منڈھورا کلاں بھیج کر میرے بیان کی سچائی کو آزما سکتے ہیں۔“ ”میں ایسا بھی کروں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکید انداز میں کہا۔ ”لیکن فی الحال تم کان کھول کر میری ایک بات سن لو نذیراں۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”تارا منڈھورا کلاں سے جیسے ہی واپس آئے تم نے پہلی فرصت میں اسے سیدھا رسول پور تارڑ بھیجا ہے۔ میرے پاس تھانے میں۔ باقی کے سوال جواب میں تارا سے ادھر تھانے ہی میں کروں گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا.....؟“ ”جی..... چلتی طراں سمجھ گئی تھانے دار صاحب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں جانتی ہوں، میرا تارا بے قصور ہے اس لیے مجھے تھانے پچھری سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”اگر واقعی ایسا ہے تو پھر تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی کسی بے قصور کے ساتھ زبردستی نہیں کی لیکن اگر تمہارا بیٹا کسی بھی حوالے سے بجلی کی گمشدگی میں ملوث پایا گیا تو پھر تم مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا۔“

”منظور ہے.....“ وہ مضبوط لہجے میں بولی پھر قدرے دامت بھرے انداز میں بتایا۔ ”میں جانتی ہوں، تارا بڑا دکھا لڑکا ہے مگر آپ اس کے بارے میں جیسا سوچ رہے ہیں وہ ویسا نہیں ہوسکتا۔“ کھاتی توقف کر کے اس نے ایک ٹھکی ہوئی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”تارا چار پانچ سال کا تھا جب اس کے باپ کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نے اسے کتنی مشکلوں اور مصیبتوں سے پالا ہے یہ میں جانتی ہوں یا پھر میرا خدا جانتا ہے.....!“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تارا کے باپ کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

”شوکت علی کو کچھ توں میں زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اوہ.....“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ جن بچوں کے سر پر والد کا سایہ موجود نہ ہو ان کی پرورش کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تارا کی عمر اس وقت تھی ہوگی؟“ ”وہ خیر سے پچیس سال کا ہو گیا ہے۔“ اس نے



جواب دیا۔  
 ”تمہارا بیٹا کوئی کام واد بھی کرتا ہے یا سارا دن ادھر ادھر آوارہ رہتا ہے؟“  
 ”کام تو وہ کوئی نہیں کرتا تھا۔ دار صاحب۔“ وہ شرمندہ لہجے میں بولی۔ ”اور میں نے بھی اس پر زور بھی نہیں دیا۔ میں اتنا کر لیتی ہوں کہ اللہ کا شکر ہے۔ ہم دونوں ماں بیٹے کا اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔“  
 ”بچپن سال اچھی خاصی عمر ہوتی ہے نذیراں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تک تو تارا کو تمہارا سہارا بن جانا چاہیے تھا۔ کل کلاں جب تم اس کی شادی کرو گی، تب کیا ہوگا؟“

میرے سوال میں سوچنے والے دماغ کے لیے بہت سا مواد بھرا ہوا تھا۔ نذیراں نے میری بات کو توجہ سے سنا پھر بے پروائی سے بولی۔  
 ”کل کی کل دیکھی جائے گی تھانے دار صاحب۔!“  
 ”کل کی کل تو دیکھی ہی جائے گی نذیراں!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اور کل تم نے ایک اہم کام بھی کرتا ہے۔“  
 ”کون سا کام؟“ وہ ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔  
 ”تارا کو میرے پاس تھانے بھیجے گا کام۔“ میں نے تاکیدری انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے، اس سلسلے میں تم کوئی کوتاہی نہیں کرو گی۔“

”آپ اطمینان رکھیں تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“  
 میں نے نذیراں کی بات پر بھروسہ کر لیا اور اس کے گھر سے نکل کر خیر دین کے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔  
 میں آج صبح سے اب تک کوٹ ڈوگراں میں ادھر سے ادھر پکراتا پکھرتا تھا اور میری اب تک کی تفتیش کے نتیجے میں دو مشکوک افراد سامنے آچکے تھے جن پر بجلی کی کشمکش کے حوالے سے شک کیا جاسکتا تھا یعنی خادم حسین کو چوان کا بیٹا اصغر اور نذیراں ماچھن کا بیٹا تارا۔ ان دونوں بندوں میں تین چیزیں مشترک تھیں۔ نمبر ایک، دونوں آوارہ گرد درجہ اول تھے۔ نمبر دو، دونوں اس وقت کوٹ ڈوگراں میں موجود نہیں تھے۔ نمبر تین، دونوں کسی نہ کسی انداز میں گم شدہ بجلی کی ذات میں دلچسپی رکھتے تھے۔  
 جب میں خیر دین کی گلی میں داخل ہوا تو وہاں ماسٹر عنایت مجھے نظر آگیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ فوراً میرے نزدیک آگیا اور اندازدارانہ لہجے میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! آپ کے حکم کے مطابق میں نے کام کر دیا ہے۔“  
 ”کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”رپورٹ یہ ہے جناب۔“ وہ مختصراً نظر سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت گاؤں سے صرف دو بندے غیر حاضر ہیں۔“  
 اس کے پراسرار انداز نے مجھے بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ میں نے افسوسناک لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور وہ دو بندے کون ہیں؟“  
 اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ ”اصغر اور تارا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔  
 ”مجھے لگتا ہے، انہی دو میں سے کسی ایک کا بجلی کی کشمکش میں ہاتھ ہے۔“ ماسٹر عنایت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور یہ دونوں بجلی کے امیدوار بھی ہیں۔ میرے مختصراً اندازے کے مطابق گاؤں کا اور کوئی وسیع بجلی میں اتنی گہری دلچسپی نہیں رکھتا تھا کہ اسے بھگا کر لے جائے۔ اگر آپ ان دونوں پر تھوڑی سی سختی کریں گے تو ان کی زبانیں بچ جائیں گی۔“  
 ”آپ بالکل شک کر رہے ہیں ماسٹر جی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ میں اصغر اور تارا کو تفتیش کی بجلی میں ایسا پیسوں گا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ بہر حال، آپ کے تعاون کا شکریہ ماسٹر جی۔“  
 ”شرمندہ نہ کریں تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑے انکسار سے بولا۔ ”یہ تو میرا فرض تھا۔ میری خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد بجلی کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس سلسلے میں آپ کو جب بھی میرے تعاون کی ضرورت ہوگی، میں حاضر ہوں جناب۔“  
 میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔  
 خیر دین کے لیے میرے پاس کوئی ایسی خبر نہیں تھی جسے سن کر وہ بجلی کے حوالے سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ میں نے تسلی اور تسکین کے کارڈ دکھائے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”خیر دین! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بجلی کی تلاش کے سلسلے میں، میں نے ابتدائی تیاری کر لی ہے۔ انشاء اللہ! کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں تمہیں کوئی خوش خبری سناؤں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانے دار صاحب۔“ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔  
 ”حوصلہ رکھو خیر دین۔“ میں نے اس کا کاغذ ہاتھ پاتے ہوئے کہا۔  
 ”امید کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے والوں ہی کو کامیابی ملتی ہے۔ یہ میرا قریب سے وعدہ ہے کہ میں بجلی کو اور وہ اس کے ساتھ لے کر اس بندے کو بہت جلد تمہارے سامنے لا کر آ کر دوں گا۔“  
 خیر دین اور اس کی بیوی بقیس جمبولی بھر بھر کر مجھے دعا میں دینے لگے۔ میں شام سے تھوڑی دیر پہلے واپس تھانے آ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو زبیدہ کی بڑی بہن صفیہ کا ایڈریس سمجھا کر پنڈی پٹھیاں روانہ کر دیا تاکہ وہ اصغر کے بارے میں مستند معلومات حاصل کر سکے۔ میں نے اے ایس آئی کو تاکید کر دی تھی کہ جو بھی صورت ہو، اصغر کو ساتھ لے کر آتا ہے اور اگر بجلی اسی کے ساتھ ہے تو دونوں کو فوراً سے پشتر لائن حاضر کرنا ہے۔ میری اب تک کی تفتیش کی روشنی میں اصغر کے بجلی کو بھگانے والے جانے کے امکانات زیادہ نہیں تھے لیکن اصغر مشکوک افراد میں سرفہرست تھا لہذا میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرا مشکوک بندہ ستار عرف تارا تھا۔ نذیراں ماچھن نے مجھے جس اعتماد کے ساتھ گفتگو کی تھی اس سے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ تارا جیسے ہی مندرجہ بالا سے لوٹے گا، نذیراں اسے میرے پاس بھیج دے گی اور اگر ایسا نہیں ہو تو پھر میں نے تارا کی تلاش اور واپسی کے لیے اپنا بندہ دوڑا دینا تھا۔ وہ کوٹ ڈوگراں میں ہوتا یا منڈوہر گاؤں میں، مجھ سے بی نہیں سکتا تھا۔

مشکوک افراد کی فہرست میں کسی حد تک بابا جمالا بھی شامل تھا اس لیے میں نے کوٹ ڈوگراں سے واپسی سے پہلے اس سے ایک بھر پر ملاقات کی تھی اور اس کے گھر کے اندر دنی جے کو بھی چیک کر لیا تھا لیکن بابا جمالا شک کے دائرے سے باہر نکلا تھا۔ بابا جمالا کی عمر ساٹھ سے چھاونی تھی اور وہ بیچ وقت نمازی ایک پرہیزگار شخص تھا۔ اسے چیک کرنے کا سبب یہ تھا کہ بجلی اپنے گھر کی چھت سے اس کے گھر کے اندر اتری تھی اور بابا جمالا غیر شادی شدہ تھا۔ بس یہی ایک نکتہ تھا جو پولیس کی تفتیش کو اس کی ذات کی طرف

موجڑا تھا کیونکہ تفتیش کی گاڑی شک کے پیڑوں سے چلتی ہے اور کسی جرم کی تحقیق کے لیے بعض اوقات ہمیں اپنے گھر والے پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال، میری پوچھ بچھ کے نتیجے میں بابا جمالا بجلی کی کشمکش کے معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔

میں تھانے میں بیٹھا بجلی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آسمان پر بجلی چمکی اور بارش شروع ہوئی۔ ساون کے مہینے کا یہی مزاج ہوتا ہے۔ پچھلے ہی روز سے برسات کا سلسلہ جاری تھا اور اسی برسات نے بجلی کی تلاش کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی۔ اگر مطلع صاف اور موسم خشک ہوتا تو میں کھرا کال کر بجلی کا سراغ لگا سکتا تھا۔ بجلی جس رات گھر سے غائب ہوئی تھی اس رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی لہذا اس کے پاؤں کے نشانات کا ملنا ممکن نہیں رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کاشییل باسٹ بھی میرے پاس آ بیٹھا۔ گزشتہ روز وہ میرے ساتھ رہا تھا اور میں نے بجلی کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی قانونی کارروائی کی تھی اس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

”ملک صاحب! اس بارش نے ہمارے کام کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔“ وہ میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ ہم کھرا کال کر بجلی کے فرار کی سمت کا تعین یہ آسانی کر سکتے تھے۔“

”جس تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں باسٹ!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہمیں کوئی ایسا راستہ مل جائے گا جو سیدھا بجلی تک پہنچا دے گا۔“

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن فی الحال تو ہم اصغر اور تارا کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”کسی حد تک میں تمہاری اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے رسیانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ شیک ہے کہ فی الحال ہم عملاً کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے لیکن ہمارے سوچنے پر تو کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ جب تک اصغر اور تارا ہمارے قابو میں نہیں آ جاتے ہمیں بجلی کے فرار کے محرکات پر غور کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، یہ غور و فکر ہمیں کسی ایسے راستے پر لے جائے جہاں بجلی سے ملاقات ہو جائے۔“

”آپ کی بات میں دم ہے ملک صاحب لیکن فی







دیر انداز میں بولا۔ ”جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ بجلی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن آج تک میں نے اس کے سامنے یا اس کے پیچھے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جسے آپ گھٹیا کہہ سکیں اور جہاں تک بجلی کو بھگا کر جانے والا معاملہ ہے تو۔۔۔ تو میرے لیے یہ ناممکن تھا۔“

”کیوں ناممکن تھا؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں یا تمہارے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے تمہانے دار صاحب۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

”پھر کیا بات ہے!“ میں نے اس کی نفسیات سے کھیلنے ہوئے استفادہ کیا۔ ”کیا تم اتنے بزدل ہو کہ کسی کے دھمکانے سے ڈر گئے؟“

میرے آخری جملے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ابھین زدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو تو۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ پتا ہے۔“

”میں اس علاقے کا تمہانے دار ہوں پتہ جی!“ میں نے اس پر نفسیاتی دباؤ برقرار رکھتے ہوئے جیسے جیسے میں کہا۔ ”جس طرح دانی سے پیٹ، ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے جرم کو نہیں چھپایا جاسکتا بالکل اسی طرح کسی علاقے کا تمہانے دار۔۔۔ بیک وقت دانی، ڈاکٹر اور وکیل ہوتا ہے جو اپنے علاقے کے لوگوں کے بارے میں یہاں تک بھی جان کاری رکھتا ہے کہ کس نے کس دن کیا کھایا اور کیا پیا ہے۔“ لہذا تو قوت کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لہذا مجھ سے کسی غلط بیانی یا دروغ گوئی کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خود کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تمہاری زبان سے صرف اور صرف سچ سنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ تم چکر بازی سے کام لے رہے ہو تو بیانی کی عمر جنیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزراؤ گے جہاں تمہاری گمشدہ سیلی کی صورت دکھائی دے گی اور نہ ہی اس سے بات کرنے کا کوئی موقع ہاتھ لگے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”سمجھ رہا ہوں تمہانے دار صاحب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں نے ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی میرا آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ سچی اور کھری بات یہ ہے کہ میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں، نہ میرے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہے اور نہ ہی میں کسی سے ڈرتا ہوں اگر تارا

مجھے تن چھڑا رہا تو میں جواب میں ایک آدھ مکا تو اسے بھی رسید کر ہی دیتا۔ میں نے تارا کی دھمکی کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اس خیال سے میں نے چپ سا دھ لے کر جب یہ معاملہ اچھے گا تو بجلی کی بدنامی ہوگی۔ میں کسی بھی قیمت پر بجلی کی رسوائی نہیں چاہتا تھا، تمہانے دار صاحب۔ میں بجلی سے سچی محبت کرتا ہوں لیکن انفسوس کہ۔۔۔ وہ بولتے بولتے اپنے چاک رک گیا۔

میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ ان لحظات میں وہ جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے دل و جگر میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اس کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ انسان دو حالتوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اول، نئے کی حالت میں۔ دوم، جذبات کی طغیانی میں۔ ان دونوں کیفیات میں وہ دماغ کی تکیں بلکدول کی زبان بول رہا ہوتا ہے۔

چند لحظات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ گویا ہوا۔ ”لیکن مجھے اس بات کا بڑا گہرا دکھ ہے کہ بجلی نے بھی میری محبت کی قدر نہیں کی۔ پیار سے دو باتیں کر لیتا تو بہت دور کی بات ہے، اس نے تو مجھے سیدھے منہ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں بجلی کو بھگا کر کہیں نہ گیا ہوں۔“

آخری جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے شاکی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے سچائی اور راست گوئی جھلکتی تھی۔ میں نے اسے ایک اور زاویے سے گھنے کی کوشش کی تاکہ بجلی کی گمشدگی کا معاملہ کیا جاسکے۔

”اصغر!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں ایک منٹ کے لیے تمہارے بیان کو درست سمجھ کر یہ مان لیتا ہوں کہ تم بجلی سے سچی محبت کرتے ہو لیکن اس ناقدی، بددماغ لڑکی نے بھی تمہاری محبت کو لائق تو جہنم نہیں جانا لیکن۔۔۔“

”بالکل یہی بات ہے تمہانے دار صاحب!“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بے آواز بلند بولا۔ ”بجلی بڑی خود سر، ضدی اور مغرور لڑکی ہے۔ محبت کا جواب محبت سے دینے کے بجائے اس نے ہمیشہ میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے۔“

”مجھے تم سے اور اس دنیا کے ہر سچے اور کھرے عاشق سے گہری ہمدردی ہے اسی لیے میں تمہارے بیان کو درست مان رہا ہوں لیکن پھر میرے ذہن میں ایک اہم سوال سر اٹھا رہا ہے اور اس سوال کا جواب تم پر لازم ہے۔“

”کون سا سوال تمہانے دار صاحب؟“ وہ ابھین زدہ

نظر سے مجھے نکتے لگا۔

”اگر بجلی نے کبھی تمہیں اور تمہاری محبت کو اہمیت نہیں دی تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ بجلی کو کوئی اور اچھا لگتا تھا۔ وہ کوٹ ڈوگراں کے کسی اور مرد کی محبت میں گرفتار تھی۔ کیا تم مجھے اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟“

”میں ایسے کسی بندے کو نہیں جانتا تمہانے دار صاحب!“ وہ دونوں انداز میں بولا۔ ”آپ کی مرضی ہے، میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔“

”میں تمہاری بات کا یقین کر رہا ہوں اسی لیے میں تم سے دوستانہ انداز میں بات چیت کر رہا ہوں ورنہ اگر میں نے تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرائی ہوتی تو اس وقت تمہانے کے درد یوار تمہاری کرب میں ڈوبی ہوئی اذیت ناک چیخوں سے محفوظ ہو رہے ہوتے۔ مجھے امید ہے، تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے۔“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں بجلی کے ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں تھا اور اگر وہ کوٹ ڈوگراں کے کسی اور مرد کو پسند کرتی تھی تو مجھے اس سے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے اور میری محبت کے جواب میں مجھ سے محبت سے بات کرے۔ میں نے اس سے زیادہ کی بھی تمنا نہیں کی تمہانے دار صاحب اور۔۔۔ اس پاگل لڑکی کی سمجھ میں کبھی میری یہ بات آئی ہی نہیں۔“

”یہ سوال میں اس پاگل لڑکی سے ضرور کروں گا جب وہ میرے ہاتھ لگے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ کہ تارا کی کیا کہانی ہے؟“

”میں سمجھا نہیں جناب۔۔۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تارائے جہیں دھمکی دی تھی کہ بجلی سے دور ہو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تارا بجلی کا امیدوار تھا اور اسے اپنی جاگیر سمجھتا تھا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تمہانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تارا کی گاؤں میں اچھی شہرت نہیں ہے۔ وہ دھوس دھاندلی اور غنڈا گردی کے لیے مشہور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تارا کی بجلی پر نظر تھی۔ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔“

”اور بجلی؟“ میں نے نٹولنے والی نظر سے اس کی

طرف دیکھا۔

وہ فوراً سے بیشتر میرے سوال کی تہ میں پہنچ گیا اور خامے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ تارا کی غلط فہمی میں جلتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق بجلی نے بھی تارا کو گھاس نہیں ڈالی۔“

”اصغر۔۔۔!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس بات کا فیصلہ میں کل صبح کروں گا کہ تم کتنے سچے ہو اور کتنے جھوٹے۔ آج کی رات تم میرے تمہانے کے مہمان ہو۔ اگر تمہیں کوئی ایسی بات یاد آجائے جو بجلی کی تلاش میں معاون ثابت ہو سکتی ہو تو سچ مجھے بتادینا یا اگر تم نے اپنے بیان میں کوئی رد و بدل کرنا ہو تو اس کے بارے میں بھی سوچ لینا۔ میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم میری اس مہربانی کو بجلی اور آخری مہلت سمجھنا۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں تمہانے دار صاحب جو آپ میرے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ جو میرا بیان اس وقت ہے، سچ بھی یہی بیان ہوگا۔“

اس نے لمبی توقف کر کے میری آنکھوں میں دیکھا اور سرسراہٹ ہوئی آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک بجلی کی تلاش کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں آپ سے یہی کہوں گا کہ تارا کو نظر میں رکھیں۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ بجلی تارا کے ساتھ بھاگی نہیں ہوگی لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بجلی کی گمشدگی میں تارا کا ہاتھ ہو۔ تارا بہت ہی کمینہ انسان ہے۔“

”تارا کی تم قلندر کرو۔ میں نے اس پر بڑی گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”انشاء اللہ! آج کی رات وہ غنڈا بھی میرے تمہانے کی حوالات میں بند ہوگا۔“

اصغر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے اصغر کو والد افضل داد کے حوالے کر دیا اور علیحدگی میں فضل داد کو سمجھا دیا کہ حوالاتی کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کرنا تاہم اس پر تفتیش کے تمام نفسیاتی حربے ضرور آزمائے جائیں۔ ہو سکتا ہے، کوئی نئی اور مفید بات سامنے آجائے۔ فضل داد نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

”آپ مطمئن ہو جائیں ملک صاحب! میں ایک طمانچہ مارے بغیر اس کے پیٹ میں چھپے سارے رازوں سے واقفیت حاصل کروں گا۔“



اور میں مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

رات نو بجے کے قریب کاشیبل باسٹک واپسی ہوئی۔ وہ تارا کو اپنے ساتھ لایا تھا لیکن سادہ لباس اہلکار مجھے اس کے ہمراہ دکھائی نہیں دیا تو میں نے کاشیبل سے پوچھا۔  
”صدیق! کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟“

سادہ لباس پولیس اہلکار کا نام صدیق تھا اور وہ ایک ہوشیار قسم کا کاشیبل تھا۔ باسٹک نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”صدیق کو میں کوٹ ڈوگراں میں چھوڑ آیا ہوں ملک صاحب۔ ابھی وہاں پر اس کی موجودگی ضروری ہے۔ صبح تک کوئی سسٹن خیز خبر سامنے آسکتی ہے۔ تارا منڈھورا کلاں سے لوٹ آیا تھا اس لیے میں اسے آپ تک پہنچانے آ گیا ہوں۔ اب میں واپس کوٹ ڈوگراں جا رہا ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے چونک کر باسٹک کی طرف دیکھا۔  
”اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی رات ادھر کوٹ ڈوگراں میں کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے؟“

”میں فی الحال واضح طور پر آپ کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ملک صاحب کیونکہ میرے ہاتھ میں کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے لیکن مجھے امید ہے، صبح تک کوئی ایسا سرا ضرور میرے ہاتھ لگ جائے گا جسے تمام کریم بلی تک پہنچ جائیں گے۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے یہ مشن مجھے سونپا ہے تو میرا یہ وعدہ ہے کہ آپ کو واپس نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے باسٹک! میں تمہیں فری پنڈ دیتا ہوں۔“ میں نے غصے سے بولے۔  
”اور اس کے ساتھ ہی تمہاری سرخروئی کے لیے دعا گو بھی ہوں۔“

وہ تشکر انداز میں بولا۔ ”شکریہ ملک صاحب!“  
”تم نے بتایا ہے کہ صدیق کوٹ ڈوگراں کے لوگوں میں گھل مل گیا ہے۔“ میں نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔  
”تم یہ رات کہاں گزارو گے؟“

”ماسٹر عنائت کے گھر میں.....!“ اس نے معنی خیز انداز میں بتایا۔

اس کے بعد میں نے باسٹک سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اسے فری پنڈ دے چکا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ اس کو سونپے گئے مشن میں مجھے کوئی مداخلت نہیں کرنا۔ باسٹک کے انداز و اطوار سے میں نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ اس کیس کے حوالے سے کوئی اہم نکتہ اس کی پکڑ میں آچکا تھا اور وہ مجھے کوئی سرا پر از دینے کی خاطر اس نکتے پر گھل کر مجھ سے

بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چپ چاپ جانے کی اجازت دے دی۔

سینئر اور جونیئر کے درمیان ”استاد اور شاگرد“ کا ایک خاص رشتہ ہوتا ہے، اگر سمجھا جائے تو..... سینئر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے جونیئر پر بھروسہ کرے اور اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مواقع فراہم کرے۔ میں اگر آج تھانے دار تھا تو برسوں کی محنت کے بعد مرحلہ وار ترقی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اگر کسی مرحلے پر میرے سینئر نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہوتی یا میں خود ہی ہمت ہار کر ایک طرف پیٹھ جاتا تو پھر میں آج بھی ایک کاشیبل ہی ہوتا۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پر جوش اور ذہین جونیئر کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کاشیبل باسٹک ایک ایسا ہی باہمت اور بہادر پولیس اہلکار تھا۔

کوئی شاگرد چاہے کتنی بھی ترقی کر لے وہ وزن اور قد و قامت میں کبھی استاد کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے وزن اور قامت میں اس کے استاد کا وزن اور قامت شامل ہوتے ہیں۔ سمجھداروں کے لیے یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔

میں عموماً مغرب کی اذان کے بعد تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا لیکن چھبیس جولائی کا وہ ایرالود دن میرے لیے بے حد مصروفیت کا حامل تھا اور میں رات کے دس بجے بھی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کاشیبل باسٹک کے جانے کے بعد میں نے نذیراں ماچن کے بیٹے ستار عرف تارا کو اپنے پاس بلایا۔

تارا کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس کے قریب لگا یا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے اپنی زلفوں کو کافی بڑھا رکھا تھا اور بالوں میں ح سے زیادہ سروس کا تیل بھی چڑھ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی پیشتر انگلیوں میں بڑے گینگنوں والی انگوٹھیں نظر آرہی تھیں اور ایک کلائی میں اس نے لوہے کا ایک ٹکڑا بھی پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے اوکھے پن کے بڑے واضح آثار دکھائی دیے۔

”کیا بات ہے تارا.....!“ میں نے اسے خشک نظر سے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم بڑے بڑا نظر آرہے ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے ساتھ کسی نے زور زدوبستی کی ہو؟“

”تھانے دار صاحب! آپ کے سپاہی نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔“ وہ دھکتا ہوا لہجے میں بولا۔  
”میں منڈھورا کلاں سے واپس آیا ہی تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر

انجام دہ شر

لانے لے آیا۔ میں نے اس کی وردی کا لحاظ کیا اور نہ.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تم میرے کاشیبل کے دانت توڑ دیتے کیونکہ تم کوٹ ڈوگراں کے ماسے لگے ہوئے ہو..... ہیں؟“

میرے درشت انداز پر وہ سوچتی ہوئی نظر سے چند لمحوں کے بعد دیکھتا ہوا پھر قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔  
”جناب! لوگوں نے مجھے خواخواہ غنڈا ابد معاش مشہور کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں غصے کا کافی تیز ہوں لیکن میں نے کسی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی۔“

”تمہارے حیلے اور اوکھے پن کو دیکھ کر مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ تم طبی کی طرح سیدھے اور نیوٹل شخصے انسان ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے زہر لیے لہجے میں کہا۔ ”جہاں تک میرے کاشیبل باسٹک کی بات ہے تو اس نے کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ اس نے شخص میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اگر تم اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرتے تو وہ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر بھی میری خدمت میں پیش کر دیتا اور جہاں تک تمہاری شرافت کا تعلق ہے تو.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے گہری نظر سے اسے گھورا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

”اب شرافت کی دو مثالیں میرے تھانے کے ریکارڈ پر درج ہو چکی ہیں۔“

”مگ کون سی مثالیں تھانے دار صاحب؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

”مثال نمبر ایک.....“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خادم حسین کو چوان کے بیٹے کو دھکی دی تھی کہ وہ بجلی سے دور رہے ورنہ تم اس کا حشر خراب کر دو گے۔ مثال نمبر دو، تم نے کوٹ ڈوگراں کے ایک معزز شخص سے متعدد بار بدتمیزی کی ہے۔“

”جناب! صفر جس انداز میں بجلی کو سورا کرنے کی مہم میں لگا ہوا تھا اس سے مجھے بڑی تکلیف پہنچی تھی۔“ وہ گہری سنبھکی سے بولا۔ ”میں نے شخص اسے ڈرانے کے لیے ایسی بات کی تھی ورنہ صفر سے میرا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا۔“  
”بجلی کی رسوائی سے تمہیں تکلیف کیوں پہنچی تھی؟“ میں نے خاصے صمیمی لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہارا بجلی کے ساتھ ایسا کون سا رشتہ تھا؟“

”رشتہ تو کوئی نہیں تھا جی.....“ وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بس، جناب! اسے میرے دل کا معاملہ سمجھ لیں، بجلی

مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔“

”جو چیز تمہیں پسند آجائے وہ تمہاری ملکیت تو نہیں ہو سکتی نا۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، بجلی نے کبھی تم سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اس کے باوجود بھی تم اپنی جاگیر سمجھ کر اس کی چوکیداری میں لگے رہتے تھے.....؟“

”میرا دل کہتا تھا کہ بجلی کو ایک دن میری محبت کا احساس ہو جائے گا۔“ وہ کسی مجبور عاشق کے مانند بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تمہارا دل ضرور ایسا دل سادتا ہوگا لیکن زمینی حقائق اس کے برعکس تھے۔“ میں نے تارا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہوا میں ایک تیر چلا یا۔ ”کافی عرصے سے انتظار کے بعد جب تمہیں یقین ہو گیا کہ بجلی کسی بھی صورت تمہاری نہیں ہو سکتی تو تم نے اسے کوٹ ڈوگراں سے غائب کر دیا۔“

”یہ جھوٹ ہے..... مجھ پر الزام ہے.....“ وہ جھجھکے سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”آپ کے سپاہی نے مجھ کی بار مجھ سے یہی بات کی ہے لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بجلی کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”آواز چینی.....“ میں نے اسے دبا مارا۔ ”یہ تھانہ ہے، تمہاری بے جا تنویر نہیں کہ تم اپنی بد معاشی کے زور پر جھجھکا کر خود کو چاچا ثابت کر لو گے۔“

”معافی چاہتا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ فوراً نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں کہ بجلی کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں..... مجھے تو منڈھورا کلاں سے واپسی پر پتا چلا ہے کہ بجلی ایک دن سے غائب ہے۔“

”اگر بجلی کی گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر وہ گئی کہاں؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سمجھ انداز میں سوال کیا۔ ”میں نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اب صرف یہ پتا چلانا باقی ہے کہ وہ گئی کس کے ساتھ ہے.....“

”آپ نے بجلی کے عاشق سے پوچھنا چاہی.....؟“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”مجھے یقین ہے، وہ بجلی کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔“

”ہاں.....“ میں نے بھی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”اس وقت میں بجلی کے ایک عاشق خوار ہی سے پوچھ کچھ کر رہا ہوں۔“

”میں اپنی نہیں، صفر کی بات کر رہا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔



”اصغر، بجلی کی گمشدگی سے بارہ گھنٹے پہلے کوٹ ڈوگراں سے پنڈی بھٹیاں روانہ ہو گیا تھا۔ وہ بجلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جیسا کہ بجلی کی روپوشی کے معاملے سے لاعلم ہو کیونکہ تمہیں تو مندرجہ بالا کلاں سے واپس آنے پر پتا چلا ہے کہ بجلی کہیں چلی گئی ہے۔“

”جناب! ہو سکتا ہے، اصغر نے آپ کو کوئی پکڑ دیا ہو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اس پر تھوڑی سختی کریں گے تو وہ زبان کھول دے گا۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ اصغر اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہے اور اب میں تمہیں بھی حوالدار کے سپرد کرنے والا ہوں۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک نئی کر کے زبان کھولانے کا معاملہ ہے تو میں آج کی رات تم دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔ تم دونوں کی درد میں ڈوبی ہوئی کرب ناک چٹیں رسول پور تاروں سے کوٹ ڈوگراں نہیں پہنچیں تو میرا نام بھی ملک مندر حیات نہیں۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”آپ ہم دونوں کو کڑی تفتیش کی بجلی میں نہیں کر ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کرنے والے ہیں جبکہ آپ کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ میری اور اصغر کی پسندیدگی کی طرف سے بجلی نے بھی ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی جبکہ۔“

”کیا جبکہ۔۔۔!“ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔ ”تم رک کیوں گئے؟“

”جبکہ یہ کہ۔۔۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”آپ کو چاہیے کہ اس شخص کو بھی شامل تفتیش کریں، بجلی جس میں دلچسپی لے رہی تھی۔“

ان لحاظ تک مجھے جو معلومات حاصل تھیں ان کی روشنی میں اصغر اور تارا کے سوا کوٹ ڈوگراں کے کسی مرد کا نام بجلی کے ساتھ جڑا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ اسی تناظر میں تارا کی بات نے میرے دماغ میں پھل چڑادی تھی۔ میں نے تارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”بجلی کس شخص میں دلچسپی لے رہی تھی؟“

اس نے سرسراہٹ بھری آنکھوں میں جواب دیا۔ ”تعلیم بالغاں!“

☆☆☆

ستائیس جولائی کی صبح میرے تھانے میں جشن کا سماں تھا کیونکہ اس روز ہمیں ایک بڑی کامیابی ملی تھی۔ جب میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو باسط کو وہاں دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ گزشتہ رات تارا سے پوچھتا چھ کے اختتام پر بجلی کی گمشدگی کے حوالے سے ایک ایسا نام سامنے آیا تھا جس نے میرے دماغ میں پوشیدہ صورت حال کو یکدم اجاگر کر دیا تھا۔ ان لحاظ میں مجھے یاد آیا کہ باسط نے تھانے سے روانہ ہوتے وقت بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا کہ وہ آج کی رات ماسٹر عنایت کے گھر پر گزارے گا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اسے ماسٹر جی کے حوالے سے سن گن مل چکی تھی۔

تارا کا دھیان مکمل طور پر بجلی میں لگا رہتا تھا، اس لیے وہ بجلی اور ماسٹر عنایت کے بیچ رابطے کو کبھی چکا تھا۔ وہ ماسٹر سے حسد بلکہ نفرت کرنے لگا تھا۔ یہی سب تھا کہ اس نے دو چار بار ماسٹر عنایت سے بدتمیزی بھی کی تھی۔

”ملک صاحب! میں ایک بات کے لیے آپ سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔“ باسط نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”امید ہے، آپ میری کوتاہی کو درگزر فرمائیں گے۔“

”باسط! تم نے بجلی کو بازیاں اور ماسٹر عنایت کو گرفتار کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے پیش نظر میں تمہارا بڑے سے بڑا قصور بھی معاف کر سکتا ہوں۔“ میں نے در یاد لی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بولو، کیا بات ہے؟“

”مجھے کھل ہی اس بات کا پتا چل چکا تھا کہ بجلی، ماسٹر عنایت کے گھر میں چھپی ہوئی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”سادہ لباس الٹا کر کے معلوم کر لیا تھا کہ آج علی الصباح بجلی اور ماسٹر کوٹ ڈوگراں سے نکل جائیں گے۔ ماسٹر صرف اس انتظار میں تھا کہ پولیس کی تفتیش کا رخ کسی اور طرف مڑ جائے۔ اس کے بعد وہ گاؤں سے روانہ ہوئے۔ میں نے رات بھر اس کے گھر کی کڑی نگرانی کی اور پھر ان دونوں کو رینگے ہاتھوں پکڑ لیا۔“

”مجھے بھی گزشتہ رات ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کس نوعیت کی کارروائی کرنے والے ہو۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے مشن میں اس لیے مداخلت نہیں کی تاکہ اس کامیابی کا سہرا تمہارے سر بندھے۔ صرف تمہارے سر!“

وہ ایک تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)



زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے جب کوئی نمک چھڑکنے لگے تو ایک بڑی اذیت انسان کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے مگر جب زخم لگانے والے رشتہ مرہم بن جائیں تو زندگی آسمان اور خوشگوار ہو جاتی ہے اس کا احساس اسے بھی ایک دن ہو گیا۔

## نرس محمد الیاس

### پدرکاری کی دلدل میں دیکھلی جانے والی ایک نرس کی روداد

کے عملے نے مل کر کیمنی ڈالی اور بجلی اس کو دے دی۔ بھلائی تھی ملازمت والے پر کون اعتبار کرتا ہے۔ بس یہ کہ لڑکی جوان ہے اور خوبصورت ہے۔ سیدھی سی بات ہے مگر حق بنے کو قتل نہیں آ رہی۔ ورنہ میں چھوٹے بھائی اور اس کی اولاد کا دشمن نہیں ہوں۔ بہو سے میری اگلی نسل پیدا ہوگی۔ بیٹے کے دماغ پر سوار عشق کا بھوت اتر ہی نہیں رہا۔ کدھالے سال ڈاکٹر بن جائے گا۔ ایک سے ایک بڑے گھرانے کی حسین لڑکی شادی کرنے کے لیے مری جارہی ہوگی۔ یہی بہترین موقع ہے اونچی اڑان بھرنے کا۔ بھلا کسی دیو ناپ بول یا فوجی افسر کو سسر بناؤ۔ تاکہ ہماری بھی شان بنے۔ کل کو سینہ تان کے کسی سے بات کر سکیں کہ فلاں کشنریا جہول ہمارا سدمی ہے۔ سید اختیار احمد نے ابھی سے بڑھ بڑھ کر بغل گیر ہونا شروع کر دیا ہے۔ اچھا بھلا صنعت کار ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ جب اتفاقاً مجھ سے

رات بھر ماں باپ اور بیٹے کے درمیان بحث ہوتی رہی تھی۔ آخر طے پا گیا کہ زبیدہ کے پاس جا کر حقیقت معلوم کی جائے۔ اس وقت وہ تینوں زبیدہ کے گھر آئے بیٹھے تھے لیکن وہ ابھی اسپتال سے واپس نہیں آئی تھی۔ حسن کو یقین تھا کہ اس کے چچا اصغر اور ان کی بیٹی جو کہہ رہی ہے، وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ چچی چچا اور ان کی تینوں بیٹیاں باکدوار ہیں۔ بس یہ کہ بیروں گاری نے چچی کو بری طرح مفرط کر دیا اور بڑی بیٹی نے باپ کا ساتھ دینے کی غرض سے نرسنگ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ حسن کا باپ اکبر شاہ بیٹھا۔ بس اندر ہی اندر کھولتا رہا کہ جتنی نے نرس بن کر سادات خاندان کی ناک کٹوا دی اور پھر ملازمت کے دوسرے مہینے میں ہی اتنی رقم کہاں سے لے آئی۔ پیاس ہزار تاریا کے ادا کر دیے اور تقریباً تیس ہزار روپے دکانوں کا قرض بھی چکا دیا۔ وہ غلط بیانی کرتی ہے کہ اسپتال



# قطعه کہانی

منظرِ رام

بات سے بات چل نکلے تو داستانِ ترقیب دی جاسکتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک قطعہ کے گرد اپنا جال بنتے ہوئے نہ صرف مکمل ہوئی بلکہ کتنے ہی نئے رنگوں سے بھی متعارف کرا گئی۔

بکے پکے انداز میں زندگی کی حقیقت کو بھائی ایک پراثر تحریر



آتا۔ شام کے وقت دوستوں کے پاس چلا جاتا۔ وہ میٹرک کا طالب علم تھا اور اس کے پچھلے نتائج کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ میٹرک میں کامیابی حاصل کر لے گا اور وہ بھی شاندار نمبروں سے۔

نعمان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ خدا ناخواستہ وہ ایسا کوئی خاص بیمار نہیں تھا جس کے لیے یہ کہا جائے کہ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وقت پر اسکول جایا کرتا، وقت پر واپس

ہیں۔ ہر کوئی پہلی یا دوسری کمیٹی لینے پر اصرار کرنے لگتا۔ لہذا بات نہیں بنتی۔

میاں بیوی کے چہرے کھل اٹھے جبکہ بیٹے پر اس کا مٹی۔ اس کا ذہن دل کی گواہی تسلیم کر رہا تھا کہ ارم غلط نہیں ہو سکتی۔ ماں کو اس بھری نظروں سے دیکھا۔ رخ مندی کا احساس غالب آنے پر خاتون پر جوش ہوئی بیٹھی تھی۔ بیٹے سے لگا ہیں ملتے ہی بے صبری ہو گئی اور بول پڑی۔ ”کوئی! دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔“ حسن کو سخت صدمہ پہنچا اور ارم سے قریبی رشتے داری کے حوالے سے راز داری قائم رکھنے کی تجویز بیکسر نظر انداز کر دی۔ جل بھن کے ماں سے مخاطب ہوا۔

”دودھ بھٹ کر بس گیا ہے، جیسے معدے نے الٹ دیا ہو۔ بات صاف ہوئی چاہیے۔“ ذرا توقف کر کے زبیدہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”سسر! آپ کی بیٹی کو لیگ آئی ہے، دو ماہ پہلے۔ ارم نام کی۔ وہ اس ماہ کی تنخواہ کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپے کہاں سے لے گئی۔“ کہتی ہے سہمی ڈالی گئی۔

ارم کا نام سنتے ہی زبیدہ نے ہونٹ سکڑ لیے اور ”اوہ“ کے سے انداز میں لمبی سانس خارج کر کے بول اٹھی۔ ”بہت اچھی لڑکی ہے۔ کچھ زیادہ ہی نیک اور فرماں بردار بیٹی ہے۔ باپ کے لیے سخت پریشان تھی۔ مجھے اعتماد میں لیا۔ میں نے ہی ڈاکٹر پرویز سے بات کی۔ انسانی ہمدردی کا سہل ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے لڑکی کی بیماری بتائی تو مان گئے۔ انہوں نے خود ہی ایک مال دار فیملی سے معاملہ طے کروا کے ارم کو لاکھ روپے دلایا۔“

حسن نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ باپ کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔ ”چل دو دو جی! (چلو جی) اور پوچھو۔“ حسن پھٹ پڑا۔ ”سسر! بات گھیر ہوئی چاہیے۔ کس بات کا لاکھ روپے؟“

زبیدہ کو گویا ہوش آ گیا اور وہ چونک اٹھی۔ مہمانوں کو ایک نظر دیکھا اور حسن سے مخاطب ہوئی۔ ”کس بات کے دینے تھے۔ امیر عورت کا کڈنی ٹرانسپلانٹ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر پرویز، مرلیضوں کے لواحقین کو اپنا اپنا ڈونر لانے کا کہتے ہیں۔ خود اس معاملے میں شامل ہونا پسند نہیں کرتے۔“

زبیدہ کو جیسے اچانک کوئی خیال آ گیا اور حسن کو بغور دیکھ کر بولی۔ ”اصل بات کیا ہے۔ ارم کو آپ لوگ کیسے جانتے ہیں؟ مجھے اس نے یہی کہا تھا کہ وہ گھروالوں کو اپنا کردہ ڈونٹ کرنے کے بارے میں بالکل نہیں بتائے گی، ورنہ انہیں بہت دکھ ہوگا۔“

معلوم ہوا کہ میرا بیٹا میڈیکل کے آخری سال میں ہے تو رویہ دوستانہ ہو گیا۔ ورنہ پہلے بھی لفٹ نہ کرائی۔ واجبی سی علیک سلیک کیا کرتا تھا۔

ماں بیٹے کے مابین جاری گفتگو قدرے بلند آہنگ ہونے پر اکبری سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حسن ماں سے مخاطب ہوا۔ ”امی! نرس کا پیشہ بہت مقدس ہے، اتنا ہی جتنا ڈاکٹر کا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ زبیدہ بھی اسٹاف نرس ہے۔ اس کو اتنا ہی سہی کی بیٹی کی عزت کیوں دے رکھی ہے۔؟“ اکبری شاہ نے ہاتھ بھلا کر بیٹے کو آواز دہمی رکھنے کا اشارہ دیا اور بولا۔ ”کچن میں اس کی ماں سن رہی ہوگی۔ زبیدہ واقعی میری بیٹی ہے۔ اس نے بیماری میں جس طرح میری خدمت کی، وہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔ ایسی نیک عورت اس شعبے میں خال خال ہی ہوگی۔ ورنہ یہ پیشہ یوں ہی بدنام نہ ہوتا۔ اور تم ہوش کے ناخن لو۔ سیلف فکس کے تحت تم پر پوری بھر کے نوٹ خرچ کیے ہیں۔ ہمارے اربانوں کا خون نہ کرو۔“

بیوی نے میاں کو ٹوکتے ہوئے راز دارانہ لہجے میں کہا۔ ”ہم آپس میں خطی نہ کریں۔ زبیدہ آنے والی ہے۔ اس کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ارم سے ہماری قریبی رشتے داری ہے۔ اس سے صرف اتنا پوچھیں کہ عملے نے مل کر جو کمیٹی ڈال رکھی ہے، وہ اس ماہ کس کو ملی۔ بس، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

حسن کے چہرے پر سخت مایوسی اور بے زاری کا تاثر ابھرا۔ اسی لمحے زبیدہ آن پہنچی۔ مہمانوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ گرم جوش سے غیر متقدمی کلمات کہے۔ میاں بیوی نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں کچن سے بوڑھی خاتون ٹرے میں چائے اور لوازمات کے برتن سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

تقریباً دس منٹ تک عام نوعیت کی گفتگو ہوئی ہوگی کہ اکبری نے بات چھپا کر موجودہ حالات، مہنگائی اور سفید پوش طبقے کے مسائل پر بولنا شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ ”بیٹی زبیدہ! ہم اچھے بھلے کاروباری لوگوں نے بھی بازار میں کیٹیاں ڈال رکھی ہیں۔ گچھی بات ہے، اس کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ سنا ہے آپ کا تنخواہ دار طبقہ بھی اسی طرح کیٹیاں ڈال کر موٹے موٹے خرچے پورے کرتا ہے۔“

زبیدہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی۔ ”اگل! مشورے ہی ہوتے رہتے ہیں زیادہ تر۔ بے چاروں کی پوری نہیں پڑتی، اس لیے ہر مرتبہ کمیٹی ڈالنے کا پروگرام آئندہ پر مال دیتے



ان ساری باتوں کے باوجود کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جیسے کوئی کسی کی رہ گئی تھی۔ ایسی کسی جس کا احساس صرف والدین ہی کر سکتے ہیں اور خاص طور پر ماں۔ اس لیے رابعہ نے اس طرف میری توجہ دلائی تھی۔

”ذرا نعمان کو تو دیکھیں..... کیا ہوا ہے اس کو۔“

”کیوں..... کیا ہوا ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”آپ باپ ہیں نا اس لیے آپ کو زیادہ نہیں معلوم۔ میں ماں ہوں اس لیے اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں کیونکہ آپ زیادہ تر باہر رہتے ہیں اور میں گھر پر ہوتی ہوں اور وہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔“

”خدا کی بندی..... اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا ہے اس کو؟“

”وہ کچھ کھو یا سادہ پریشان سا رہتا ہے۔“ رابعہ نے بتایا۔ ”میں نے ایک دو بار پوچھا بھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر میں خود آبرو کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ خدا کے لیے کچھ کریں۔ لڑکا ہے۔ اس کو آگے بڑھتا ہے، ترقی کرتی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔“

رابعہ نے خود مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ تھا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی تو بہت خطرناک تھی۔ ابھی تو اس کو آگے بڑھنا تھا۔ اس نے زندگی کو دیکھا ہی کہاں تھا۔

رابعہ کے کہنے پر میں نے اس طرح نعمان کی نگرانی شروع کر دی کہ اس کو احساس نہ ہوا کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے۔ دفتر سے جلدی گھر واپس آ جاتا اور اپنے کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر نعمان کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھا کرتا۔

رابعہ کا کہنا درست تھا۔ وہ واقعی بہت بدل چکا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت چڑچڑا ہوا گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر شور کرنے لگتا۔ برتن توڑ دیتا۔ اس جیسے فرماں بردار اور سنبھلے ہوئے لڑکے کی یہ حرکات باعث حیرت تھیں۔

وہ ایسا تو نہیں تھا۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دیتا۔ جیسے کہیں سے بہت زیادہ محنت کر کے آیا ہو۔ حالانکہ وہ ایک پھر تیار اور جوشیلا لڑکا تھا جس کو عام الفاظ میں اسماٹ کہتے ہیں۔ وہ واقعی بہت اسماٹ تھا۔ پورے خاندان میں اس کی مثال دی جاتی کہ اولاد ہو تو

نعمان جیسی۔ اب اسی نعمان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ کہیں سے آتے ہی بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔

اور تیسری بات تھی اس کی اداسی۔ ہر دم ہنسنے ہنسانے والے لڑکے کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ ہنسا ہی بھول گیا جیسے اس پر دکھوں کا پہاڑ گر پڑا ہو۔

یہ ایک خطرناک اور تشویشناک صورت حال تھی۔ میں باپ تھا اس لیے میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے ایک جاننے والے نیم صاحب یاد آ گئے۔ وہ ہرفن مولانا قسم کے انسان تھے۔ مشورے دینے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پورا خاندان، دوست، پڑوسی سب ہی ان سے مشورے لیا کرتے۔ کبھی بھی ان کے مشورے بہت کام کے بھی ثابت ہوتے اور ہر کامیاب مشورے کے بعد ان کی سادگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نعمان کی حالت کے پیش نظر ان کے پاس پہنچ گیا اور جیسے ہی میں نے انہیں نعمان کی طبیعت بتائی وہ اچھل پڑے۔

”اوہ..... خدا..... یہ تو گنجے چھلاوا کا کیس ہے۔“

نیم صاحب نے کہا۔

”گنجے چھلاوا..... یہ کیا چیز ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے بھائی! یہ ایک شیطانی قوت ہے۔“ نیم صاحب نے بتایا۔ ”عام طور پر نو جوان لڑکوں کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، وہ رات میں سوتا بھی نہیں ہوگا؟“

”جی ہاں۔ میں نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہے، وہ رات بھر بے چین رہتا ہے۔“

”میاں! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔ یہ گنجے چھلاوا کی کارستانی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے نیم صاحب لیکن اب اس کا علاج کیا ہے؟“

”گنجے چھلاوے کا علاج میرے مرشد بخاری صاحب کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ نیم صاحب نے بتایا۔

”اور یہ بخاری صاحب کہاں ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو، میں ابھی ملادیتا ہوں۔ ایسے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”فوراً چلیں نیم صاحب..... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”ارے میاں! اس میں مہربانی کیسی..... یہ تو اپنے ہی گھر کا کیس ہے۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ گنجے چھلاوا تمہارے بیٹے پر حاوی ہو جائے۔“

بہر حال ہم دونوں بخاری صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ایک منزلہ چھوٹا سا مکان تھا۔ دستک کے جواب میں کسی عورت نے دروازہ کھول کر بتایا۔ ”بخاری صاحب تو کئی دنوں سے بخار میں پڑے ہیں۔“

”نہیں وہ اس لیے تو بخار میں نہیں ہیں کہ انہیں بخاری کہا جاتا ہے۔“ میں دھڑکے سے بولا۔

اس پر نیم صاحب نے تیرا لود لگا ہوں سے میری طرف دیکھا پھر دروازہ کھولنے والی عورت سے مخاطب ہوئے۔ ”جائیں۔ انہیں بتادیں کہ نیم ان کی عیادت کے لیے آیا ہے۔“

اس وقت پتا چلا کہ وہ خاتون بخاری صاحب کی بیوی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ بخاری صاحب اپنے بستر پر لیٹے ہوئے رو رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کسی طرح اٹھ بیٹھے۔ وہ چالیس اور پینتالیس کے درمیان کے تھے۔ فریاد انداز۔

نیم نے بڑی عقیدت سے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر ایک بوسہ دیا۔ مجبوراً مجھے بھی ان کی تقلید کرنی پڑی۔ اس پر بخاری صاحب نے ہنسنے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”حضرت! یہ ہارون ہیں میرے دوست۔“ نیم صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے ساتھ ایک پرائیلم ہو گئی ہے۔“

”خدا خیر کرے۔ کیا ہو گیا ہے؟“ بخاری صاحب نے پوچھا۔

”قبلاً پھر کبھی حاضر ہو کر عرض کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت آپ کی طبیعت تاساز ہے۔“

”نہیں میاں! یہ تو ثواب کا کام ہوگا اور میں اس وقت پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

”حضرت! ان کے صاحبزادے کے ساتھ گنجے چھلاوے کا چکر ہو گیا ہے۔“ میرے بجائے نیم صاحب نے بتا دیا۔

”اوہ۔“ بخاری صاحب اب پوری طرح سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”ہاں میاں۔“ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”ذرا تفصیل سے بتاؤ، کیا کیفیت ہے تمہارے صاحبزادے کی اور کیا عمر ہوگی اس کی؟“

## لعنت

ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک صاحب نے پوچھا۔ ”آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟“ ”بہترین جناب۔“ استقبالیہ کلرک نے فخر سے کہا۔ ”آپ یہاں قیام کریں گے تو بالکل یہی محسوس کریں گے جیسے اپنے گھر میں ہیں۔“ ”میں لخت بھیجتا ہوں ایسے ہوٹل پر۔“ مہمان نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

انتخاب۔ آفتاب خان تنولی، مانسہرہ

## اے میرے پیارے پاکستان

وہ آہستہ آہستہ مجھ سے الگ ہوا۔ اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا اور کہا۔ میری آنکھوں میں دیکھو بڑی میں نے دیکھا تو اس نے کہا۔ جذبات سے لکھو۔ میں مر نہیں چلا لیکن حقیقت، حقیقت ہی ہوتی ہے۔ سپاہی اور موت کا بڑا گہرا یارانہ ہے۔ ہو سکتا ہے، میں تمہیں نڈل سکوں۔ میری موت کا پیغام لے اور ہو سکتا ہے، میں اپنا مشن پورا کر کے ہنسا کھیتا تمہارے پاس آ جاؤں۔ لیکن میں یہ تمہیں صاف الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان نے مجھ سے جان مانگی تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ میں یہ نہیں سوچوں گا کہ زمینی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں نہ مروں..... اگر درمیان میں پاکستان کا نام نہ آ جاتا تو میں اسے نہ جانے دیتی۔ مجھے پاکستان سے پیار تھا..... میں تو اپنی جذباتی کیفیت میں پاکستان کو ذہن سے اتار بیٹھی تھی۔ مجھے اسی نے یاد دلایا تھا کہ پاکستان ہمارا ملک ہے۔ ہندو ہمارا دشمن ہے اور ہم نے خون کے دریاؤں کی قربانی دے کر یہ خطہ حاصل کیا ہے۔

معروف ادیب عنایت اللہ مرحوم کی مشہور کتاب ”میں کسی کی بیٹی نہیں“ سے انتخاب

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال



”سولہ برس کی ہے جناب۔“ میں نے بتایا۔  
”تیسرک کا طالب علم ہے۔“  
”اور ہوا کیا ہے اس کے ساتھ؟“  
میں نے انہیں نعمان کی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”مبارک ہو۔“ بخاری صاحب نسیم صاحب سے مخاطب ہوئے۔  
”قبلہ! میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ میں بھنا کر بولا۔  
”میرے بیٹے کے ساتھ ایسی صورت حال ہے اور آپ نسیم صاحب کو مبارکباد دے رہے ہیں۔“  
”میاں! یہ تم نہیں سمجھو گے۔“ بخاری صاحب مسکرا دیے۔ ”یہ سلوک اور معرفت کی باتیں ہیں۔ میں نسیم کو اس بات کی مبارکباد دے رہا ہوں کہ اس کی تحفیں کامیاب جارہی ہے۔ اس نے جو بتایا وہ بالکل درست ہے۔“  
”حضور! یہ سب آپ کی نگاہ کرم کا فیض ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔

”میاں! ہو جائے گا تمہارا کام۔“ بخاری صاحب نے فرمایا۔ ”وہ عجیب چلاوا چلا جائے گا۔ میں اسے کسی بار پہلے بھی بھگا چکا ہوں۔“  
”فرمائیں حضور! مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے ادب سے پوچھا۔

”میں ایک چھری پر دم کر کے دوں گا۔“ بخاری صاحب نے کہا۔ ”اس چھری سے دس عدد مرغیاں ذبح کرنی ہیں اور ان کا خون ایک بالٹی میں جمع کرنا ہے پھر اس خون سے بچہ کو ہلانا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں یہ سن کر ہی بدک گیا تھا۔ ”قبلہ! وہ تو کبھی خون سے نہانے پر راضی نہیں ہوگا۔“

”یہ تو کرنا ہوگا۔ شفا کے لیے کڑوی دوا تو پینی پڑتی ہے۔“ بخاری صاحب نے کہا۔ ”اور وہ خالص خون بھی نہیں ہوگا۔ اس میں تھوڑا سا پانی ملا دینا۔“

”لیکن جناب! وہ تو پھر بھی پتا چل جائے گا کہ یہ کیسا پانی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ علاج تو یہی ہے۔“ بخاری صاحب کا لہجہ خشک ہونے لگا تھا۔ ”اگر ڈاکٹر پر اعتبار نہ ہو تو پھر علاج کے لیے اس کے پاس نہ آیا کریں۔“

”اچھا جناب۔“ پلین ناراض نہ ہوں، آپ مجھے چھری دم کر کے دے دیں۔“

بخاری صاحب نے گھر کے اندر سے ایک پرانی سی

چھری منگوائی اور اس پر دم کر کے چھری میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ لومیاں لے جاؤ اس کو۔ تمہارا کام ہو گیا۔“  
پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ نعمان اس بالٹی کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ ”آپ لوگوں نے مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔ میرا دماغ نہیں خراب جو اس خون سے نہاؤں۔“

”یہاں! تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔“ میں نے پیار سے سمجھایا۔

”بابا! کسی بھلائی۔ آخر مجھے ہوا کیا ہے؟ میں ٹھیک تو ہوں۔“

”ہیٹا! تم ٹھیک نہیں ہو۔“ رابعہ نے کہا۔ ”شاباش..... نہا لو اس سے۔ بس آنکھیں بند کر کے دو چار چپک پانی اپنے اوپر ڈال لو۔“

”لیکن کیوں..... میں ایسا کیوں کروں؟“

”میں نے کہا تھا کہ یہ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔“ میں نے اپنی بات دہرائی۔ ”تمہارے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔“

”پلیز بابا! وہ تقریباً روئے لگا تھا۔“ آپ لوگ مجھے کس چکر میں ڈال رہے ہیں۔“

لیکن جب میں نے سختی کی اور اس بے چارے پر زور دیا تو اس نے اس پانی سے نہانا شروع کر دیا۔

اس وقت اس کا حلیہ دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ سر نے پاؤں تک مرفی کے خون میں لتھڑا ہوا۔ بدبودار خون کی وجہ سے اس کا پورا بدن بدبودار ہو گیا تھا۔ وہ روتا جاتا اور نہاتا جاتا۔

خدا خدا کر کے مرفی کے خون اور پانی والی بالٹی ختم ہوئی تو اسے صاف پانی سے نہانے کی اجازت مل گئی۔

وہ بے چارہ اس دوران زور زور سے ابکیاں لیتا رہا تھا۔ نہا کر اس نے صاف کپڑے پہنے اور ناراض ہو کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

اس کی یہ کیفیت دو چار دنوں تک رہی تھی لیکن اس عمل کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ویسا ہی رہا، جیسے پہلے تھا۔

وہی چڑچڑاہٹ، وہی ہر وقت کی ٹھکن، وہی اداسی۔

اب کیا کیا جائے؟ ایک علاج تو کر کے دیکھ چکے۔ اب کون سا علاج کر سکتے تھے۔ اس وقت نسیم صاحب پھر پاد آگئے کیونکہ ہم ان کے علاوہ کسی اور سے مشورہ لیتے ہی نہیں تھے۔

میں نے نسیم صاحب سے کہا۔ ”نسیم صاحب! بیٹے کو بخاری صاحب کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ویسا کا

ویسا ہی ہے۔“  
”اوہ..... پھر تو معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔

”اس بے چارے کو تو خود بخود خون سے نہانا پڑا۔“  
”ارے بھائی۔ اس قسم کے علاج میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔“

”لیکن فائدہ تو کچھ بھی نہیں۔ وہ تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔“

”ہاں، یہ بات قابل غور ہے۔“ نسیم صاحب نے کہا۔ ”اب تم ایک اور کام کرو۔“

”چلو، وہ بھی بتا دیں کیا کروں۔“  
”تم اپنے بیٹے کی شادی کر دو۔“

”شادی کر دوں؟“ اس بار تو میں چیخ ہی اٹھا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں نسیم صاحب۔“  
”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس عمر میں شادی کا خیال اسی طرح پریشان کرتا ہے۔“

”رہنے دیں آپ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔“  
”صرف سولہ سال کا ہے۔“

”اس سولہ سال کی عمر میں چندر گپت سور یہ کو تین بچے ہو گئے تھے۔“

”ہو گئے ہوں گے لیکن میرا بیٹا چندر گپت سور یہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ صرف نعمان ہے، سیدھا سادہ نعمان۔“

”تو پھر ایسا کرو، اسے لے کر کہیں چلے جاؤ۔“  
”کہاں چلا جاؤں؟“

”کہیں بھی..... اسلام آباد، لاہور، مری وغیرہ کہیں بھی لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے اس پر کوئی اچھا اثر پڑ جائے۔“

”ہاں۔ آپ نے یہ مشورہ ڈھنگ کا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آب و ہوا بدلنے سے شاید کچھ بہتری آجائے۔“

”بس میاں دیر نہ کرو۔ لے جاؤ اس کو۔“

نسیم صاحب کا یہ مشورہ بہت مقبول تھا۔ میں نے گھر آ کر جب رابعہ سے ذکر کیا تو بات اس کی بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ”ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“

بلکہ یہاں تک ہوا کہ خود نعمان بھی یہ سن کر خوش ہوا کہ گھر والے آؤنگنگ کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس نے اس پروگرام میں بھرپور دلچسپی لی تھی۔

”ٹھیک ہے ابو۔“ اس نے کہا۔ ”مزہ آئے گا۔ ہم باہر گئے بھی نہیں ہیں۔ لاہور گھومیں گے۔ شاہی قلعہ دیکھیں

گے۔ بادشاہی مسجد جائیں گے۔“  
”ہیٹا۔ لاہور میں اور بھی بہت کچھ ہے دیکھنے کے لیے۔“ میں پر جوش ہو کر بولا۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ نعمان زندگی کی طرف واپس آ رہا ہے۔“

پھر ہم تینوں لاہور آ گئے۔ نعمان بہت خوش تھا۔ وہ خوب تفریح کرتا۔ ہنستا، بولتا، بالکل پہلے والا نعمان ہو گیا تھا۔ یعنی نسیم صاحب کا یہ مشورہ بالکل درست تھا کہ نعمان کو شہر سے باہر لے جاؤں۔ آؤنگنگ کے بعد وہ سنبھل جائے گا۔

لاہور میں تو وہ سنبھل گیا تھا لیکن جب ہم ایک ہفتے بعد کراچی لوٹ کر آئے تو پھر وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ یعنی اداس، چڑچڑاہٹ اور تھکان۔

میں پھر نسیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

”چلو۔ وہاں جا کر تو ٹھیک ہو گیا تھا۔“ نسیم صاحب نے کہا۔

”نسیم صاحب! اب میں ہمیشہ کے لیے تولا ہو رہا ہوں نہیں رہ سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”واپس آنے کے بعد اس کی پھر وہی کنڈیشن ہو گئی ہے بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔“

”تو پھر ایسا کرو، اسے کسی ایٹھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

”ڈاکٹر کے پاس کیا مطلب؟ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے یا بیمار ہے؟“

”نہیں میاں! ایک تیسری کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔“

”اور وہ کیا ہے؟“

”میں تمہیں ایک قطعہ لکھ کر دے رہا ہوں۔ اسے اچھی طرح یاد کر کے ڈاکٹر کو سنانا۔“

”نسیم صاحب! میرے بیٹے کی ایسی کنڈیشن ہے اور آپ کو شاعری کی سوجھ رہی ہے۔“

”دیکھو، جو قطعہ ہے، نا، یہ تمہارے بیٹے کی بیماری کا راز ہے۔ تم کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔“

”چلیں سنائیں کیا قطعہ ہے۔“

بر دم اداس چڑچڑاہٹ ہے تھکن سے چور  
سولہ برس میں کیا مقدر ہے دیکھیے  
گھبرائے اس کو لانے ہیں تحفیں کے لیے  
بیٹے کو میرے عشق کی شوگر ہے دیکھیے

ویسے تو یہ قطعہ نسیم صاحب نے میرے بیٹے کے لیے لکھا تھا لیکن آپ بھی اپنے صاحبزادے پر نظر رکھیں۔



## مذہب شہر و سخن

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال  
انسان کو لازم ہے رہے دور ریا سے  
یہ چیز جدا کرتی ہے بندے کو خدا سے  
✽ عبدالرزاق.....  
ستارے چپ ہیں مگر کچھ پتا تو دیتے ہیں  
کوئی بھی سمت سہی راستہ تو دیتے ہیں  
تسلیم اتنی شناسائی بھی غنیمت ہے  
گلی کے لوگ برا گھر بتا تو دیتے ہیں  
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی  
تلقین وفا کی گھڑتا تھا بر محفل وہ شیریں سخن  
جب اس پر وفا کی شرط کی تو عشق سے وہ غافل نکلا



✽ راجیل احمد..... رحیم یار خان  
موسم کبھی ایسا کوئی آیا ہی نہیں ہے  
دامن میں کسی چیز کے سایہ ہی نہیں ہے  
جس پر ستم ایجاد تجھے کہہ سکیں ہم بھی  
کم ظرف تجھے وہ ستم آیا ہی نہیں ہے  
✽ محمد شاہد نواز..... عبدالکیم، ضلع خانیوال  
دل کشادہ ہے برا گاؤں کے آگن جیسا  
تنگ سوچیں ہیں بری شہر کی گلیوں جیسی  
✽ کہکشاں..... میر پور خاص  
میں لاکھ محترم ہوتی پر ذمہ داری رہی  
لذت جو تیرے شہر کی رسوائیوں میں ہے  
✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف  
شاخ سے کتنے کا غم ان کو بہت تھا لیکن  
پھول مجبور تھے ہنسنے رہے، گل دانوں میں  
✽ محمد آریز ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
اگر نشان سفر تک کہیں نہیں، نہ کسی  
میں ریک ریک کے یہ شب نہیں گزاروں گا  
گھست سے مرا اخلاق ابھی ہے ندیم  
سحر لے نہ لے، رات سے نہ ہاروں گا



✽ ہادیہ ایمان، ماہ ایمان..... فورٹ عباس  
خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے  
اہل تپش کو آتش سینا نہ چاہیے  
✽ محمد اکبر..... اسلام آباد  
اک نہ اک دن جبر کا موسم گزر رہی جائے گا  
روک سکا ہے کب کوئی وقت کی رفتار کو  
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی  
کس قدر قحط وفا ہے میری دنیا میں ندیم  
جو ذرا ہنس کے لے اس کو مسیحا سمجھوں  
✽ شگفتہ بانو..... ملتان  
پس دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند  
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں  
یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصیلیں، یہ حصار  
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... پورے والا  
موج مستی بھری ہو زندگی خوش رنگ ہو  
دل کو اچھا لگے کوئی پیار کا رنگ بھرنے والا  
✽ زرین نیازی..... پشاور  
جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی  
وہی سفاک مرے دہس کا ہدم کیوں ہو  
✽ امتیاز احمد..... منڈی بہاؤ الدین  
دشتیں مجھ میں جڑ پکڑنے لگیں  
اس قدر دشتوں کی بات ہوئی  
پہلے سارے دیے بجھائے گئے  
اور پھر آندھیوں کی بات ہوئی  
✽ نعمان..... راولپنڈی  
تری یادیں بھرتی جاری ہیں  
کس مجھ میں شہر بڑھتا جا رہا ہے  
مسکمل ہو رہی ہے نوحہ خوانی  
مرے اندر کوئی ماتم سرا ہے

✽ محمد اقبال..... کراچی  
نبویوں نے چمک سے فریب کھایا ہے  
خلا میں چند ستارے ابھی سیاہ بھی ہیں  
✽ وردہ ملک..... کراچی  
بس یہ لکھتا اداس ہے موسم  
دکھ کے ماروں کا ذکر مت کرنا  
اس سے کہنا دعائیں روشن ہیں  
شب گزراؤں کا ذکر مت کرنا  
✽ ندیم احمد..... انک  
سنا ہے روشنی وہ پاؤں سی  
اندھیروں سے محبت کر رہی ہے  
خطوں میں بھیج کر وہ خشک پتے  
جدائی کی وضاحت کر رہی ہے  
✽ خالد انصاری..... حیدرآباد  
سائے کشیں گے کہ ظلمت پہ کوئی آج نہ آئے  
تیرگی چاہے گی، لیکن نہ اماں پائے گی

✽ چہانزیب..... لاہور  
ہو کا عالم ہے کسی شہر فحشاں کی طرح  
اس خرابے میں اڑاں دینے کو جی چاہتا ہے

✽ نور الدین..... سرگودھا  
یہ مہریاں سی نگاہیں سپردگی کی وعید  
میں جانتا ہوں یہ اس کی ادا ودا ہے سب

✽ عامر خان..... چنیوٹ  
شام ہے دل اداس بھی ہے بہت  
اداسی کہ راس بھی ہے بہت  
تم مجھے درد دینے آئے ہو؟  
درد تو میرے پاس بھی ہے بہت

✽ محمد عمران..... وہاڑی  
ضبط کا حوصلہ نہ پوچھ ابھی  
وقت کیسے کٹا، نہ پوچھ ابھی  
پہلے یہ تھلیاں اٹھانے دے  
گیا ہوا سانچہ نہ پوچھ ابھی

✽ ارم اور لیس..... گھوٹکی  
جس میں رہی تھی زندگی کی گلن  
اب نہ اس گھر، نہ اس گلی کا پتا  
جس کے بس میں نہیں رہا کچھ بھی  
تم کو کیا اس کی بے بسی کا پتا

✽ عابد علی..... کوئٹہ  
وہ دن گئے کہ کوئی کہیں بولتا نہ تھا  
اب چپ رہیں گے شہر میں دیوار و در کہاں

✽ مدحت..... کراچی  
ایک دن دیکھتا بھج جائیں گے منظر سارے  
خواب رہ جائیں گے تسکین نظر کی خاطر

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
زیست میں جاں سے گزرتا بھی پڑا تو سن لے  
خود سے پہلے تو گزرتے نہیں دیں گے تجھ کو

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی  
خود کو مشکل میں ڈالنا ہے ابھی  
اس کو دل سے نکالنا ہے ابھی  
ایک صحرا کی خاک چھانی ہے  
اک سمندر کھگانا ہے ابھی

✽ محمد عامر..... میانوالی  
وہ آنکھیں دیواریں کھتی رہتی ہیں  
ان آنکھوں میں جیسے کوئی قصہ ہے



## بددعا

محمد فاروق انجم

عمروں کے تضاد کو فراموش کر کے بے اختیار چاہنے والے اس عاشق نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وقت نہ صرف آنکھیں بلکہ کان بھی رکھتا ہے اور جب ان مشکل لمحوں میں کسی کی زبان سے بددعا نکلی تو قبولیت کی اس گھڑی میں اس عاشق کے دل سے بھی ایک انوکھی دعا نکل گئی... اور پھر آنے والے اس وقت نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ اس نے سنا اور قبولیت کی بساط میں لپیٹ کر جب وہ منظر ان دونوں کے سامنے لاکھڑا کیا تو دیکھنے والے ان لرزہ خیز لمحات میں ششدر رہ گئے۔

کچھ خاص لمحوں کی گرفت میں قید ہونے

والے لفظوں کا ماحیرا



فون ایک طرف رکھ دیا۔

تاج احمد کی عمر ساٹھ سال سے زائد تھی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن چہرے پر بڑھاپا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک کامیاب کاروباری

قیمتی اور چھپاتی گاڑی لال بٹی پر رک گئی اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر براجمان تاج احمد نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی مل وقت دیکھا اور اپنے موبائل فون کی اسکرین روشن کرنے کے بعد ایک لمبے کے لیے کچھ سوچا اور پھر موبائل

وقت کی قید نہیں گردش تقدیر نہیں پلنے والے غم حالات میں پل جاتے ہیں

بریرہ... کراچی  
دل کے شیشے پر نہ لکھو راز کی باتیں کبھی آنکھ کی کھڑکی کھلی ہے عکس باہر آئے گا

شہزاد خان... منڈی بہاؤ الدین  
دیوانے ہیں ہم جھوٹ بہت بولتے ہیں ہم کو سربازار یہ عزت دی جائے

شہلا رضوان... سیالکوٹ  
رچی ہوئی ہے بدن میں مسافروں کی تھکن کچھ احتیاط سے اب تو گلے لگائیں مجھے

میمونہ... فیصل آباد  
وہ اب شرط گرفتاری کی یہ بنیاد رکھیں گے تجھے قیدی بنائیں گے مگر آزاد رکھیں گے

ظہیر الدین... اسلام آباد  
سفر کا نشہ جو اترا تو یہ کھلا مجھ پر بڑی طلب میں، میں اپنی طرف روانہ تھا

شاہد... کراچی  
ہم اپنے دل کا کہا مانتے رہے وہ بہت سی باتیں تو ہم نے اسے بتائیں نہیں

امبرین... ملتان  
سماعتوں کو عجب کرب سوچ کر مگڑا وہ ایک لفظ شناسا جو تیرے لب سے نہ تھا

محمد ناصر... ٹنڈوالہیار  
تیرے بارے میں کوئی رائے کہاں سے لاؤں جھوٹ بولوں گا تو سچائی چلی جائے گی

شاہ زیب... پاکپتن شریف  
ؤس گئے دیوار و در کو گھر سے سناؤں کا غم حادثے چپ چاپ ہی سب گھر کے اندر ہو گئے

نزدہیب احمد ملک... گلستان جوہر کراچی  
لوگ کانٹھوں پہ غبار اپنا لیے پھرتے ہیں تم خدا کے لیے ایسی نہ مسافت کرنا

محمد طلحہ... کراچی  
وہ اور ہوں گے جو ہوں گے ترے قریبوں میں بری تو خیر سے دلہیز تک رسائی ہے

زینب... فیصل آباد  
تلاش منزل شوق و طلب میں نکلے تھے ظلم ہوش رہا ہو گیا سفر کیسے

طارق احمد... راولپنڈی  
شہر کو کیا ہو گیا ہے دوست دشمن ہیں کہاں ماسوا اپنے کوئی اپنا تماشائی نہیں

کوکب خواجہ... میرپور خاص  
اس طرح ٹوٹ کے برسا ہے دکھوں کا بادل جو حیرت ہے مرے ساتھ شریک غم بھی

شازیہ... کراچی  
لوگوں کو جس نے دی تھیں دعائیں تمام عمر لوگوں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا

رضیہ عمیر... سکس  
اک دوسرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں

سلیمان احمد... گوجرانوالہ  
شہر دل میں جم گئی آوارہ سناؤں کی گرد ایک مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں

افشین نیازی... پشاور  
بوجھلی ہیں اس نے کیسے نظر کی پہیلیاں وہ شخص تو بنا کا نظر ناشناس تھا

رضوان احمد... جھنگ شہر  
سحر ہوئی اور جھلمل کرتے تاروں کا اک اک کر کے سارا لشکر لوٹ گیا

محکم دعوے کے بغیر

کوین  
برائے  
ستمبر  
2018



فصل تھا، دولت کی ریل پیل تھی۔ وہ اپنی آسودہ زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس کی بیوی اس کی بہترین دوست تھی اور اس کی اولاد اس کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو چکی تھی۔ رات کو اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ کبھی نہ کہیں محفل جم جاتی اور پھر بھر پور آسودہ نیند کے لیے وہ اپنے بیڈ پر چلا جاتا۔

تاج احمد کے دن رات بہت مزے میں مگر رہے تھے۔ دولت کا انبار بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک تاج احمد کی گاڑی کا شیشہ کسی نے اپنی انگلی سے بجایا تو اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ باہر اجڑے پال، بڑھی ہوئی شیعہ اور میلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا اور جوہنی تاج احمد نے اس آدمی کی طرف دیکھا باہر کھڑے آدمی کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ تاج احمد پہلے تو اس شخص کی طرف ایسے ہی دیکھتا رہا پھر اسے لگا وہ چہرہ آشنا ہے، اس نے غور سے دیکھا تو اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں، وہ حیرت سے چونک پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔ دونوں کے چہرے حیرت زدہ تھے۔ اچانک باہر کھڑے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے بتانے کی کوشش کی کہ وہ ان ہی سڑکوں پر ہوتا ہے، کبھی یہاں، کبھی وہاں اور کبھی اس جگہ سے کچھ دور۔ لیکن اس کا ٹھکانا یہی سڑکیں ہیں۔ پھر اس نے اپنے میلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جیسے وہ بتا رہا ہو کہ وہ کچھ لویر اکیا حال ہے۔

لال جی بند ہوئی اور بڑی سنی روشن ہوئی۔ تاج احمد کی گاڑی کو اس کے ڈرائیور نے آگے بڑھا دیا۔

”ایک طرف گاڑی روکو۔“ تاج احمد نے جلدی سے کہا۔ ڈرائیور نے چوک عبور کیا اور گاڑی سڑک کی ایک طرف روک دی۔ شدید گرمی اور جس میں تاج احمد اپنی ٹھنڈی کار سے باہر نکلا اور تیزی سے اس طرف بھاگا جہاں اس نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ اس کی مٹلائی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں لیکن وہ شخص کہیں دکھائی نہیں دیا۔

تاج احمد اسی جگہ پہنچ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ چاروں طرف گھوم رہا تھا مگر وہ شخص ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے وہ اس جگہ دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ تاج احمد بے قراری سے تلاش کرتا رہا۔

☆☆☆

تاج احمد کی گاڑی اس کے پتکے کے وسیع گیراج میں کھڑی ہوئی تو وہ مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکلا۔ حسب معمول اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی جسم میں وہ چستی تھی جو ہر ایک کو دیکھنے کو ملتی تھی۔ وہ اندر گیا تو اس کی بیوی فرزانہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ تاج احمد کو دیکھ کر وہ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج آپ نے دیر کر دی۔ کہیں رک گئے تھے کیا؟“

تاج احمد اس کی طرف دیکھ کر چونکا اور بولا۔ ”نہیں بس راستے میں ہی آتے ہوئے دیر ہو گئی۔“

فرزانہ نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”مجھے آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ تاج احمد نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تاکہ معمول کے مطابق اس کی بیوی کو لگے کہ اس کے شوہر کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے اور نہ ہی پندرہ سال کے بعد اچانک اس شخص کو دیکھ کر اس کے اندر کی جو کیفیت ہے وہ اس کی بیوی پر عیاں ہو سکے۔

”آج ڈنر مسز قذیری کی طرف ہے، آپ کو یاد ہے؟“

فرزانہ نے یاد دلایا۔

”مجھے یاد ہے۔ فی الحال مجھے اچھی سی چائے بنا دو۔“ ایک بار پھر تاج احمد نے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حالانکہ اس وقت اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنے اندر کی کیفیت کو چھپانے کے لیے اسے چائے کا کہنا پڑا۔

فرزانہ کے سامنے تاج احمد نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنے اندر کی کیفیت کو اس کے سامنے عیاں نہ ہونے دے لیکن فرزانہ بے ہمت ہو کر تاج احمد کو کوئی پریشانی ہے۔ فی الحال اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اور ملازم کو آواز دے کر چائے بنانے کا کہہ دیا تھا۔

کمرے میں جا کر تاج احمد نے اپنی ٹائی کھول کر بیڈ پر ایک طرف اچھال دی۔ تاج احمد کا یہ بھی معمول تھا کہ وہ جب بھی کپڑے بدلے۔۔۔ الماری میں ونگ کر دیتا تھا۔ اس نے بھی ٹائی یا اپنی شرٹ اس طرح سے بیڈ پر نہیں پھینکی تھی۔ یہ اس کے اندر کی پریشانی تھی جس نے اسے ارد گرد سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کی سوچیں ایک حصار میں قید

ہوئی تھیں۔

پندرہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ پندرہ سال کے بعد وہ اچانک اسے سڑک پر بھکاری کی حالت میں ملا تھا۔ اسے ایک بھکاری کی شکل میں دیکھ کر تاج احمد کی روح کانپ گئی تھی۔ اسے اور بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ بہت سی باتیں اس کے دماغ میں تھوڑے کی طرح برسنے لگی تھیں اور اس کا جسم پسینے میں جھجک گیا تھا۔ وہ ان باتوں کو سوچ کر اور بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، اسے لگا جیسے وہ ابھی بے جان ہو کر گر جائے گا۔

تاج احمد ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو ڈرائیور بھاگ کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ تاج احمد نے اس سے گاڑی کی چابی لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی پتکے سے باہر نکلی اور چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ فرزانہ ایک طرف کھڑی تاج احمد کو اس غلت میں جاتا ہوا حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر تاج احمد کی گاڑی اسی سڑک پر ایک طرف کھڑی ہوئی اور وہ کسی دیوانے کی طرح متلاشی نگاہوں سے اس بھکاری کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ بھاگ کر کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف چلا جاتا تھا۔ ہر لمحہ اس کی پریشانی اور بے قراری دو چند ہوتی جا رہی تھی۔

تاج احمد کا جسم گرمی کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک اور بھکاری پر پڑی جو سڑک کے ایک طرف کھڑا تھا۔ تاج احمد نے اس کی طرف جاتے ہوئے اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کے پاس چلا گیا۔ تاج احمد نے ایک بار اس کی نگاہوں کے سامنے پانچ سو کا نوٹ لہرایا اور پوچھا۔

”یہاں ایک بھکاری تھا۔۔۔ اس نے جینز کی پرانی اور پچنی پیٹ بنی ہوئی تھی اور اس طرح کی لال شرٹ اس کے بدن پر تھی۔۔۔“

”ہیرو کا پوچھ رہے ہو صاحب!“ اس بھکاری کی لپٹائی نگاہیں تاج احمد کے ہاتھ میں پکڑے پانچ سو کے نوٹ پر تھیں۔

”اسے ہیرو کہتے ہو تم لوگ؟“

”وہ ہیرو ہی ہے۔ ہیرو کے نام سے ہی اسے جانتے ہیں۔ کہتا ہے کہ وہ بڑا امیر کبیر تھا۔“ بھکاری کہتے ہوئے

ہٹا۔ ”بہت فونٹکی کرتا ہے، ایک سے بڑی ایک گپ سنا رہے۔“

”وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟“ تاج احمد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

بھکاری نے زبان کھولنے سے قبل پانچ سو کے نوٹ پر اپنی نظریں جمادیں۔ تاج احمد اس کا ارادہ بھانپ کر بولا۔

”یہ نوٹ تمہیں ہی ملے گا، بتاؤ وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔“

”اس وقت اس کا پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہوگا، لیکن شام ہوتے ہی وہ سائیکس دربار کے پیچھے جو نہر ہے اس نہر کے ساتھ بھی جائے گا ہوں ہو گا جواب بند ہو چکا ہے اور وہاں ڈھانچا کھڑا ہے، وہ اسی جگہ ملے گا۔ وہ اس کا پکا ٹھکانا ہے۔“

”تم مجھے سچ بتا رہے ہو؟“ تاج احمد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے صاحب۔“ وہ مسکرایا۔ تاج احمد نے پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بھکاری نوٹ پکڑتے ہی اس جگہ سے ایسے نو دو دو گیارہ ہوا گو یا اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ یا اسے ڈر ہو کہ کہیں وہ آدمی اس سے نوٹ واپس چھین نہ لے۔

تاج احمد نے اپنی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ وہ چلتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس پہنچا اور اندر بیٹھتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

جب تاج احمد اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس وقت فرزانہ لان میں بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں تاج احمد پر مرکوز تھیں۔ تاج احمد اداس اور سوچوں کی تسکین میں جھنجکے کھانا اندر کی طرف بڑھا تو اچانک اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا اور اس کے قدم رک گئے۔ وہ فرزانہ کے پاس چلا گیا۔

”مجھے چائے کا کہہ کر آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ایک کام یاد آ گیا تھا۔“

”بہت اہم کام تھا؟“

”ہاں بہت اہم کام تھا۔“

”مجھے نہیں بتائیں گے کیا کام تھا؟ آپ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔“ فرزانہ کی نگاہیں اپنے شوہر کا جائزہ



بھی لے رہی تھیں۔

تاج احمد نے سوچا اور پھر بولا۔ ”بتاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن ابھی نہیں۔“ تاج احمد نے کہتے ہی جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ فرزانہ کی نگاہوں میں تشویش تھی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی تاج احمد جب اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو فرزانہ نے عقب سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”ایک کام سے جا رہا ہوں۔“

”ایسا کونسا کام ہے جو مجھے بھی نہیں بتایا جا رہا ہے؟“ فرزانہ نے کہا۔ ”میں پریشان ہوں۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی مجھے جانا ہے۔“ تاج احمد اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

”مجھے پریشانی ہو رہی ہے، مجھے بتائیں کیا بات ہے، آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ فرزانہ تیزی سے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ تاج احمد نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”مجھے کسی سے ملنا ہے، وہ مل جائے تو پھر سب کچھ بتا دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“ تاج احمد یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ فرزانہ اسی جگہ کھڑی رہ گئی۔

تاج احمد کی گاڑی جانے کے اس دیر ان کھوکھے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کھوکھے کے اندر فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور وہی بھکاری لیٹا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اور پھر تاج احمد کو دیکھ لیا تھا۔

تاج احمد اس کے پاس چلا گیا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر ایک دم سے وہ بھکاری اپنی جگہ سے اٹھا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔

”میرے اس گھر میں آپ کو بٹھانے کے لیے کوئی کرسی نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو یہاں بٹھانیں سکتا۔“ ”میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔“ تاج احمد کے چہرے پر رستہ نہ تھی۔

”ظاہر ہے ایک امیر کبیر آدمی ایک بھکاری کے پاس بیٹھنے کے لیے تو نہیں آسکتا، اسے تو کوئی اور ہی مطلب ہوگا، کوئی ایسی فکر ہوگی جس نے اسے بے چین کر دیا ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

”تم ان باتوں کو چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“ تاج احمد ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

”مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ اس نے بدستور

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔“

”میں اپنے اس گھر میں خوش ہوں۔ تم نے مجھے دیکھ لیا اور اب مل بھی لیا ہے۔ ہم دونوں کی ایک بات پوری ہو چکی ہے، اور آگئی بات میرا خیال ہے کہ جلد ہی پوری ہو جائے گی اور پھر۔۔۔۔۔ ہم دونوں کے گھر ہم سے خالی ہو جائیں گے۔“ اس کے لہجے میں کرب تھا جو وہ دونوں ہی محسوس کر سکتے تھے۔

”تم میرے ساتھ چلو، ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو معاف کر دینے سے شاید دوسری بات پوری نہ ہو۔“ تاج احمد نے جلدی سے کہا۔

”اب کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی بیت چکی ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے زندہ تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے اور اب موت ہم کو دیوچ لے گی۔“

”دیکھو مظہر حسین۔۔۔۔۔“ تاج احمد نے ابھی اس کا نام لیا ہی تھا کہ وہ ایک دم سے چوٹا اور بولا۔

”کئی سالوں کے بعد میرا نام کسی نے لیا ہے۔ میں تو اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔ سب مجھے بھیر دیتے ہیں۔ آج اتنے سالوں کے بعد اپنا نام سن کر مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ کیا واقعی میں مظہر حسین ہوں؟“

”تم مظہر حسین ہو، میرے دوست ہو، آؤ میرے ساتھ چلو ہم گھر چلتے ہیں۔“ تاج احمد نے تڑپ کر کہا۔

”دوستی تو بہت سال پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اب محض جان پہچان ہے۔ تم تاج احمد ہو اور میں مظہر حسین ہوں۔ میری اس دنیا میں تجھے کوئی نہیں جانتا اور تیری دنیا میں میری حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہیں ہے۔“ مظہر کی آنکھیں بھیک مگی تھیں۔ ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔

”مظہر تم میرے ساتھ چلو، ہم یہ کہہ کر باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں میں پھر اسی دنیا میں لوٹا دوں گا جس دنیا کا تم حصہ تھے۔“ تاج احمد نے کہا۔

”اب یہی میری دنیا ہے اور میں اس دنیا کا حصہ ہوں۔ اب میں لوٹ کر کیا کروں گا، اب تو موت کسی بھی وقت ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر ہرنا تاختم کر دے گی۔“

تاج احمد تڑپا۔ ”تم ایسی باتیں مت کرو۔“ ”یہی حقیقت ہے تاج احمد۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے تم نے

مجھے کیا کہا تھا اور اپنے کہے کی حقیقت کو تم دیکھ رہے ہو اور میں نے کیا کہا تھا؟ تم کو نہیں لگتا کہ ہم عفریب ایک اور حقیقت کا سامنا کرنے والے ہیں۔“ مظہر نے اس کی آنکھوں میں چھانکنا اور تاج احمد کو محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں بیڑیاں رہ گئی ہیں۔

”تم ابھی میرے ساتھ چلو اور ان باتوں کو چھوڑ دو۔“ تاج احمد کو پریشانی ہونے لگی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم جاؤ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کے پاس وقت کم ہے۔ تم آئندہ جب چاہو مجھے یہاں ملنے اور دیکھنے کے لیے آسکتے ہو، ہم دونوں کا سامنا شاید بہت اذیت ناک ہو۔“ مظہر یہ کہہ کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اس کے سامنے تاج احمد ناچار کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ اس کے اندر کا کرب اور بے چینی اسے بے حال کر رہی تھی۔ مظہر نے اس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

تاج احمد اور فرزانہ کو رات کے کھانے پر جانا تھا لیکن دونوں ہی تیار ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ تاج احمد کا چہرہ اداس اور پریشان تھا۔ جبکہ فرزانہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ تاج احمد نے خود فرزانہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا اور اب فرزانہ اس انتظار میں تھی کہ وہ کیا بات کرتا ہے۔ مزید کچھ توقف کے بعد تاج احمد نے اداس لہجے میں کہا۔ ”تم میرے دوست مظہر حسین کو جانتی ہو۔۔۔۔۔“

”ہاں جانتی ہوں۔“ اس کا نام سن کر فرزانہ بھی ایک دم سے چونکی۔ ”کیا وہ ملا آپ کو؟“

”ہاں۔“ ”کہاں اور کس حال میں؟“ فرزانہ نے تیزی سے پوچھا۔ یہ سن کر فرزانہ کے جسم میں بھی بے چینی دوڑنے لگی تھی۔

”میں نے اسے اسی حال میں دیکھا ہے جس حال کی میں نے اسے بدعادی تھی۔“ تاج احمد نے بتایا تو خوف سے فرزانہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ خوفزدہ لہجے میں فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگتا ہے۔“ تاج احمد کی بات سن کر فرزانہ کی سانس رگ رہی تھی اور چہرے پر خوف مترشح تھا۔

دونوں پندرہ سال پیچھے چلے گئے۔ دونوں کو وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں، اور وہ حالات ان کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

پندرہ سال پہلے۔۔۔۔۔ تاج احمد اور مظہر حسین بہت گہرے اور بے تکلف دوست تھے۔ مظہر حسین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے باپ کا۔۔۔۔۔ بڑا کاروبار تھا اور اس لیے مظہر کو کامیاب کاروبار کی کرسی پر بیٹھنے ہی دولت کمانے کی کوئی فکر نہیں کرنا پڑی تھی۔

تاج احمد اپنا کاروبار ریٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت حد تک اپنے کاروبار میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دونوں کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی، وہ ایک ساتھ گپ شپ لگاتے تھے، ایک ساتھ کھوتے تھے اور اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے نہیں چھپاتے تھے۔

تاج احمد کی شادی ہو چکی تھی جبکہ مظہر ابھی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تاج احمد کی ایک چھوٹی بہن تھی۔ تاج احمد اس کی شادی کی فکر میں تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کی شادی اچھی جگہ کرے۔ اس کے لیے وہ کوشش بھی کر رہا تھا۔

ایک دن اس نے اس بات کا تذکرہ مظہر سے کر دیا۔ مظہر چونکہ اس کی بہن کو دیکھ چکا تھا اور دل ہی دل میں پسند بھی کرتا تھا لیکن اس نے اس لیے اٹکھار نہیں کیا تھا کہ دونوں میں عموں کا کافی فرق تھا اور پھر تاج احمد اس کا دوست تھا۔ جب وہ اس کے گھر جاتا تھا تو تاج احمد کی بہن مظہر کو اٹکل کہتی تھی۔ وہ یہ لفظ سن تو لیتا تھا لیکن اس سے برداشت کرنا مشکل ہوتا تھا۔

مظہر کئی بار سوچ چکا تھا کہ وہ کسے تاج احمد سے بات کرے۔ اس کے اندر ہمت بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں تاج احمد نے اپنی بہن کا رشتہ ایک بہت اچھے گھرانے میں طے کر دیا۔ وہ گھرانا ایسا تھا جیسا تاج احمد چاہتا تھا۔

مظہر کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ نہیں اور ہو گیا ہے۔ اس کے دل پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ وہ مضطرب ہو گیا اور چاہتا تھا اس سے قبل کہ تاج احمد کی بہن کی شادی ہو جائے تو تاج احمد سے بات کر کے اس رشتے کو ختم کرا کے اس سے خود



شادی کر لے۔

بات پھر اسی جگہ رک جاتی تھی کہ وہ بات کہے کرے؟ ایک دن اچانک مظہر کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو تاج احمد کی بہن کے منگیترا کا بہنوئی تھا اور اس سے مظہر کی اچھی جان پہچان تھی۔

اس ملاقات کے بعد مظہر کے دماغ میں بات آئی کہ وہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ ختم کر دے اور جب ایسا بار بار ہونے لگے تو تاج احمد تھک جائے اور وہ مایوس ہو جائے تو وہ اپنی بات کر لے، تاج احمد کیونکہ مایوس ہوگا اس طرح وہ اس سے اپنی بہن کی شادی کرنے پر رضا مند ہو جائے گا۔

اس شیطانی سوچ نے مظہر کو ایک اور ایسے شخص سے ملوایا جو لوگوں کے رشتے کرانا تھا اور وہ چرب زبان بھی تھا۔ مظہر نے سوچا وہ اس شخص کے ذریعے سے تاج احمد کی بہن کا رشتہ آسانی سے ختم کر دیا کرے گا، جہاں بات چلے گی وہاں وہ اس آدمی کو بیچ دیا کرے گا اور یوں بات چلنے سے پہلے ہی ختم ہو جایا کرے گی۔

تاج احمد کی بہن کا اب جہاں رشتہ ہوا تھا اس جگہ اس کا اپنا تعلق تھا، اس لیے وہ خود ہی اس رشتے کو ختم کر سکتا تھا۔ ایک دن وہ پھر لڑکے کے بہنوئی سے ملا اور اسے کھانے پر باہر لے گیا۔ باتوں باتوں میں مظہر نے تاج احمد کا ذکر کر دیا اور جھجکتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کہوں..... رشتہ طے کرنے سے پہلے آپ نے تاج احمد کے بارے میں چھان بین کر لی تھی کیا؟“

”آپ کھل کر بات کریں کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ الیاس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ سے بھی پرانی جان پہچان ہے اور تاج احمد بھی میرا پرانا دوست ہے۔ چپ رہوں تو ایک کی بچت ہوتی ہے اور دوسرا خاندان..... خیر چھوڑیں بہتری کی دعا کرتے ہیں۔“ مظہر نے جان بوجھ کر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

الیاس کے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا اور وہ اب جاننا چاہتا تھا کہ تاج احمد کے خاندان میں ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس سے اس گھرانے میں رشتہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

”اب آپ کو کھل کر بات کرنا ہی پڑے گی۔ مجھے بتائیں اصل حقیقت کیا ہے۔“

”میں تو بیچ میں پھنس گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ دوستی کا ساتھ دوں، یا آپ کا بھل کو کوئی بات نکل گئی تو میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گا۔“ مظہر نے اپنے آپ کو تحفظ دینا چاہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔“ الیاس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”بات یہ ہے کہ تاج احمد کی بہن کا رشتہ کہیں ہوتا نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے، جہاں اس کی بہن کا رشتہ طے ہو جاتا ہے ایک دو واہ کے بعد وہ گھرانا مختلف مسائل میں گھر جاتا ہے اور لڑکی کو جواب دے دیا جاتا ہے، ایسا تین بار ہو چکا ہے۔“ مظہر نے جھوٹ کا سیدھا الیاس کے کان میں انڈیلا۔

اس نے حیرت سے مظہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ پہلے بھی تین جگہ سے اسے جواب مل چکا ہے؟“

”جی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔“ مظہر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اسے تین جگہ سے جواب مل چکا ہے۔“

”یہ بات تو تاج احمد نے ہمیں بتائی نہیں تھی۔“ الیاس نے نشوونما بھری آواز میں کہا۔

”تاج احمد اگر یہ بات بتاتے تو کیا اس کی بہن کا رشتہ کہیں ہوگا؟ اس لیے وہ چپ ہے۔“ مظہر نے کہا۔

”شادی کے لیے تو ہم کو بھی زور دے رہا ہے۔“

”اسی لیے زور دے رہا ہے تاکہ کچھ ہونے سے پہلے اس کی شادی ہو جائے۔“ مظہر بولا۔

”میں اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔“ الیاس گردن ہلاتے ہوئے پر تشویش لہجے میں بولا۔

”دیکھیں الیاس صاحب! اب میرا نام کہیں نہ آئے۔ دراصل بیچ میں اپنے اندر دبا نہیں سکتا۔ یہ تو آپ مجھے اچانک مل گئے اور بات تاج احمد تک چلی گئی اور مجھے بتانا پڑا۔ اگر آپ نہ ملتے اور میری آپ سے جان پہچان نہ ہوتی تو میں ایسی بات تھوڑی کرتا۔“

”آپ کی مہربانی ہے آپ نے مجھے یہ اہم بات بتائی۔ آپ بے فکر رہیں آپ کا نام نہیں آئے گا۔“ الیاس نے کہا۔

”آپ کبھی یہ بھی ظاہر نہیں کریں گے کہ میری آپ کی پرانی جان پہچان ہے۔“ مظہر نے تاکید کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا نا آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، سمجھ لیں کہ آپ نے مجھ سے کوئی

بات کی ہی نہیں ہے۔“ الیاس نے اطمینان دلا یا اور ساری بات لڑکے کے والدین سے کر دی۔ وہ سب سن کر تشویش میں مبتلا ہو گئے اور سوچنے لگے کہ وہ اب کیا کریں؟

تاج احمد چاہتا تھا کہ بہن کی شادی جلدی ہو جائے اور اس سلسلے میں جب اس نے دوبارہ رابطہ کیا تو لڑکے کے باپ نے رشتے سے انکار کر دیا۔ یہ سن کر تاج احمد کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”کیا یہ کہہ رہے ہیں آپ؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا جو آپ نے رشتہ ہی ختم کر دیا ہے؟“ تاج احمد نے مختصر ہو کر پوچھا۔

لڑکے کا باپ صاف گواہ تھا۔ اسے بات گھما کر کرنے کی عادت نہیں تھی لہذا اس نے تمام صورت حال بیچ بیچ بیان کر دی اور بات عمل کرنے کے بعد کہا۔ ”آپ نے ہم سے جھوٹ بولا ہے اور حقیقت کو چھپایا ہے۔ اس لیے ہم رشتے داری نہیں کر سکتے۔“

ایسی کوئی حقیقت نہیں تھی اس لیے سب کچھ سننے کے بعد تاج احمد دم بخور ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا جھوٹ اور بہتان کس نے باندھا ہوگا۔ تاج احمد نے کوشش کی کہ وہ اس جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر سکے لیکن لڑکے کا باپ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا اور اب اس کی کوشش تھی کہ تاج احمد اٹھ کر چلا جائے۔

جب تاج احمد نے بار بار بیچ کینے کی کوشش کی اور لڑکے کے باپ نے اس کی بات کو شروع ہونے سے قبل ہی ٹوکن شروع کر دیا تو تاج احمد کو بھی غصہ آ گیا اور وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”آپ کا داماد بہت بڑا جھوٹا ہے جس نے جان بوجھ کر ایسا جھوٹ بولا ہے، یقیناً وہ اس رشتے پر خوش نہیں ہے۔“

”آپ ہمارے داماد کو جھوٹا مت کہیں، اس نے بیچ بات کی ہے۔“ لڑکے کے باپ نے جلدی سے کہا۔

”یہ بیچ نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور اپنے داماد صاحب کو بلا کر پوچھیں کہ ان کے دل میں ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اس رشتے کو ختم کرانے کے لیے ایسی بکواس کی ہے۔“

”آپ زبان سنبھال کر بات کریں۔“ لڑکے کے باپ کو بھی غصہ آ گیا۔

”میرے سامنے آپ کا داماد اس بات کا ثبوت لائے کہ ہم نے اپنی بہن کی منگیترا پہلے بھی کہیں کی تھی، اگر وہ

## وا دیوں کا سنگم۔ گلگت

پاکستان کے شمالی علاقہ جات کا جب ذکر ہوگا تو سب سے پہلے گلگت کا نام لب پر آئے گا۔ گلگت ایسا مرکزی مقام ہے جہاں سے نہ صرف کشمیر، اسکردو، شیندر، چترال اور ہنزہ کے لیے راستے نکلتے ہیں بلکہ چین جانے کے لیے بھی یہاں قیام کرنا ضروری ہے۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو اور دیوسائی کے پھولوں بھرے دلدلی میدان کو عبور کرنے والے سیاح بھی گلگت سے ہی تازہ دم ہو کر چلتے ہیں۔ دنیا کی حسین ترین چوٹی را کا پوٹی جسے سلیپنگ بیوٹی (Sleeping Beauty) بھی کہا جاتا ہے اور وادی نگر میں واقع ہونے کے باوجود ہنزہ کا حصہ تصور ہوتی ہے، اس کا نظارہ کرنے کے لیے بھی گلگت پہنچنا لازمی ہے۔ بعض من چلے..... نانگا پربت جانے کے لیے بھی پہلے گلگت آتے ہیں اور وہاں سے تازہ معلومات لے کر رخت سبز باندھتے ہیں۔ واہ..... واہ! کیا کہنے قدرت کے ان حسین نظاروں کے..... اب حکومت کا فرض ہے کہ یہاں پر زیادہ سے زیادہ سہولتیں سیاحوں کو مہیا کریں تاکہ ایک قابل قدر آمدنی اور زربادہ حاصل ہو سکے۔

ڈاکٹر منیر مرزا کے سفر نامے پر بتوں کا شہینہ در سے اقتباس  
مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

ایسا نہ کر سکتے تو اسے اپنے گھر سے دور کر دیں ورنہ وہ آپ کو اور بھی نقصان پہنچائے گا۔“ تاج احمد نے غصے میں یہ بات کہہ دی اور وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد لڑکے کے باپ نے الیاس کو فون کیا اور وہ سب بتا دیا جو تاج احمد نے اس کے بارے میں کہا تھا، حالانکہ اسے چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یہ باتیں الیاس تک نہ پہنچاتا۔ الیاس نے سنا تو وہ ایک دم سچ پا ہو گیا اور بولا۔

”اسے ثبوت چاہیے تو میں اسے ابھی ثبوت دیتا



ہوں۔“

ایلیاس نے..... غصے اور جذبات میں آکر... تاج احمد کو فون کیا اور بتا دیا کہ اس کو یہ باتیں کس نے بتائی تھیں۔

تاج احمد سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ باتیں اس کا دوست مظہر کر سکتا ہے۔ وہ اسی وقت مظہر کے پاس پہنچ گیا، اس کے ساتھ فرزانہ بھی تھی۔

تاج احمد اور فرزانہ کو دیکھ کر مظہر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج تو آپ دونوں نے میرے اس غریب خانے میں آکر کھٹکھٹاں بکیر دی ہے۔“

”سنا تھا جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی دوسروں کو دیتا ہے، ہمارے پاس کھٹکھٹاں ہے اور ہم نے تمہیں وہ دے دی، تمہارے پاس جھوٹ اور کانٹے ہیں تم وہی کچھ بانٹ رہے ہو۔“ تاج احمد نے اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مظہر نے دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ میری بہن کا کیا قصور تھا کہ تم نے جھوٹ بول کر میری بہن کا رشتہ ختم کر دیا؟“ تاج احمد کی آواز اونچی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں غصہ لاوا بن کر دوڑ رہا تھا۔

مظہر فوراً سمجھ گیا کہ ان کو حقیقت کا پتا چل گیا ہے۔ حالانکہ اس نے اسے پابند بھی کیا تھا کہ وہ اس کا نام نہیں لے گا۔

”میں تمہاری بہن کا رشتہ کیوں ختم کراؤں گا؟ تم کو شاید کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ مظہر نے فوراً اقرار کرنے کے بجائے اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

تاج احمد نے وہ ساری باتیں مظہر کو بتا دیں جو لڑکے کے باپ نے بتائی تھیں اور پھر ایلیاس کا بھی تذکرہ ہو گیا۔ اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ مظہر نے سوچا کہ وہ بجائے اس بات کو انکار کی دلدل میں دھکیل کر فنی میں ہی سر ہلاتا رہے، بہتر ہے کہ بتادے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

”میں مانتا ہوں کہ مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں مجبور تھا۔“ مظہر بولا۔

”تمہیں ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم نے میری بہن کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا۔“ تاج احمد کا غصہ ابھی تک اسی

طرح قائم تھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہاری بہن کو پسند کرتا ہوں۔“ مظہر نے کچھ توقف کے بعد کہہ دیا۔

یہ سنتے ہی تاج احمد نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور چیخا۔ ”تیس یہ بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ تم نے اپنی اور میری بہن کی عمر دیکھی ہے۔ تم نے یہ دیکھا کہ تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے اور میری بہن تمہیں چاہتی ہے۔“

”وہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن میں تمہاری بہن کو پسند کرتا ہوں۔“ مظہر نے کہا۔

”میں تمہیں جان سے مار دوں گا تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔“ تاج احمد کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت مظہر کے گلے پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مظہر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔ فرزانہ بھی آگے بڑھی اور کوشش کرنے لگی کہ وہ تاج احمد کی گرفت سے مظہر کو چھڑا سکے لیکن جنون اور غصہ ایسی طاقت بن چکا تھا کہ تاج احمد کی گرفت ڈھیلی نہیں ہو رہی تھی۔

مظہر کی آنکھیں اٹل رہی تھیں اس نے پوری قوت ایک جگہ جمع کی اور ایک جھٹکے سے تاج احمد کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ تاج احمد ایک طرف گر گیا اور مظہر اپنی سانسیں ٹھیک کرنے لگا۔

جو فنی مظہر کی سانسیں ٹھیک ہوئیں اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ”کسی سے بھی محبت ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ محبت عمروں کا فرق نہیں دیکھتی، محبت بس ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی تمہاری بہن سے محبت ہو گئی ہے۔ میں اسے اپنا نا چاہتا ہوں۔“

”اپنی بواں بند کرو۔“ تاج احمد ایک بار پھر چیخا۔ ”بہتر ہے کہ تم اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دو ورنہ.....“ مظہر نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”ورنہ تم کیا کر دو گے؟“ تاج احمد نے اسے گھورا۔ ”ورنہ میں اس کی شادی نہیں نہیں ہونے دوں گا۔“ مظہر نے مسخ لہجے میں کہا۔

”یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم کہہ رہے ہو جو میرا دوست ہے؟ تمہارے دل میں کتنا سیاہ کھوٹ ہے۔“ تاج احمد غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

”میں نے اپنے دل کی بات کی ہے، یہ کھوٹ نہیں

ہے۔“ مظہر نے کہا۔

تاج احمد کرب بھری آواز اور غصے کے لاوے میں بہہ کر بولا۔ ”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے، تم نے میری بہن کا گھر بسنے سے پہلے اجاڑا ہے۔ تم گندی سوچ کے مالک ہو، تم نے مجھے شدید تکلیف دی ہے، میری بددعا ہے کہ تم اس شہر کی گلیوں میں بھکاری بن کر لوگوں سے بھیک مانگتے پھر دو۔ تمہارا کبھی گھر آباد نہ ہو.....“ یہ کہتے ہوئے تاج احمد کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

فرزانہ آگے بڑھی۔ ”آپ چلیں میرے ساتھ..... اب آپ کچھ نہیں بولیں گے۔“

تاج احمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھاتی ہوئی جب فرزانہ دروازے کی طرف بڑھی تو عقب سے مظہر نے کہا۔ ”اگر تمہاری یہ بددعا پوری ہو جائے تو میری بھی... بددعا ہے کہ تم مجھے اس حال میں دیکھنے تک زندہ رہو اور جب مجھے دیکھ لو تو پھر میرے سامنے تمہیں موت آئے، میرے بیروں میں.....“

تاج احمد پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فرزانہ نے اسے بولنے نہیں دیا اور وہ اسے زبردستی باہر لے گئی۔

اس کے بعد تاج احمد اور مظہر کے درمیان دو تہی ختم ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چند ماہ کے بعد تاج احمد نے چپکے سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔

چند ماہ اور گزرے تو مظہر کو مسلسل نقصان ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سب کچھ ختم ہوتا گیا۔ تاج احمد کا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا، اس لیے وہ اس کے حالات سے بے خبر تھا۔

تاج احمد اپنے کاروبار اور اپنی دنیا میں اتنا مصروف ہو گیا کہ وہ مظہر کو بالکل بھول ہی گیا کہ وہ بھی کبھی اس کا دوست تھا۔

تاج احمد دن بدن دولت کمارہا تھا۔ آسودگی اس کی ولیر کی لونڈی بن گئی تھی۔ اس کے پیچھے بھی جوان ہو گئے تھے اور وہ بھی کاروبار میں شامل ہو گئے تھے۔ تاج احمد اپنی دنیا میں مگن سب کچھ بھول چکا تھا کہ اچانک اس کا گھر اپنے پر پندرہ سال بعد مظہر سے ملاقات ہوئی وہ بھی اس حالت میں کہ تاج احمد اپنی دی ہوئی بددعا کی قبولیت

کچھ رہا تھا۔ وہی الفاظ حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑے

تاج احمد کو اس حال میں دیکھ کر اس کے سامنے کھڑے

تاج احمد کو اس حال میں دیکھ کر اس کے سامنے کھڑے

استاد۔ ”بتاؤ تھکے کی جمع کیا ہے؟“

شاگرد جلدی سے کھڑا ہو کر۔

”مجاڑو۔“

☆☆☆

تھے جو اس نے مظہر سے کہے تھے۔

مظہر نے بھی تاج احمد کو پہچان لیا تھا اور اسے ایک دم سے مظہر کے وہ سارے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ اس نے مسکرا کر تاج کو بتا دیا تھا کہ وہ ان ہی سڑکوں پر ہوتا ہے، ان ہی سڑکوں پر وہ بھیک مانگتا ہے اور اس کی بددعا پوری ہو چکی ہے۔

مظہر کو اس حال میں دیکھ کر تاج احمد کے دل پر جو گزری وہ تو گزری ہی تھی اسے مظہر کے بھی الفاظ یاد آ گئے تھے، جب اس نے کہا تھا کہ وہ اسے اس حال میں دیکھنے تک زندہ رہے اور پھر وہ اس کے سامنے موت کو گلے سے لگائے۔

تاج احمد کو جہاں اپنی دی ہوئی بددعا کے پورے ہونے کا دکھ تھا جو اس نے غصے میں دی تھی..... اسے اب یہ غم بھی کھانے لگا تھا کہ وہ اسی لیے زندہ تھا کہ وہ مظہر کو اس

حالت میں دیکھے اور پھر مرے..... اپنی موت کے بارے میں سوچ کر اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔ اسے یہ خیال پریشان کرنے لگا تھا کہ اب مظہر کی بددعا پوری ہونے کا وقت ہے۔

☆☆☆

فرزانہ اور تاج احمد ایک دوسرے کے سامنے براہِ جان ماضی کے ایک ایک صحنے کو اپنی نگاہوں کے سامنے

دیکھ رہے تھے۔ فرزانہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ اب تاج احمد کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ دونوں نے ایک دوسرے کو بددعا دی تھی۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ فرزانہ نے مرجھائے لہجے میں پوچھا۔

”اب یہی ارادہ ہے کہ مظہر کو مٹا کر اس گھر میں لے آؤں تاکہ اس سے معافی مانگ سکوں، اسے پھر سے کاروبار کی دنیا میں کھڑا کروں اور وہ راضی ہو جائے، مجھے معاف کر دے تاکہ اس کی بددعا پوری نہ ہو۔“

”آپ نے بات کی تھی اس سے؟“

”میں نے اسے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے



گھر چلے، لیکن وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“  
 ”آپ مجھے اس کے پاس لے کر چلیں، میں اس کی منت کرتی ہوں۔ جو اس کا کھو چکا ہے وہ ہم دے دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے لے۔“  
 ”ہاں..... یہ ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔“ تاج احمد اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

تاج احمد اور فرزانہ اسی وقت مظہر کے پاس چلے گئے۔ وہ ایک طرف لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ فرزانہ نے پاس جا کر سلام کیا لیکن مظہر نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کے سامنے ساکت کھڑا رہا، جیسے وہ پتھر کی مورتی ہو۔  
 فرزانہ نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے اور بولی۔ ”بھائی صاحب! ماضی کو بھول جائیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔ جو کہا سنا تھا وہ ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔“

”اب معافی کا وقت گزر چکا ہے۔ ایک کی بددعا پوری ہو چکی ہے اور مجھے اپنی بددعا کے پورا ہونے کا انتظار نہیں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے تقدیر ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لے آئی ہے۔“ مظہر نے متانت سے کہا۔

”ہم آپ کا سارا نقصان پورا کر دیتے ہیں۔“ فرزانہ بولی۔  
 مظہر تمسخرانہ سی ہنسی ہنسا۔ ”مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔“

”میرا ایک گارمنٹس کا یونٹ ہے، تم وہ لے لو، وہاں اپنا کاروبار کرو۔ میں تم کو پیسا بھی دوں گا۔ بس اپنے الفاظ واپس لے لو۔“ تاج احمد نے کرب ناک لہجے میں کہا۔  
 مظہر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اتنا ڈر گئے ہو؟ دیکھو تمہاری بددعا کی تصویر تمہارے سامنے کھڑی ہے اور تم اپنے اوپر وہ حالات آنے سے پہلے ہی ڈر گئے ہو، جو ابھی آئے نہیں ہیں۔ تم دونوں چلے جاؤ۔“

فرزانہ آگے بڑھی۔ ”مظہر بھائی..... آپ وہ یونٹ اور بہت سا پیسا لے لیں..... ہم آپ کو رہنے کے لیے ایک اچھا گھر اور گاڑی بھی دیں گے۔ ہم آپ کو اس معاشرے میں پھر سے باعزت کر دیں گے۔“  
 ”مگر اب مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ مظہر نے یہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

”بھائی صاحب آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”تب آپ نے اسے کیوں نہیں سمجھایا تھا جب یہ ضد میں آ کر بہت کچھ بول گیا تھا؟ میں نے اس کی بہن کو پسند ہی تو کیا تھا اور یہ کوئی ایسا جرم بھی تو نہیں تھا کہ یہ مجھے ایسے الفاظ سے نواز دیتا جس کا ہار میں اپنے گلے میں ڈالے آج ان سڑکوں پر بھکاری بنا ہوا ہوں۔ آج آگ اس کی طرف آرہی ہے تو آپ دونوں کی جان پر بن گئی ہے۔“

”وہ جو کچھ بھی ہوا تھا غصے میں ہوا تھا۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں اور کہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔“ تاج احمد رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھ پر اس ذرا سی محبت کی سزا میں جو کچھ گزرنا تھا گزر چکا..... اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اب اس وقت کا انتظار کرو تاج احمد..... میری بددعا میں اثر ہوا تو تم کو میرے سامنے موت آجائے گی اور اگر میرے وہ الفاظ کھوکھلے ثابت ہوئے تو کہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مظہر نے یہ کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”آپ معاف کر دیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فرزانہ نے ایک بار پھر استدعا کی۔  
 ”ان سڑکوں پر میں نے بھیک مانگی ہے۔ اس کی بددعا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں اب معاف کر دوں؟“ مظہر کے لہجے میں تلخی تھی۔

”اس معافی کے بدلے میں ہم آپ کو بہت کچھ دے رہے ہیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”مجھے وہ سب نہیں چاہیے جس کی مجھے ضرورت نہ کبھی تھی۔ نہ کبھی ہوگی۔ مجھے اب..... اس شخص کی موت چاہیے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی موت ہو اور میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مظہر کا لہجہ درشت ہو گیا اور فرزانہ خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ تاج احمد کا جسم کانپ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو، وہ ابھی گر جائے گا۔ اسے اپنے جسم میں طاقت ختم ہوتی محسوس ہونے لگی۔

مظہر اپنی بات پر قائم تھا۔ دونوں کی منت سماجت اور پیشکش بھی مظہر کا ارادہ نہ بدل سکی۔ دونوں مایوس اور مرجھائے قدموں کے ساتھ اپنی قیمتی گاڑی کی طرف



دوئوں گاڑی میں بیٹھ گئے لیکن تاج احمد بھول گیا تھا کہ گاڑی کو اسٹارٹ بھی کرنا ہے۔ وہ اپنے خیالوں اور پریشانی میں گاڑی کا کینٹر لگا کر اسے چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ فرزانہ نے دیکھا تو اسے بتایا، تب تاج احمد نے کار اسٹارٹ کی۔

دوئوں میاں بیوی بہت پریشان تھے۔ دوئوں کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چمکن اڑ گیا تھا۔ ان کے اداس چہروں کو دیکھ کر ان کے بچے بھی سوال کرنے لگے تھے لیکن دوئوں کسی کو کوئی جواب نہیں دے سکے اور اب گھر کے افراد میں ابہام جنم لینے لگا تھا۔ تب میاں بیوی نے مشورہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو بھی اس بات میں شامل کر لیں، ہو سکتا ہے کوئی نکل آئے۔

”ڈیڈ..... اس نے کہا تھا کہ آپ کی موت اس کے سامنے ہو۔“ عدیل بولا۔

”ہم اس کے سامنے جائیں ہی نہ..... بھول جائیں کہ کوئی مظہر بھی ہے۔ اس کا سامنا ہی نہ

فرزانہ بولی۔ ”عدیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے آپ کے سامنے ایسی بددعا کی تھی۔ اب ہم اس کے پاس نہیں جائیں گے۔“

”آپ اسلام آباد والے آفس میں چلے جائیں۔ وہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔ آپ وہاں رہیں، اسلام آباد والے آفس کو ناصر دیکھتا ہے، اسے ہم واپس بلا لیتے ہیں۔“

پہلی بار فرزانہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ”یہ تجویز بھی اچھی ہے۔ اس طرح ہم اس سے بالکل دور ہو جائیں گے۔“

تاج احمد نے اسلام آباد جاتے ہی اپنا آفس سنبھال لیا، وہاں ان کے بہت سے عزیز رشتے دار اور دوست بچے تھے، اس لیے انہیں کسی طرح کی بوریت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے اور دونوں میاں بیوی اس بات کو بھولنے لگے تھے۔ ان کی زندگی پھر سے معمول پر آنے لگی تھی۔ وہی دوستوں کی تھنٹھیں اور پارٹیاں رنگ مٹانے لگی تھیں اور ان کے تہمتوں اور بے فکرگی کی باتوں میں منظر کہیں دفن ہو گیا تھا۔

دو ماہ بیت گئے تھے۔  
شہر میں بھکاریوں کو پکڑنے کی مہم شروع ہوئی تو کئی  
کامیابی دیکھیں یا نہیں ہو گئے۔ جو بھکاری بھی کہیں دھمکی  
جاتا اسے پکڑ کر وہ گاڑی میں ڈالتے اور اپنے ساتھ لے  
جاتے تھے۔

مظہر پر بھی نظر پڑی تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے  
 لگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ریلوے اسٹیشن میں چلا  
 گیا۔ وہاں ایک ٹرین کھڑی تھی وہ اس کے ایک ڈے میں

اس کی آنکھ اس وقت ملی جب کسی نے اسے غمگین مار کر چمپایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ وہاں بائیں رخسار پر اور مسافر ٹرین میں سوار ہو رہے ہیں۔ مظہر اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف جانے لگا تو مسافر تیزی سے سوار ہو رہے تھے اور اس رخسار میں اس کے لیے دروازے تک جانا مشکل ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ واپس جائے گا تو پھر ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ جھگڑے کو جب بھی یاد آتا تو وہ بھکاریوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اس کے بعد پھر امن اور سکون ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹرین میں بھیک مانگتے ہوئے کسی دوسرے شہر ہی چلا جائے گا۔ چند دن کے بعد پھر واپس آجائے گا۔

ٹرین کا سفر جاری رہا اور وہ راولپنڈی پہنچ گئی۔ مظہر ریلوے اسٹیشن پر اترتا تو اسے پتا چلا وہ اپنے شہر سے بہت دور آگیا ہے۔

وہ ایک جگہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور ایک ویکن کی طرف چلا گیا۔

”تجھے کہاں جانا ہے؟“ ڈرائیور نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اسلام آباد جانا ہے۔“  
”یہ ویسٹن اسی جگہ جا رہی ہے لیکن کرایہ لگے گا۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”جتنا چاہو کرایہ لے لیتا۔“ مظہر نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالے جس میں ہزار، پانچ سو

”یہ کام چھوڑو اور میرے ساتھ چلو..... تمہارے پاس بھی پیسا آجائے گا۔“ مظہر نے اسی وقت اسے پیشکش کر دی۔

”حق حلال کی کما کر کھاتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ پیچھے۔“ ڈرائیور نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ مظہر پیچھے بیٹھ گیا۔

وینن نے اسے اسلام آباد میں اتار دیا۔ جب اس نے اس شہر میں قدم رکھا اور وہ ایک مصروف سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا تو اسے لگا جیسے اس کی گاڑی اس شہر میں داخل ہوئی ہے اور وہ میوزک سنتا ہوا ہوش کی طرف جارہا ہے۔ اس نے بہترین لباس زیب تن کیا ہوا ہے، اس کی آنکھوں پر قیمتی چشمہ ہے، چہرے پر مسکراہٹ ہے، کوٹ کی اندرونی جیب میں اس کا پرس نوٹوں اور مختلف کارڈز سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی فکر نہیں ہے۔

منظہر کو ماضی کی اس یاد نے تڑپا دیا اور وہ رو دیا۔ اس کا دل کرب سے تڑپنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالے۔ اسے لگا ماضی کی یاد اس کا دل ریزہ ریزہ کر دے گی۔ دل زور زور سے

دھڑکنے لگا تھا۔ اسی اثنا میں تاج احمد زہرا کرا سنگ پر سے گزرتے ہوئے سڑک عبور کر رہا تھا۔ لال بتی روشن تھی اور ایک سائڈ کی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ اچانک ایک تیز رفتار بے قابو فریڈ ٹریفک کے رش میں سے نکلی اور... مختلف گاڑیوں سے ٹکراتی ہوئی، تاج احمد سے ایسے ٹکراتی کہ وہ فضا میں بلند ہوا اور پھر تیزی سے اڑتا ہوا نیچے آیا اور مظہر کے قدموں میں آن گرا۔

دوئوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تاج احمد کی آنکھیں بند ہوئے لگی تھیں اور منظر اس منظر کو کچھ کر بری طرح کانپ گیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ کاش وہ اسے معاف کر دیتا اور اپنے کہے الفاظ کی خدا سے معافی مانگ لیتا۔ منظر کا جسم بری طرح سے کانپنے لگا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور پھر منظر بھی اس جگہ گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بہت سے لوگ دوئوں کے بے جان جسموں کے ارد گرد کھڑے تھے۔ سچ بے قبولیت کی گھڑی کب آجائے کسی کو کچھ خبر نہیں.....





قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور

نہ سی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل کر

سائے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں

کسی کی بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین

کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن

اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور

موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان

اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی

سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی

محبت بن کر پونٹوں پر پشیمی بکھیرتا ہے اور

کبھی دردی کی صورت آنسو بن کر دلوں میں

گھانٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام

نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں

کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا

نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند

پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر

اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں

سے بھی دم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی

طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی

مہربان ہے۔ کاسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے

واستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات

میں چاہے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین

امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو ہر سونے یاد رہے گا۔

موت کے کنوئیں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

سنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در با طویل داستان

PakiBooks.Site





اس کا نام اسد علی رکھا گیا ہے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی عہدداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وکیل جیٹیک محدود کردیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میڈالین سے علی کے بچے کی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت ریٹا اپنی اکوٹی بیٹی جینی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اولاد کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک کل وقتی ملاز مدہ بھی ہوئی تھی اور پھر جس سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد دیا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیکوں سوار اس کے ساتھ ہی مل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے چچن و مرنی اکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ علی کی کجس کو ہوا دی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہا تھا مگر اس اضطراری کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے "سکرل اے" میں "سکرل اے" نامی ایک اسٹور پر جڑ لگ گئے۔ ایک روز دو ملکیوں لڑکے ڈسٹریکٹ کی نیٹ سے "سکرل اے" میں آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈسٹریکٹ علی کے ساتھ موجود سٹریٹس میں ٹھاکر کو کھٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں ملکیوں نے ڈسٹریکٹ کوئی گس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ایک ریٹائرمنٹ میں اس کا آنا جانا لگ رہا تھا۔ "ڈوئی لاؤنچ" نامی ایک ریٹائرمنٹ میں ہسپانوی ڈشیز و شادو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دلکش مدہجیں نے علی کے دہل پر دست دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ڈوئی لاؤنچ میں جب لیونا ڈوئی نامی ایک ملکیوں خنڈے اور اسی کے حواریوں نے شادو سے بدھیزی کی کوشش کی تو علی جج میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر وکیل اسٹیشن لیری ڈیٹھیا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈوئی ٹینگ کا ڈوئی کو کھڑا کر رکھتے ہوئے۔ اس واقعے کے بعد لیونا ڈوئی نے علی کی دھمی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونا ڈوئی کے خنڈوں میں گپے گپے مڈھ میچر ہوئی رہی۔ لیونا ڈوئی نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ ڈوئی لاؤنچ والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادو کی ریٹائرمنٹ والی جاب چھوڑ دیا اور اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شادو اپنے اسٹور سے گھر دہری خریدنے کی تو لیونا ڈوئی نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں بہت نہ ہاری اور شادو کو ڈھونڈنا رہا ہالہ خرابیاں رات لیونا ڈوئی کا ایک طرف ہی سامھی چلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر چلو، شادو اور لیونا ڈوئی کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے پولیس کے عالم میں مار مار کر چلو کو ادھ ہوا کر دیا۔ آئندہ روز چلو کے قتل کی خبر تک۔ جیسکس اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ ایک جیسکس کی تلاش میں تھی۔ ایک جیسکس میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے انکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک جیسکس سے یوسٹن بھیج گیا۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹھیا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹھیا نے علی کی تمنا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر ٹھیکے باہر کی دینا سے کٹ کر اس کے ساتھ ٹھیکے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر ٹھیکوں میں ہر مل علی پر چڑھتوں کا ایک نیا دروازہ ہوتا رہا۔ ڈیٹھیا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیدی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو چلو مورڈریس سے اس طرح نکال لیا جیسے ٹھیکے سے ہال۔ علاوہ ازیں ڈیٹھیا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونا ڈوئی شادو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹھیا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر ٹھیکے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو صح سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹھیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریشکھ ہالو والے اس ٹھیکے میں ڈیٹھیا کی سنگت میں گزارنے والے وہ ظلم ہوش رہا بہتر ٹھیکے بڑے رنگین، رنگین، رومان پرور اور ناقابل یقین تھے۔ ڈیٹھیا کی شخصیت کسی معنی سے کم نہ تھی۔ اس پرستار، ڈیٹھیا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات رہی آ نرک باروٹ لاؤ اور ایما ایمل باس نے علی کی ملاقات بھی کرادی۔ جب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور موسما تھی "اسکل اینڈ یوز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے نہیں روک پھرتے تھے۔ ڈیٹھیا کی تمنا بھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے "اسکل اینڈ یوز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیٹھیا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹھیا سے بے بسی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی صورت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سرپرست راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارڈین کی

اسے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تراخا جات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر لیں جس کو کچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت کا گیارہ ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی غوثی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو اپنے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی اہم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی کے ٹھکے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا لے جانے کے لیے دھڑ دھڑا کر کھولنے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی کو چھپ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کر دیا کہ پچھانے گا۔ علی نے تمام حقیقت جینا کو بھی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور مرزا بن گئی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے بچے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ لیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے بچا گھوٹا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کر لیا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان اس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر ہنگامہ چھوڑ دیا اور جینا کے قتل پر آ گیا۔ علی نے ٹھکے پر جیٹیک کو چھوڑا تھا اور غاس نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن سفیر ڈی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے در پردہ ڈیٹھیا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قاپو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پولیس کو بھیجے کہ دیا تھا جو بڑی شدت سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قاپو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے ٹھکے کو کنڈر آتش کر دیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کر لیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچایا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ اس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے جاپس دن گزارنے ہیں۔ علی وہاں تھا تھا کہ اچانک اسے کچھ جانوروں کی فراہمی کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اسنے کی تلاش میں اسٹور روم کی طرف بڑھ گیا۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ کرب میں ڈوبی ہوئی ماتھی، دردناک آواز برقانی آواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے مسلسل میری سماعت پر داشت ناک دسک دے رہی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ایک سے زیادہ جانوروں کی اجتماعی آواز ہے جیسے ہالوروں کا کوئی جھٹا جماعت کورس کے انداز میں حزنہ گیت گا رہا ہو۔ بھڑپے عموماً اس نوعیت کی آوازیں کسی آواز کے جواب میں رد عمل کے طور پر نکلا کرتے ہیں جیسے لڑین دمل، فائر ریگیٹ اور پولیس کار یا ایبونیس کار کے سائرن کے جواب میں لیکن میں جانتا تھا کہ بحر خمد جنوبی لینن قطب جنوبی پر بھڑپوں کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ اس صورت حال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ نسل کر میرے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں مجھے گراں قدر معلومات حاصل ہوئی تھیں اسی لیے میرے ذہن نے بے اختیار اسکوا، وانڈرنگ، الپٹ راس، اورکا (کلروٹیل) ساکن شارک، ایلینٹیل سیل اور ڈسکی ڈلفن جیسے خطرناک قلمی جانوروں کے نام دہرائے تھے لیکن یہی بات تو یہ ہے کہ میں فی الحال ان جانوروں کے نام ہی سے واقف تھا، ان میں سے کسی کی آواز سے ہرگز آشنا نہیں تھا لہذا میں نہیں

جانتا تھا کہ یہ "آووو..... ہووو..... ہووو....." کس جانور یا جانوروں کے حلق سے خارج ہو رہی تھی۔ اسٹور روم کا میں پہلے میں معائنہ کر چکا تھا۔ سردست میری تلاش کا مرکز آتشیں اسلحہ تھا۔ انسان کی تلاش اور جستجو کا تعلق اس کی ضرورت سے ہوتا ہے اور میری فوری ضرورت کوئی بھی ایسا ہتھیار تھی جسے میں اپنے تحفظ کے لیے بے دریغ استعمال کر سکتا۔ مجھے ایسا کوئی دعوی نہیں کہ میں ایک تجربہ کار شوٹر ہوں لیکن میں بہر حال، وقت پڑنے پر مختلف قسم کے ہتھیار چلانا جانتا تھا اور قطب جنوبی کے اس ٹھنڈے شمار جزیرہ راس میں مجھ پر بڑا اثر اوقات آن پڑا تھا۔ اسٹور روم کے ایک حصے میں ہینگ رانگلز کا چمچا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ ہینگ رانگلز (شکاری رانگلیں) دنیا کے معروف اور مانے ہوئے برانڈ تھے۔ روگر، براؤننگ، مونٹانا، نوزلر، ریمکسٹن، ویڈرلی اور موس برگ کے علاوہ ہینگ کولٹ اینا کوئڈار یو اور بھی وہاں رکھا تھا۔ ان گنوں کے رائیڈنگ کا بھی وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ میں نے اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک نوزلر M48 رانگلز اور ہینگم 44 یو اور کا انتخاب



اس نے اپنی آنکھوں پر سے گھڑبھٹا کر بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھا اور کچھ کچے بغیر ہٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ میں اسے اپنی راہنمائی میں بیڈروم تک لایا اور کہا۔ ”تم اپنا گیلیا لباس تبدیل کر لو۔ جب تک میں تمہارے جمد ہوتے بدن کو توانائی بہم پہنچانے کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“

پھر اس کا جواب سے بغیر میں بیڈروم سے نکل آیا۔ میں نے اس عورت کو اپنی آنکھوں سے کسی مصیبت میں گرفتار دیکھا نہیں تھا لیکن میری ساعت نے اس کی فریادی چیخیں اور کسی وحشی درندے کی ”اوغو..... اوغو“ ضرور سنی تھی اور میرے حساب سے اس کے تعاقب میں ایک سے زیادہ خون آشام پولر جانور تھے۔ اگر وہ انہیں غماز دے کر اس ہٹ تک چلی آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ ایک بہادر، نڈر، خوش قسمت اور بہت والی خاتون تھی۔

میں نے جین میں آکر کیروسین آئل والا اسٹود جلا یا اور کافی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس جین میں دیگر خوردو نوش کے علاوہ چائے کافی کا تمام سامان بھی موجود تھا۔ اس دوران میں، میں نے ہینٹنگ رائفل نوزلبرنی کو واپس اس کی جگہ یعنی اسٹوروم میں پہنچایا تھا تاہم نوزلبرنی فور مینٹنم کولٹ اینا کوئڈار یوالور میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ مذکورہ ریوالور ایک اعشاریہ تین کلوگرام وزنی، چار انچ لمبے بیرل والا ریوالور تھا۔ یہ ایک نہایت ہی موثر، پارعب اور دھانسی قسم کی وینڈر گن ہے جسے ذیل ایکشن گن بھی کہا جاتا ہے۔

میں ایک ٹرے میں کافی کے دو گ اور کوکیز لے کر بیڈروم میں پہنچا تو اس ماضی قریب کی مصیبت زدہ کو حال میں خاصا ریلیکس پایا۔ وہ اس بیڈروم کے اگوتے بیڈ پر بیٹھی اسوکنگ اینڈ ڈرننگ میں مشغول تھی۔ میری عدم موجودگی میں اس نے نہ صرف اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا بلکہ مشروب لے کر پلکے پلکے اس کے گھونٹ لے رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں مجھے ایک گریٹ بھی دبا ہوا نظر آیا جسے وہ آدھی سے زیادہ چھونک چکی تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”آئی ایم سوری۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے بستر پر چڑھ بیٹھی ہوں۔“

بات کے اختتام پر اس نے بستر چھوڑنے کے لیے پہلو بدلا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”اس کو اے..... اگر چڑھ ہی بیٹھی ہو تو آرام سے بیٹھی رہو۔ تمہیں اس بیڈ کی زیادہ

میں سرخ مریچوں کا چمڑ کا ڈکڑ دیتا، ایک منظر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

یہ سنسنی خیز منظر نوزلبرنی رائفل کی ٹیلی اسکوپ میں ابر تھا۔ میں حالات حاضرہ پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ہی اپنی آنکھ کو مسلسل ٹیلی اسکوپ کے آئی پین کے ساتھ لگائے دردی ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ جس سمت میں انسانی اور حیوانی آوازوں کا سلسلہ موقوف ہوا تھا، ادھر ہی میں نے کسی کو دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کوئی انسان ہی تھا۔ گویا میں سوچنے میں حق بجانب تھا کہ وہ مصیبت زدہ انسان اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں اس شخص کے استقبال کے لیے ہٹ سے باہر نکل آیا۔ نوزلبرنی کوئڈار میں جین ہی میں چھوڑ دیا تھا البتہ مینٹنم اینا کوئڈار میں نہیں بھولا تھا۔ یہ نوزلبرنی فور کولٹ ریوالور پوری طرح لوڈ تھا اور میں کسی بھی غیر یقینی ہنگامی صورت حال میں چشم زدن میں اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ میرے سامنے تھا۔ وہ سر تا پا مخصوص جہم جیوان کریم لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے مضبوط زینتی گرفت والے ہماری جوتے پہن رکھے تھے۔ ان شوز کے کپے میں ایسا میٹریل لگا یا جاتا ہے جو ہم جو کورف زار پر پھسلنے سے بچاتا ہے۔ متذکرہ بالا شخص نے اپنی کمر پر ایک بھاری سفری بیگ لاد رکھا تھا۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک پست قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں پر کنگ سائز کے گھڑتے اور اس کی جینٹ کے ہڈ نے اس کے چہرے کو اپنے گھبرے میں لے کر گرفتور یا چھپا رکھا تھا۔ ایسی ہڈی گرم جینٹ ہم جو افراد کو برقیلیہ پیمڑوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس شخص کے سینے کا زیرویم اس امر کا عکاس تھا کہ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ جب وہ بولا تو میرے بیشتر اندازوں کی تردید ہو گئی۔

وہ تھا نہیں بلکہ..... جی! اس نے ہڈی کے اندر سے اپنے چہرے کو برآمد کیا ہر متلاطم سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولی۔ ”پلیز..... مجھے اندر آنے دو۔ میں بہت بڑی مصیبت سے نکل کر یہ مشکل یہاں تک پہنچی ہوں۔“

میں نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”آ جاؤ..... مجھے تمہاری مصیبت کا کسی حد تک اندازہ ہے۔“

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ہٹ کے باہر قدم نکالنا گزیر ہو گیا تھا۔ اگر میں ہٹ کے کچن میں کھڑا صیدو صیاد کی آمد کا انتظار کرتا رہتا تو پھر اس مجبور انسان کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس بے چارے کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ابھی تک دور تین نے میری آنکھ کو کوئی ہولناک منظر نہیں دکھایا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ہٹ سے ابھی خاصے فاصلے پر تھے۔ میں نے حتی فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہٹ سے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا۔

اگلے ہی لمحے وہ آواز پس آنا بند ہو گئی۔ برقیلی لغا میں ایک یکسانا چھپا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس گھر سے ہونے مجبور انسان پر کیا تیزی ہوگی۔ اس بات کا امکان ملر کے برابر تھا کہ وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔ میں ایک یو بھل اور افسردہ سی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ابھی میں جین کے اندر ہی تھا میں دوبارہ غیر ارادی طور پر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور رائفل کی دوڑ تین کی مدد سے اس سمت میں نگاہ دوڑانے لگا جدر تھوڑی دیر پہلے ہنگامی صورت حال کے قوی آثار کا امکان تھا مگر اب اس طرف ہوا کا عالم تھا۔ کوئی آواز ساعت تک رسائی حاصل کر رہی تھی اور نہ ہی کوئی منظر نگاہ کی گرفت میں آ رہا تھا۔ میں ایک تک ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں لپکا۔

”کیوں یہ چنگیز خان تو نہیں تھا جو کسی پولر درندے کی خوراک بن گیا؟“

اگلے ہی لمحے ایک دوسرے خیال نے پہلے خیال کی تردید کر دی کہ وہ بد نصیب کسی بھی قیمت پر چنگیز خان نہیں ہو سکتا تھا۔ نیل کریم کے الفاظ میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ ”آئندہ دو روز کے اندر چنگیز خان اس آئی لینڈ پر ہوگا۔“

نیل کریم ”اسل اینڈ بوز“ کا نمائندہ تھا۔ اس سیکرٹ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والوں کے حساب میں ”ایرڈ“ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر معاملے میں حد سے زیادہ پریکشن کے طالب تھے، اسی لیے وہ ایسے افراد کو اپنے برادر ہڈ میں شامل کرتے تھے جو اپنے شے کے ماہر ہوں اور اپنے ہنر میں بیطلی رکھتے ہوں۔ میں اب تک اس سوسائٹی سے وابستہ جس بھی مردوزن سے ملا تھا، اسے ”سپیشلسٹ“ پایا تھا۔ ڈیٹیلیٹیا کی اسٹیشنلٹی نے تو مجھے اس حال کو پہنچایا تھا۔ قبل اس کے کہ ڈیٹیلیٹیا کے قاتمانہ چہرے کا تصور میری سوچ

کیا اور اسٹوروم سے باہر نکل آیا۔

جیسی دوسریب دوش کی چوٹی کھڑکی اس ہٹ کے بیڈروم میں موجود تھی، ویسی ہی ایک کھڑکی مجھے کچن اور اسٹوروم کی دیواروں میں بھی دکھائی دی تھی۔ جس بھیا تک اور پرموز حیوانی آواز نے مجھے بیڈروم چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، اس کی آمد کا سلسلہ مسلسل جاری تھا اور اب مجھے اس کی سمت کچن کے زاویے پر محسوس ہو رہی تھی اور مذکورہ آواز میں اچھی خاصی تبدیلی بھی واقع ہو چکی تھی۔ میری ساعت کے مطابق یہ آواز ”اوغو..... اوغو“ جیسی غراہٹوں میں ڈھل چکی تھی اور اس کے ماخذ کا ہٹ سے فاصلہ بھی کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ میں نے ہٹ سے باہر نکلنے کا رسک نہیں لیا اور کچن والی کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے نوزلبرنی ایم فورٹی اینٹ لبرنی رائفل کو ریڈی کیا اور کچن کی کھڑکی کو کھول کر ہٹ کے باہر کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کھڑکی کھلنے کے بعد مجھے دو ناخوشگوار تجربات سے گزرتا پڑا۔ اول، اس ”اوغو..... اوغو“ کا والیوم کافی بڑھ گیا تھا۔ دوم، بج بستر برقیلی ہوا کے شندے شہار جھونکے نے میرے چہرے کی مزاج پر سی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنے میں ایک ذرا کوتاہی نہیں برتی تھی۔ میں نے ”تنگ آمد یہ جنگ آمد“ کے مصداق کمر کس لی اور موسم کی شدت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نوزلبرنی رائفل کے بیرل کو کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نکال کر کسی ماہر شکاری کے مانند پوزیشن سنبھال لی۔

یو ایس اے میڈ اس شاندار شکاری رائفل پر دو رو تین بھی نصب تھی۔ میں نے ماحول کی سختی کی پروا کیے بغیر اپنی آنکھ کو رائفل کے آئی پین پر لگایا اور دو رنگ برقیالی فضا کا جائزہ لینے لگا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ بہت جلد آواز کا ماخذ میری نگاہ میں آجائے گا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ دھندلے شندے ماحول میں چند خوف ناک قطبی جانور مجھے دیکھنے کو ملیں گے لیکن میرے انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے لگیں پھر اچانک ان بین سے مشابہ آوازوں میں ایک انسانی آواز بھی شامل ہو گئی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ درندے کسی انسان کے تعاقب میں تھے اور یقیناً اس بد نصیب انسان کا تیا پانچا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس احساس نے مجھے حد درجہ محتاط اور مستعد کر دیا۔ میں نے جس انسان کی آواز سنی، اس میں بڑی بے بسی اور لا چاری پائی جاتی تھی جیسے اسے اپنی موت کا یقین ہو چکا ہو۔





# پاکیزہ

ماہنامہ

کراچی

عید الفطر کی سنگتانی جھلانی رعنائیاں لیے جولائی 2018ء کا گلدستہ شمار

رفعت سراج اور شیریں حیدر کے خوب صورت ناول..... اختتامی مراحل کی طرف گامزن

حیا بخاری کے ماہرانہ قلم کا شاہکار ناول..... محبت لفظ ہے لیکن، سنسنی خیز موڑ پر

معروف راسٹر دردانہ نوشین خان کے پختہ خیالات اور پُر فکر جملوں سے آراستہ نئی ناول..... صفہ..... پاکیزہ قارئین کے لیے خصوصی عید تحفہ

نامور فنکارہ لیلیٰ زبیری سے دلچسپ گفتگو

شائستہ زریں کے رواں قلم کی بدولت پڑھیے

پاکیزہ کے مہمان میں

سینئر اسٹریٹر..... ناہید سلطانیہ اختر، شمیم فضل خالق و شگفتہ بھٹی کی خصوصی تحریریں

اس کی اعلان

طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، صبا آصف، غزالہ جلیل راؤ،

فوزیہ سرور و ہاجرہ ریحان کی پُر تنوع کہانیاں.....

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ، معلوماتی، تفریحی اور اصلاحی مستقل سلسلے اور بہت بہت کچھ..... صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کرام کے لیے

ضرورت ہے۔

”ٹھیکس!“ وہ منونیت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کافی کا گامگ اور کوکیز والی پلیٹ اس کے سامنے بیڑ پر رکھتے ہوئے بڑی رसान سے کہا۔ ”اگرچہ جسم کو گرماش پہنچانے کے حوالے سے یہ اس مشروب کا پائسنگ بھی نہیں ہے لیکن میرے پاس جو تھا وہ میں نے پیش کر دیا۔“

”اسکین تھینک یو۔“ وہ شائستگی سے بولی پھر بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مستنفر ہوئی۔ ”یو لائیک دس؟“

”نورا!“ میں نے پوری قطعیت سے کہا پھر کافی کا گامگ اس کے سامنے کرسی پر چاہیٹا۔

یہ وہی کرسی تھی جہاں چند مٹھے پہلے نسل کریمربیشا مجھے راس آئی لینڈ کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ میرے جواب پر اس عورت نے حیرت بھری بے یقینی سے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں، محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔ میں نے پوچھا۔

”تم کون ہو اور اس سردخانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟“

اس کے پہتاوے سے میں یہ اندازہ تو قائم کر چکا تھا کہ وہ کوئی مہم جو ہے لیکن میں اس کی زبان سے بہت کچھ سننا چاہتا تھا۔

”میرا نام کیا ہے۔“ اس نے بتایا۔  
”کایا کلب یا کایا پلٹ؟“ بے ساختہ میرے من سے نکلا۔

”نہیں، نہیں.....“ وہ جلدی سے گردن کوٹنی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”میں کایا اتھن ہوں۔ میرا تعلق نیوزی لینڈ سے ہے۔“

”وہ کلب اور پلٹ؟“ کو یقیناً کوئی نام سمجھی تھی اس لیے فوراً اس نے اپنا پورا نام بتا دیا تھا۔ میں نے بھی اپنی بات کی وضاحت کرنا ضروری نہ جانا اور سوال کیا۔

”کایا اتھن!“ تم نیوزی لینڈ سے یہاں کیا کرنے آئی ہو اور مجھے تفصیل سے بتاؤ، ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کون سا تین واقعہ پیش آیا ہے؟“

کایا ایک پست قامت اور بھرے بھرے بدن کی مالک بادی آنکھوں والی انتہائی چمکش نیوزی لینڈرنگی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس سے بائیس کے درمیان لگایا۔ اس کی رنگت صاف، جلد شفاف اور سر کے بال

گہرے بھورے تھے۔ اس کا اسموک اینڈ ڈریک کرنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ خبر، یہ اس کا ذاتی فعل تھا اور اس ملاقات کو ابھی چند منٹ ہوئے تھے۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے سے پوچھا۔ ”کیا تم ایشیائی ہو؟“  
”میرا نام علی ہے اور میں پاکستان سے ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”اچھا اچھا.....“ وہ سرسری انداز میں گردن ہلانا ہوئے بولی۔ ”تم انڈین ہو۔“

یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایشیائے باہر خصوصاً یورپ اور امریکا میں اگر کوئی شخص پاکستانی کی حیثیت سے تعارف کرائے تو اسے انڈین سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کو آزاد ہونے سے سڑک سال بیت چکے لیکن ابھی تک بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ پاکستان متحدہ ہندوستان کا حصہ ہے۔ ”انڈیا اور پاکستان دو الگ ممالک ہیں۔“ میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

”اس اوکے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔  
”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔

”میں پیشے کے اعتبار سے ایک نرس ہوں۔“ بتانے لگی۔ ”کراٹس چرچ کے ”ہل مورن“ اسپتال سے میرا تعلق ہے۔ میں کراٹس چرچ میں واقع کنٹر بری ایرو کلب کی ممبر بھی ہوں۔ مجھے ہم جوئی بہت پسند ہے۔ اسپتال میں میری ونزولیشن تھیں تو میں نے انٹارکٹیکا کی ایکسپلور کرنے کی ٹھانی اور ایک ٹیم کے ساتھ کراٹس چرچ سے یونٹک C-17 گلوب ماسٹر جہاز پر سوار ہو کر انٹارکٹیکا کے ”اسکٹ تیس“ پر پہنچ گئی۔ ”گلوب ماسٹر“ نامی یہ یونٹک طیارہ امریکی انزفوریس کے تعاون سے چلتا ہے۔ میں چونکہ کنٹر بری ایرو کلب کی ممبر ہوں اس لیے مجھے اس طیارے سے سفر کرنے کا موقع مل گیا۔ ہم لوگ پندرہ دن کے مہمائی سفر پر پندرہ جولائی کو اسکات تیس کے انزپورٹ پر اترے تھے۔ پانچ چھ گھنٹے کی نارمل فلائٹ میں ہمارے دس ساڑھے دس گھنٹے لگ گئے کیونکہ خراب موسم کے سبب گلوب ماسٹر کوخوف ناک کیلیاٹیک (Katabatic) سے گزرا پڑا تھا۔“

”کیلیاٹیک..... مطلب؟“ میں نے اس کی کہانی میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا چیز ہے؟“

”کیلیاٹیک ونڈز یعنی خطرناک برقانی آندھی!“ وہ



کایا کی الجھن مجھے بھلی لگی۔ پریشانی اور الجھن میں خوب صورت عورتوں کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ کایا کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے بڑے دلار سے کہا: ”کوئی بات نہیں۔ تمہیں اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں اپنی ٹیم سے بچھڑ گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم  
 اگلے چھ سات دن میں انٹارکٹیکا کو ایکپلور کرتے ہوئے  
 ٹاسٹ میس سے کافی دور نکل آئے تھے پھر راستے میں پولر  
 ٹان نے ہمارے پیچ در آڑیں ڈال دیں۔ برفانی ہواؤں  
 تیز و تند جھکڑ نے ناک سے ایک فٹ آگے دیکھنا بھی  
 نہ کر دیا تھا پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ میں کب اپنی ٹیم سے جدا  
 ہوں۔ جب مجھ پر قدرے تھکا اور آنکھ سامنے کے منظر کو دیکھنے  
 قابل ہوئی تو میں اس لٹل دو ق برف زار میں گم ہو چکی  
 تھی۔ میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو پیچھے کر دیا اور اس

”میں تمہاری معلومات کو چیلنج نہیں کروں گی لیکن ہج کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔“ وہ ایک کوئیز کو اٹھاتے ہوئے دلی۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ انٹارکٹیکا سے کتوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے مگر عام فسطوں کے کتوں کو اور یہ کام اسی سال مکمل ہوا ہے۔ دو ماہ پہلے یعنی اپریل میں یہاں ”ڈاگز بینڈ“ کا قانون بھی لاگو کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی.....“ لکھاتی توقف کر کے اس نے ایک اور کوئیز اٹھا لیا پھر اپنی بات

میں نے بڑی رसान سے جواب دیا۔ ”میں اپنے  
الک کو یاد کر کے کام چلا لیتا ہوں۔“



”مالک..... تمہارا مالک کون ہے؟“

”جو تمہارا بھی مالک ہے۔“

”پہیلیاں نہیں بھجواؤ۔“ وہ اپنے ریلے فرنج کٹ پر کشش ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ ”اگر نہیں بتانا چاہتے تو صاف منع کر دو۔ میں ضد نہیں کروں گی۔“

میرے محسوسات ان لمحات میں حد سے زیادہ فعال ہو گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کایا نے ہسکی ڈاگز سے میری توجہ ہٹانے کے لیے ٹاپک بدلا تھا۔ کایا کے بالائی ہونٹ کے گوشے سے مسور کی رنگت اور اسی سائز کا ایک مسابھی تھا جو اس کے چہرے کی دلکشی میں بے بہا اضافہ کرتا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کی ہے۔ جو میرا مالک ہے، وہی تمہارا بھی مالک ہے۔ تم اسے جیو دو اور گاؤ کہتی ہو اور میں اسے اللہ اور رب کہتا ہوں۔“

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”تم تو مجھے کوئی سینٹ لگتے ہو۔“

”میں تو بس ایک گناہ گار انسان ہوں۔“ میں نے کانی کا آخری ٹھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر پیری بدلتے ہوئے بولی۔ ”میں کافی دیر سے محسوس کر رہی ہوں کہ وقفے وقفے سے تمہارے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے؟“

”نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں ایک پیشہ ور نرس ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”میری آنکھیں اور میرا دماغ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تم اپنے جسم میں کہیں نہ کہیں درد محسوس کر رہے ہو اور اس درد کو دباؤ، اسے برداشت کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، کیا مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے، میں تمہاری مدد کر دوں۔“

یقیناً کایا ایک ذہین اور تجربہ کار نرس تھی۔ اس کا مشاہدہ بلا تھا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات کو بہ آسانی پڑھ لیا تھا۔ میں نے ایک فرضی چوٹ کے کدھوں پر بندوق رکھ کر اسے ایک جھوٹی کچی کہانی سنا دی۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

”کیا میں تمہارے زخم کا معائنہ کر سکتی ہوں؟ میرے بیگ میں میڈیکل کٹ موجود ہے۔ اگر تمہیں فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہوگی تو میں تمہارے کام آسکتی ہوں۔“

کایا کی پیشکش میں مجھے کوئی قباحت یا حرج نظر نہیں آیا لہذا میں نے بیڈ پر لیٹ کر اس سے اپنے پیٹ کے زیریں حصے کا معائنہ کرایا۔ اس نے بیڈنڈ بٹنا کر میرے زخم کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہارا زخم تو بالکل ٹھیک ہے۔ کھال کے اندر جذب ہو جانے والے ٹانگے لگائے گئے ہیں۔ دو چار روز میں تمہارا آگھاؤ بھر جائے گا۔ میں نئی بیڈنڈ کر دیتی ہوں اور کھانے کے لیے تمہیں چین کٹر میڈیسن بھی مہیا کرتی ہوں۔ میری میڈیکل کٹ میں یہ سب موجود ہے۔“

آئندہ دس سے پندرہ منٹ میں اس نے یہ کام فٹا دیا۔ اس دوران میں ہمارے سچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”تمہارا میں کیمپ اسکاٹ میں پر ہے نا؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں کچھ اندازہ ہے، یہ ہٹ اسکاٹ میں سے کتنے فاصلے پر ہوگا؟“ میں نے کریدے والے انداز میں پوچھا۔

”میں بالکل درست اندازہ تو نہیں لگا سکتی۔“ وہ مجھے چین کٹر کھلاتے ہوئے بولی۔ ”البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں سے اسکاٹ میں پانچ یا چھ یا زیادہ سے زیادہ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ پیدل تین گھنٹے کی مسافت؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... کم و بیش اتنا ہی۔“ وہ بے نیازی سے اپنے بیگ تک پہنچی پھر میڈیکل کٹ کو بیگ کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر درست سمت کا علم ہو تو دو دن بے سمت انسان تو..... اس برف زار میں ساری زندگی ٹھہرتا اور بھٹکتا رہے گا۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا۔ ”اس وقت تو تم بھی بے سمت ہو چکی ہو مگر تمہارے چہرے سے پریشانی نہیں چمکتی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اسکاٹ میں تک بہ آسانی پہنچو گی؟“

”خود پر تو نہیں مگر مجھے ان پر بھروسہ ہے۔“

”کن پر؟“ میں نے سرسری ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اپنے ساتھیوں پر۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

وقت

”آسکر، اولیور اور آئیلا جلد یا بدیر مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور وہ بھی آئیس جولائی سے پہلے۔“

”کیوں..... آئیس جولائی کو کیا ہونے والا ہے؟“

”اسکیوٹل کے مطابق، آئیس جولائی کو ہمیں اسکاٹ میں سے یونگ C-17 گلوب ماسٹر پر سوار ہو کر کرائسٹ چرچ کے لیے پرواز کرنا ہے۔“ کایا نے جواب دیا۔

”اوہ.....“ میں ایک بوھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

وہ اچانک ہلٹی اور مجھے بیڈ سے اترتا دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ”ارے..... یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارے آرام کے لیے بستر خالی کر رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے رگوں میں لہو جھنڈ کر دینے والے کھلے ماحول میں کئی گھنٹے گزارے ہیں اور اس دوران میں تم نے سائبرین بریڈ ہسکی ڈاگز سے اچھی خاصی نبرد آزمائی بھی کی ہے۔ اب تمہیں ایک طویل فینڈ لینا چاہیے تاکہ تمہاری تمام تر تھکن اڑن چھو ہو جائے اور اس مقصد کے لیے بستر سے اچھی اور کوئی جگہ نہیں سکتی۔“

”اور تم.....؟“ اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں تمہارے سلیپنگ بیگ میں سو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”مگر تم زخمی ہو۔ تمہیں بیڈ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

”ہم پاکستانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔“ میں نے اس کے بالائی ہونٹ کے گنگھان مسوری سے کونکتے ہوئے کہا۔ ”ان لمحات میں تم میری مہمان ہو لہذا مہمان نوازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس بیڈ پر تم آرام کر دو گی۔“

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر کندھے اچکاتے ہوئے بخور لہجے میں بولی۔ ”جیسی تمہاری خواہش۔“ دیے اس بیڈ پر اتنی گنجائش ہے کہ ہم دونوں...

بہ آسانی سو سکتے ہیں.....

یہ کایا کی تجویز تھی یا دعوت، فی الحال اس حوالے سے سوچ کر میں اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تجویز ناشابہری کی پیشکش کے جواب میں، میں نے کہا۔

”اگر سلیپنگ بیگ کے اندر مجھے فینڈ نہ آئی تو پھر میں تمہارے پر کشش مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔“

وہ ایک طویل جمائی لیتے ہوئے ہوشربا لہجے میں بولی۔ ”میری تو آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ تمہارا جہاں دل

چاہے، سو جانا۔ میں تو چلی۔“

کایا نے ”میں تو چلی“ اس انداز میں کہا تھا جیسے وہ میرے ہٹ سے رخصت ہونے کا عندیہ دے رہی ہوتا ہم میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہ پٹانہ لڑی کس گہری کی سیر کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ مشروب کی اتنی مقدار اپنے معدے میں اتار چکی تھی کہ اب اسے ایک طویل مدہوشی بھری نیند لینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں کایا کو اس کے حال پر چھوڑ کر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

☆☆☆

سلیپنگ بیگ کی تین چار اقسام ہوتی ہیں جن میں ہر کوائٹی کے ٹیکڑل جاتے ہیں۔ کایا والا سلیپنگ بیگ اعلیٰ درجے کا تھا۔ یہ ڈبل لانگٹ والا تھا اور ٹوپائی فیکرک سے تیار کیا گیا تھا۔ جسم کو گرمائش پہنچانے کے لیے سلیپنگ بیگ کے اندر کوئی ہیٹر وغیرہ نصب نہیں کیا ہوتا بلکہ یہ تھریٹ انسولیشن نظام کے تحت کام کرتا ہے۔ انسانی جسم میں بلازم کے سبب مسلسل حرارت خارج کرتا رہتا ہے۔ سلیپنگ بیگ کی لانگٹ کے اندر ایسے مزاحمتی ریشے لگائے جاتے ہیں جو اس حرارت کو بیگ سے باہر نہیں جانے دیتے۔ یہ حرارت بیگ کے اندر مقید ہو کر رہ جاتی ہے۔

میں کایا والے سلیپنگ بیگ کے اندر کافی آرام دہ محسوس کر رہا تھا۔ اس پر سٹون ماحول میں میرا ذہن مسلسل کایا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی اسٹوری میں بعض ایسے مقامات آئے تھے جن سے میرا ذہن مطمئن نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی کئی ایک باتیں میرے دماغ میں خار کے مانند ٹھک رہی تھیں اور مجھے اس کی ذات کے حوالے سے شک زدہ انداز میں سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ ٹیل کر میر کو رخصت ہوئے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ کایا ڈرامائی انداز میں میرے ہٹ تک آ پہنچی تھی۔ میں بڑی باریک بینی سے اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ باتیں جو کسی بھی قیمت پر مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی تھیں۔

کایا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یو ایس ائیر فورس کے یونگ C-17 پر کرائسٹ چرچ سے اسکاٹ میں تک پہنچی تھی۔ انٹارکٹیکا کی جانب آنے والے ہم جو افراد کے لیے بہت سی ائر لائنز کی فلائٹس مل جاتی ہیں جن میں یونگ 757 اور ائیربس A319 کے طیارے سرفہرست ہیں پھر یو ایس ائیر فورس کا طیارہ کیوں؟ یہ سوال اپنے بطن سے متعدد سوالات کو جنم دیتا تھا جیسے، کیا کایا کا کسی بھی حوالے سے یو



کے مہینے میں موسم سرما ہوا کرتا تھا۔ دن کا تعلق گلے اجالے اور رات کا نانا گلے اندھیرے سے تھا۔ یہاں موسم سرما میں نہ تو تاریک رات کا تصور تھا اور نہ ہی اگلے دن کا کوئی رواج۔ جو تھا، جہاں تھا اور جیسا تھا..... سب قلب جنوبی کا رہیں منت تھا۔ میں چپ چاپ بچن میں آگیا۔

ناشنے کے لیے میں نے دلے کا انتخاب کیا۔ یہ ایک زود ہضم اور جلدی تیار ہو جانے والی خوراک تھی۔ دلے کی تیاری کے دوران میں میرا ذہن مسلسل کایا کی کاریگری کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت اور تجربہ کاری سے مجھے متاثر کرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا تھا مگر کیوں؟.....

یہ ”کیوں؟“ بہت سے ہندکوڑ کھوتی تھی۔ سیدھی اور سامنے کی بات تو یہ تھی کہ وہ اس قسم کے ذریعے خود کو مصیبت زدہ ثابت کر کے میری ہمدردی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس ہمدردی اور توجہ کے حصول سے اس کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ میں ترس کھا کر اسے ہٹ میں قیام کی اجازت دے دوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ میرے ہٹ پر کیوں ڈیرا ڈالنا چاہتی تھی؟ سردست اس میں کایا کا کوئی ذاتی مفاد نظر نہیں آتا تھا۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہ سب کچھ کسی کے اشارے، کسی کے حکم پر کیا تھا۔ کوئی ایسا شخص جس کا مشا تھا کہ کایا میرے قریب رہ کر میری حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھے اور میری نگاہ اس حوالے سے گھوم پھر کر ”اسکل اینڈ یوز“ پر جا بھرتی تھی۔ اس وقت دنیا میں میرا اتنا زیادہ ”خیال“ صرف اسی سوسائٹی کو تھا۔

میں نے کایا کے نام پر ریڈ سرکل لگایا اور اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر ناشنے میں مصروف ہو گیا۔

گر ماگرم دلایا میں میں پہنچا تو مجھے بدن میں خاصی توانائی سی محسوس ہوئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے نیند کا احساس ہونے لگا۔ میں دوبارہ بیڈروم میں آگیا۔ کایا ابھی تک حالت نیند میں تھی تاہم اب اس کے خراٹوں کی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ جھپٹے کم از کم چار گھنٹے سے مست نیند سو رہی تھی۔

میں ایک بار پھر کایا والے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں چونکے سوئے کا ارادہ کر چکا تھا اور اتفاق سے مجھے نیند بھی آ رہی تھی لہذا مجھے دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہونے میں کسی دشواری سے نہیں گزرنا پڑا۔

☆☆☆

میں لگ بھگ آٹھ بجے سو گیا تھا۔ جب میری آنکھ

سے باہر تھا۔

اگر میں یہاں پر اس کیسٹ کو سنا تو اس کی آواز کایا کی ساعت تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ ایک تو وہ انٹیلی نیند میں تھی، دوسرے بیڈروم سے باہر آتے وقت میں اس کا چوٹی دروازہ بند کر آیا تھا اور اب میں ہٹ سے بھی باہر تھا۔ میں نے یہ آہستگی کیسٹ کو ریو اسٹڈ کیا۔ اس کے بعد پلے کا بزن پریس کر دیا۔

چند سیکنڈ تک کیسٹ خالی چلتی رہی۔ ایک لمبے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا کہ میری محنت اکارت تھی ہے، اس کیسٹ میں سرے سے کچھ ریکارڈ کیا ہی نہیں گیا۔ یقین ممکن تھا کہ مزید کچھ وقت کے بعد میں واپس ہو جاتا کہ میری مراد برآئی۔ کیسٹ کی ریکارڈنگ بجنا شروع ہو گئی تھی۔ میرے کانوں نے جو کچھ سنا، وہ میرے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے دایوم کو دھیما رکھ کر کیسٹ پلیئر سے ابھرنے والی آوازوں پر توجہ مرکوز کر دی۔

”آووو..... ہاووو..... ہووو.....“ کا بین مسلسل میری سماعت پر دستک دینے لگا۔ کچھ دیر کے بعد یہ کرب ناک آواز ”اووو، اووو، اووو“ کی خطرناک غراہٹوں میں بدل گئی۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا پھر ان غراہٹوں میں انسانی چیخیں بھی ہو گئیں۔

یہ کیوں راکٹ سائنس نہیں تھی جسے سمجھنے کے لیے مجھے ناسا والوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں۔ ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔ کایا نے برف زار میں اس کیسٹ کو پلے کر کے اس کی آواز بھٹک پہنچائی تھی تاکہ جب وہ بعد میں مجھے خوں خوار کتوں کی اسٹوری سناے تو میں آنکھیں بند کر کے اس کی بات پر ایمان لے آؤں اور وہ پٹاخہ لڑکی کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہی تھی۔

میں نے کیسٹ کو فل فاروڈ کر کے اسے اس کی پہلے والی حالت میں پہنچایا تاکہ جب یہ کیسٹ پلیئر کایا کی نظر سے گزرے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ پھر میں دبے قدموں بیڈروم میں پہنچا اور کایا کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ ہنوز بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے کیسٹ پلیئر کو واپس کایا کے بیگ میں رکھا اور ایک مرتبہ پھر اسے سوتا چھوڑ کر بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ ان لحاظ میں مجھے ہلکی ہلکی ہموک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے رست واضح میں وقت دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ یہ لگ بھگ ناشنے کا وقت تھا۔ اگر میں دنیا کے کسی اور ملک میں ہوتا تو تین جولائی کی اس صبح اب تک چہار سو مل اجالا پھیل چکا ہوتا لیکن یہ انٹارکٹیکا کا جزیرہ اس تھا جہاں جولائی

کر سکتا تھا۔ کایا کی اصلیت تک رسائی حاصل کرنے کا یہ ایک بہترین موقع تھا۔

میں بے آہستگی سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا اور ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر خط قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ کے نزدیک پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں چپ چاپ کھڑا کایا کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بے خبری کی گہری نیند میں تھی۔ اس کا خوابیدہ حسن، بے ترتیب زرخیز بدن کے ساتھ مل کر دیکھنے والی آنکھ کو متحیر اور سوئے والے دماغ کو متغیر کر رہا تھا۔ یہ نظارہ ظلم ہو شر بائے کم نہیں تھا لیکن اس کے خوف ناک خراٹے اس رومینک ماحول کا کباڑا کر رہے تھے۔ وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ کایا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اس کے سفری بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

اس کارروائی کے دوران میں یہ خیال بھی مسلسل دامن گیر رہا کہ میں ایک غیر اخلاقی اور مجرمانہ فعل کا ارتکاب کر رہا ہوں لیکن ایسا کرنا حالات کا تقاضا تھا۔ میرا ذہن کایا کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اطمینان قلب کی خاطر مجھے اس کے سامان کی مکمل تلاش لینا تھی اور یہ سامان اس سفری بیگ پر ہی مشتمل تھا لہذا میں نے یہ صبر و تحمل بیک کو کھولا اور اس کے اندرون کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

بیگ کے اندر بھی کچھ ہی اہم جو کی ضرورت کا تمام ضروری سامان موجود تھا۔ کایا کا پاسپورٹ اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ وہ کرائسٹ چرچ، نیوزی لینڈ ہی کی ایک معزز شہری تھی جو پندرہ جولائی کو اسکاٹ لینڈ کی ایک معزز شہری تھی۔ دیگر کاغذات بھی ان حقائق کی تصدیق کرتے تھے۔ بیگ کے اندر میڈیکل کٹ کے علاوہ مجھے خواتین کے استعمال کی بعض مخصوص چیزیں بھی دکھائی دیں۔ میں نے کم و بیش دس منٹ کی تلاش کے بعد بالآخر ایک کام کی شے ڈھونڈ لی۔

یہ ایک مٹی کیسٹ پلیئر تھا اور اس کے اندر ایک کیسٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ اس مٹی کیسٹ کو پلے کر کے دیکھنا چاہیے۔ یہ خیال اچانک ہی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ مذکورہ کیسٹ پلیئر اس وقت ایسی حالت میں تھا کہ اس کے اندر لگی ہوئی کیسٹ پوری طرح پلے ہو چکی تھی۔ اس کیسٹ کی ریکارڈنگ کو سننے کے لیے مجھے کیسٹ کو ریو اسٹڈ کرنا تھا اور یہ کام بیڈروم کے اندر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے کایا کے سفری بیگ کو واپس غریب خاک کر کے بند کر دیا اور اسے اس کے سابق مقام پر رکھنے کے بعد میں بیڈروم سے نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے میں ہٹ

ایس انفرور سے کوئی تعلق تھا؟ میں نے چند گھنٹے پہلے ڈیفینیا کو سدرن لیکس آئی ٹی آر بیلی کا پڑاٹا دیکھا تھا۔ کایا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کنٹر بری ایرو کلب کی باقاعدہ ممبر بھی ہے۔ تو کیا وہ امریکیوں کے پینل پر تھی؟ یا کسی حوالے سے اس کا تعلق ”اسکل اینڈ یوز“ سے تھا؟ کہیں اسے کسی خاص منصوبہ بندی کے تحت مجھ پر گہری نظر رکھنے کے لیے تو اس آئی لینڈ پر نہیں بھیجا گیا تھا؟

علاوہ ازیں کایا نے مجھے ہٹ سے اسکاٹ لینڈ میں تک کے فاصلے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، وہ بھی میرے لیے حیرت کا باعث تھیں۔ وہ اس برف زار میں اپنی ٹیم سے پچھڑ چکی تھی اور موسم کی سختیوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنا پڑھ صاب سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ اپنے ڈار سے پچھڑی ہوئی ایک بے سمت اور بے یار و مددگار کوچ تھی اور خونخوار کتے اس کی چیر پھاڑ کی خواہش لیے اس کے تعاقب میں تھے۔ ان نامساعد حالات میں بھی وہ جانتی تھی کہ میرا ہٹ، اسکاٹ لینڈ سے کم و بیش کتنے فاصلے پر ہے۔

ہلکی ڈانڈ والی اسٹوری تو سرے سے مجھے ہضم ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جو نامی آوازیں اور غصیلی غراہٹیں سماعت کی تھیں، وہ بھیڑیے کی طرف بڑا واضح اشارہ کرتی تھیں اور پورا انٹارکٹیکا بھیڑیوں کے وجود سے خالی تھا۔ دنیا میں پانچ جانور ایسے ہیں جو اپنے مخصوص ماحول کے سوا دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائے جاتے۔ کیوی نیوزی لینڈ میں، کیمنگڈ اسٹریلیا میں، پانڈا چین میں، چینگون ساؤتھ پول انٹارکٹیکا میں اور پولریٹز تاتھ پول آرکٹک میں۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی جگہ یا گھر میں پائے جاتے ہوں۔ معلومہ تاریخ کے مطابق چینگون اور پولریٹز آج تک ایک دوسرے سے نہیں ملے۔

ان تمام نکات پر غور و فکر کرتے ہوئے میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے کسی بھی قیمت پر کایا پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کرنا۔ میں آنکھ بند کیے کایا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک کھردری آواز نے میرے خیال میں خلل ڈال دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کایا کے خراٹوں کی آواز تھی۔ کایا دیکھنے میں جتنی دلکش نہیں تھی، اس کے خراٹے اتنے ہی بے ہنگم اور ہمایاں تھے۔ وہ یقیناً اس وقت گہری نیند میں تھی۔

کایا کی گہری نیند کے خیال نے میرے رگ و پے میں ایک سستی خیز مہمانی لہر دوڑادی۔ اس کی بے خبری میں، میں اس کا بیگ چیک کر کے اپنے تمام خدشات کی تصدیق



”میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں۔“ وہ نوڈلز کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہٹ تمہارا ہے۔ تم یہاں چالیس دن رہو یا چالیس سال، یہ تو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“

”یہ ہٹ میرا نہیں ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پھر کس کا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”گڈ جوک!“

”یہ جوک نہیں، ریلیٹی ہے۔“

”تمہارا تعلق پاکستان سے ہے اور تم اپنے وطن سے ہزاروں کلومیٹر دور اس سرد خانے کے ایک ٹھنڈے ٹھارہٹ میں پڑے ہوئے ہو۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟“ اس نے تیز نظر سے مجھے گھورا۔

”یہ مذاق ہے اور نہ ہی جوک۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ سچ ہے کہ میں اس ہٹ کے مالک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے میرے گردنے کہا کہ من کی مراد پانے کے لیے مجھے چالیس دن تک کسی ویران اور خراب علاقے میں قیام کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے گرد کی بات مان لی اور یہاں چلا آیا۔ یہ چالیس دن کا چلہ اکیس اگست کو پورا ہوا ہے گا تو یکم ستمبر کو میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔“

چند لمحات تک وہ گہری ٹوٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرے بیان میں کس حد تک صداقت ہے۔ جب اس کی تسلی نہیں ہوئی تو پوچھ بیٹھی۔

”تمہارا مینور (گرو) کون ہے؟“

”میرے مینور کا نام ہے جی ایم سر۔“ میں نے بتایا۔

”اور یہ چالیس دن کا چلہ کس سلسلے میں ہے؟“

”من کی مراد پانے کے لیے۔“ میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کیا کے دماغ سے کھینچے ہوئے کہا۔ ”اس چلہ کٹی کے نتیجے میں مجھے وہ حاصل ہو جائے گا جو میری خواہش ہے۔“

”تم کس آرزو میں یہ تکلیف اٹھا رہے ہو؟“

”میری آرزو کا نام ہے۔۔۔۔۔ ایو یو!“

”یہ من! اے کرل؟“ اس نے الجھن زدہ لہجے

”گیٹ اٹ اسٹارٹڈ (Get it started) بڑا معنی خیز گانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جس میں پٹ بل نے بہت سی پیش گوئیاں کی تھیں جن میں سے تقریباً سبھی پوری ہو چکی ہیں۔ ایک سنسنی خیز پیش گوئی تو چار ماہ پہلے ہی پوری ہوئی ہے۔“

”تمہارا اشارہ ملائشین انٹلائن کے گمشدہ جہاز کی طرف ہے؟“

”کیا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”پٹ بل کا یہ الیم ”گلوبل وارمنگ“ کے نام سے دو ہزار بارہ میں ریلیز ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا، ملائشین انٹلائن کا یہ طیارہ کہاں گیا۔ اسے آسمان کھا گیا یا سمندر نے نگل لیا، اس راز پر دہیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پٹ بل کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ خیر۔۔۔۔۔ لگاتی تو قوت کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے کچھ بتانے والی تھیں۔۔۔۔۔؟“

”اوہ ہاں۔۔۔۔۔“ وہ بیڈ کے میز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اس کی گرامش کاراز پایا ہے۔“

”کیسا راز؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے اندر بھی سلیپنگ بیگ والا میکانزم استعمال کیا گیا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”یعنی قہرل انٹولیشن۔ اس پر سونے والے انسان کی پاؤں جو حرارت خارج کرتی ہے، یہ سسٹم اسے ضائع نہیں ہونے دیتا بلکہ اسے اپنی لائٹنگ کے اندر قید کر کے رکھتا ہے۔ ایک منٹ۔۔۔۔۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر بیڈ سے نیچے اتر آئی پھر کچن کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

”میں نے نوڈلز کو چوبے پر ہی چھوڑ دیا تھا تاکہ گرم رہیں۔ میں وہ لے آؤں پھر تمہاری بھی سنتی ہوں۔“

”اس ہٹ میں موجود ایجنٹ کون سی باتیں بے دردی اور فضول خرچی سے ضائع نہیں کرو۔“ میں نے اس کی پشت پر کہا۔ ”تم تو دو چار دن میں یہاں سے رخصت ہو جاؤ گی، مجھے پورے چالیس دن ادھر ہی گزارنا ہیں۔ آئندہ خواہ مخواہ چوبہا جلا ہوا نہیں چھوڑنا۔“

وہ نوڈلز لے کر واپس آئی تو اس نے پہلا سوال یہی کیا۔ ”کیا تم چالیس دن تک اس ہٹ پر قیام کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

کر معنی خیز انداز میں بولی۔

”یہ پیشکش آئندہ کے لیے بھی ہے۔“

اس کے لہجے کے اعتدال سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ”آئندہ“ کا لفظ استعمال کر کے وہ اس ہٹ پر طویل قیام کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”میں نے تمہاری آخر کو قبول نہ کر کے مشکل مندی کا ثبوت دیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

”فریش ہو کر آ جاؤں، پھر بتاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں بیڈ روم کے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

میں نے اپنے عقب میں کیا کیا آواز سنی۔ ”تمہیں بتانے کے لیے میرے پاس بھی بہت کچھ ہے۔ جلدی سے واپس آ جاؤ۔“ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ میں کچن میں جا کر کچھ تیار کرتی ہوں۔“

”او کے!“ میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

جب میں واپس آیا تو کاٹاؤں پر ہیڈ فون لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گیجٹ (Gadget) تھا۔

یہ گیجٹ میں نے اس کے بیگ کے اندر رکھا دیکھا تھا۔ گویا میری عدم موجودگی میں اس نے بیگ کو کھولا تھا جیسی یہ گیجٹ (میوزک سننے کا ایک آلہ) اس وقت اس کے پاس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور پُر کشش بدن میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ بدن کی یہ حالت یقیناً اس موسیقی کے رد عمل کے نتیجے میں تھی۔

وہ بیڈ پر تھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری موجودگی کو فوراً محسوس کر لیا اور آنکھیں کھولنے سے روک کر آواز میں بولی۔

”تم آگئے۔۔۔۔۔!“

”آگیا ہوں اسی لیے تمہیں نظر آ رہا ہوں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

وہ بیڈ فرائی سے اپنے کانوں کو آزاد کرتے ہوئے بولی۔ ”پٹ بل کون رہی ہوں۔“ پھر اس نے گیجٹ کو آف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ”اس کی تھوڑی سی میٹری ہنسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، دل بہلا لیتی ہوں۔“

”کون سا گانا سن رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”گیٹ اٹ اسٹارٹڈ۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

کھلی تو دو پہر کے دو بج رہے تھے۔ گویا میں نے کم و بیش چھ گھنٹے کی نیند لی تھی۔ میری سوئس رسٹ وایج میں ایک خوشی یہ بھی تھی کہ اس میں ٹائم کے دونوں فارم موجود تھے یعنی چوبیس گھنٹے والا بھی اور ”اے ایم/ پی ایم“ والا بھی اور یہ دونوں بیک وقت ڈیلے ہوئے تھے۔

میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکلا تو کاٹاؤں کو کرسی پر بیٹھے پایا۔ وہ مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھی اور خاصی گھری گھری سی دکھائی دیتی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو خوشگوار لہجے میں بولی۔

”تم نے تو خاصی طویل نیند لے لی۔۔۔۔۔“

شاید وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں بھی اس کے آگے پیچھے ہی سویا ہوں گا مگر ہم دونوں کے سونے میں کم از کم چار گھنٹے کا فرق تھا۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”تمہارا سلیپنگ بیگ بڑی زبردست چیز ہے۔ مجھے ذرا سا بھی خشک کا احساس نہیں ہوا۔ بہت مزے کی نیند سویا ہوں میں۔“

”اگر اس بیگ میں تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا تو سونے کا مزہ دو بالا ہو جاتا۔“ وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں مذاق کر رہی ہوں۔۔۔۔۔“

وہ چھپر چھار کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی لہذا میں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا وہ بھی ایک مذاق ہی تھا؟“

میں نے یہ بات اپنی مصومیت سے پوچھی تھی کہ وہ گڑبڑ کر رہی تھی، اس نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

”کون سا مذاق؟“

”وہ جو تم نے سونے سے پہلے مجھے پیشکش کی تھی۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا وہ۔۔۔۔۔ ڈرنک والی!“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہ اصرار سے لہجے میں بولی۔ ”پھر۔۔۔۔۔؟“

”وہ جو تم نے اپنے ساتھ بیڈ پر سونے کی دعوت دی تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ مذاق نہیں تھا بلکہ میری دوستانہ پیشکش تھی اور۔۔۔۔۔ لگاتی تو قوت کر کے اس نے بڑی کھوجی ہوئی نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ایک آنکھ دبا



”نہیں!“ میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔  
 ”اولیو یا میری گرل فرینڈ ہے..... میری محبوبہ ہے۔ میں اس  
 کے حصول کے لیے یہاں برقیہ علاقے میں چالیس دن کا  
 چلہ کھینے آیا ہوں۔“

”تم.....“ وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔  
”مجھے بتا تو نہیں رہے؟“

”تمہارے اندر ایڈیٹنگ کی گنجائش کہاں ہے۔“  
میں نے بھرپور نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
”مطلب یہ کہ خالق نے تمہیں فرصت سے بنایا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بجلا چھیں کیا بناؤں گا.....“

”اوہ.....“ وہ قدرے شرماتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں کیسی لگتی ہوں؟“

”بارود بھرا پٹاخہ!“ میں نے بے ساختہ کہا۔  
وہ ٹھٹھکا کر ہنس پڑی پھر تصدیق طلب انداز میں  
”جھا۔“ ”سچ؟“

”ایک دم بچ!“  
”اور..... وہ اولیویا کا کیا.....؟“ اس کے لبوں پر  
درخ مسکراہٹ سبھی ہوئی تھی۔

”اویلو یا تو ایک دم چھوٹی موٹی ہے۔“  
 ”میں پرے (دعا) کروں گی کہ تمہاری محبوبہ جلد  
 ہمیں مل جائے۔“ وہ خوبصورتی سے اس موضوع کو بند  
 کرتے ہوئے بولی۔ ”اگرچہ مجھے تمہاری اس اسٹوری پر  
 کل یقین نہیں آیا۔“

”یہ تو اپنے اپنے طرف اور یقین کی بات ہے کیا۔“  
 نے شکا جی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”میں نے تو  
 کہیں بند کر کے تمہاری اسٹوری پر بھروسہ کر لیا تھا۔“  
 ”کون سی اسٹوری؟“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے

”خونخوار ہسکی ڈانز والی اسٹوری.....“ میں نے اس چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”جو تمہاری چہرہ بچاؤ کا کرام بنا چکے تھے۔ پھر جب وہ انے تمہاری حفاظت کی اور تم کو بچا کر اس ہٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔“

”کوڈ ڈاٹ!“ اس نے گول مول انداز میں کہا پھر یہ بدلتے ہوئے بولی۔ ”وہ تم کی کہہ رہے تھے؟ میری قبول نہ کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔“

”اگر میں تمہاری پیشکش قبول کر کے ہیڈ پر لیٹ جاتا تو ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھ نہ لگتی۔“ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”پوری رات جاگتے ہوئے گزر جاتی۔“

”لیکن.....“ وہ اب بھن زدہ انداز میں بولی۔ ”میرا تو تمہیں رات بھر جگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”ایکسکیوز می.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”حالتِ نیند میں انسان کو اپنے ارادے پر کب اختیار ہوتا ہے؟“

اس کی انجمن سوا ہو گئی۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“  
 ”میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ.....“ میں نے  
 سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم اتنے خوف ناک خراٹے  
 بیتی ہو کہ پاتال میں سوئے ہوئے شحات الارض بھی نعرۂ  
 ستانہ لگائے پر مجبور ہو جائیں۔ میں تو پھر ایک مجبور عاشق،  
 ایک معصوم حلثؔ انا ہوں۔“

”اوہ..... اب سبھی۔“ وہ عداوت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات اور بھی کئی لوگوں نے مجھے بتائی ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ میں سوتے میں خراٹے لیتی ہوں۔“

”یقین تو میں تمہیں آج ہی دلا دیتا لیکن.....!“  
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے پوچھا۔  
”لیکن کہا؟“

”اگر میرے پاس اس ہٹ میں کوئی منی کیسٹ  
 لیکارڈر ہوتا تو میں تمہارے ہیبت ناک خراٹوں کو ریکارڈ  
 کر کے تمہیں ضرور سناتا۔“ میں نے سنجیدہ مگر پُر معنی انداز  
 میں کہا۔

بے ساختہ کایا کی نگاہ اپنے سفری بیگ کی سمت اٹھ  
 ئی۔ اس کا یہ فوری عمل ”چور کی ڈانٹھی میں ٹھکا“ کا عکاس  
 - میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک لمحے کے  
 - گہری تشویش کو دیکھا جیسے اسے اپنی کسی پونل پے کھل  
 - نے کا اندیشہ لاحق ہو۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی  
 - فیت پرقاپو پالیا اور بڑی فراخ دلی سے بولی۔

”اگر جی نہیں میرے ساتھ لینے کا موقع مل گیا تو ایک لمحے کے لیے بھی سونے نہیں دیتا۔ اس طرح رے خراٹوں کا خدشہ قلمبند نہ ہوا۔“

”جب بھی ایسا موقع آیا، تب اس بارے میں میں نے سرسری انداز میں کہا کچھ پوچھا۔“ کیا

اری واپسی بھی بونگ C-17 ہی سے ہوئی یا کسی

دوسرے جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ ہے؟“  
 ”یونگ C-17 گلوب ماسٹر طیارہ اکتیس جولائی  
 اسکاٹ میں سے کرائسٹ چرچ کے لیے پرواز کرے گا۔“  
 اس نے بتایا۔ ”اور اسکیجوئل کے مطابق مجھے اسی طیارے  
 سے واپس جانا ہے۔ تم میرے لیے پرے کرو کہ میں  
 جلد از جلد اپنی ٹیم سے مل جاؤں۔“

”تمہیں اس سلسلے میں فخر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر اگلے ایک، آدھ روز میں تمہاری ٹیم کے افراد تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس ہسٹ تک نہ پہنچے تو پھر میں تمہارے ساتھ اسکاٹ میں تک جاؤں گا اور اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں C-17 پر سوار کروں گا۔“

میری اس پیشکش کے جلو میں چند مقاصد پوشیدہ تھے۔ میں کا یا کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ آیا وہ اس ہٹ پر میری نگرانی کی نیت سے آئی ہے یا اس کا واپس میوزی لینڈ جانے کا ارادہ ہے؟ اگر وہ میری اس اسکاٹ میں تک چھوڑنے کی آفر کو قبول کر لیتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ واقعتاً ایک مہم جو عورت ہے جو بدقسمت اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث اپنی ٹیم سے علیحدہ ہو گئی ہے اور بخیر و عافیت اپنے ملک جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اسے میری ذات سے ایسی کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے کہ اس ہٹ پر جوکیدار حیثیت سے ٹھہر جائے اور اگر

وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہاں آئی تھی یا یہاں پہنچائی گئی تھی تو مجھ کو دور میرے ساتھ اسکاٹ بیس جانے کے بجائے ادھر ہی اپنے قیام کا کوئی جواز پیدا کر لیں۔ پھر کیا ہو گا؟ ہٹ سے میں اس لیے بھی روانہ کرنا چاہتا تھا کہ میں آئے چل کر اپنے دیرینہ دشمن چیگیٹر خان کا جو عبرت ناک حشر کرنے والا تھا، وہ کیا یابی نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔

میں اپنے انداز میں سوچ رہا تھا اور کاہانے اپنے انداز میں جواب دیا۔ وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر بڑی رसान سے بولی۔

”میرے لیے اتنے خلوص سے سوچنے کا شکر یہ مگر.....“

اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں پوچھے بیٹا نہ رہ سکا۔  
 ”مگر کیا؟“  
 ”علی.....“ اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔  
 ”تم نے اپنا نام علی ہی بتایا تھا نا!.....!“  
 ”نہیں! میرا نام علی ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔



”میں نے آج پورا دن نہیں پی۔“ اس نے بتایا۔  
 ”مگدراکل!“ میں نے سراپے والے انداز میں کہا۔  
 ”آئندہ بھی تم اسی روش پر چلو گی۔“  
 ”یہ بڑی عجیب سی شرط نہیں؟“ وہ منہ بگاڑ کر بولی۔  
 ”شرط تو بس شرط ہی ہوتی ہے۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اے عجیب اور غریب تو مجھے والے کا قسم بناتا ہے۔ اگر تمہیں میری شرط منظور ہے تو بتاؤ ورنہ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔“

میرے دونوں انداز کے جواب میں وہ چند لمحات تک شش و پنج میں جتا رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔  
 ”مجھے منظور ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب تمہارے قریب ہوں گی تو ڈر تک نہیں کروں گی۔“  
 ”چلے گا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں بستر پر آ گیا۔

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ٹانگ مجھ پر چڑھا دی اور شرارت بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ”کیا تم میرے نزدیک آتے ہوئے اس لیے ہچکچا رہے تھے کہ تمہاری اولیو یا خفا ہو جائے گی؟“  
 ”اولیو یا کو کچھ پتا چلے گا تو خفا ہوگی نا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے، تم نے اولیو یا کو پانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“ وہ میری جانب کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔

”محبوبہ کو پانے کا ارادہ کوئی بھی کبھی ترک نہیں کرتا۔“ میں نے چت لیتے لیتے کہا۔ ”محبوب تو ہر شے میں دکھائی دیتا ہے۔“

وہ میرے اوپر اپنی ٹانگ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تو گویا اولیو یا اس وقت بھی تمہارے آس پاس تمہارے پہلو میں ہے۔۔۔۔۔ بالآخر تم نے اسے پالیا ہے؟“  
 ”اپنی ٹانگ سے کہو کہ میرے ذمہ کا خیال رکھے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”محبوب کا ہجر ہوا وصال، دونوں بہت دکھ دیتے ہیں۔“

”میں ایک تجربہ کار نرس ہوں اور میں نے تمہارے زخم کی اپنے ہاتھوں سے ڈریسنگ کی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا گھٹنا تمہارے زخم سے کافی فاصلے پر ہے۔“

وہ میرے ساتھ اس قدر جڑ کر لیٹی ہوئی تھی کہ ہم دو قالب یک جاں ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بدن میں کوئی آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا جس کی آج مجھے بھگوانے کی کوشش

ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں ہزبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اب یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ وہ نامراد ہسکی اس بیڈروم میں کس آئین کے اور میری ٹکا بونی کر کے ہی دم لیں گے۔“  
 میں اس کی نفسیاتی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی اسٹوری سے متاثر کرنے کے لیے جو ٹوٹی ڈراما رچایا تھا، وہ اس کے لاشعور کا کاغذ بن گیا تھا۔ آپ اسے گھٹ یا ضمیر کا بوجھ بھی کہہ سکتے ہیں جو خواب کی صورت میں اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ میں سلپنگ بیگ سے باہر نکل آیا اور تشفی بھرے لہجے میں کہا۔

”تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے چلہ شروع کرنے کے لیے اس ہٹ کا حصار کھینچ لیا تھا۔ کوئی بھی خطرناک جانور، پرندہ یا حشرات الارض اس حصار کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔ تم اطمینان سے لمبی تان کر سو جاؤ۔“

”حصار۔۔۔۔۔ یو مین سیٹھی وال؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہیں۔۔۔۔۔ آئی مین اٹ۔“

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے لیکن پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے علی۔۔۔۔۔“ وہ امداد طلب نظر سے میری جانب دیکھنے لگی۔

”میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کایا! بتاؤ، میں تمہارے ڈر کو بھگانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“  
 ”کیا تم سلپنگ بیگ کو خیر باد کہہ کر بیڈ پر سو سکتے ہو۔۔۔۔۔؟“

میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم سلپنگ بیگ میں سونا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی ادھر ہی رہوں گی۔“

کسی بھی انسان کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر اس کی مدد نہ کرنا سراسر غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویہ ہے۔ ان لمحات میں وہ خوفزدہ لڑکی بڑی آس اور امید بھری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے مومل سپورٹ دینے کا فیصلہ کر لیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

”تم بوتل سے نانا توڑ لو گی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

جاتا ہے البتہ موسم گرما یعنی دسمبر جنوری میں گا ہے بگا ہے یہ اپنا دیکر اکر داتا رہتا ہے۔

ایک گھنٹا پہلے کا یا سونے کے لیے بستر پر چلی گئی تھی اور میں بھی سلپنگ بیگ میں کس گیا تھا۔ میرے انداز سے کے مطابق اب تک کایا کو گہری نیند میں چلے جانا چاہیے تھا لیکن فی الحال ایسے کوئی آثار مجھے ”سنائی“ نہیں دے رہے تھے یعنی بیڈروم میں موت کا سکوت طاری تھا، اس کے خراؤں کا لٹ نائٹ شو شروع نہیں ہوا تھا۔

اجانک مجھے خیال آیا کہ کایا کی خبر لینا چاہیے اور وہ بھی سلپنگ بیگ کے اندر لیٹے لیٹے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے دل پر توجہ مرکوز کی اور کایا کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ تکنیک مجھے جی ایم سرنے سکھائی تھی۔ اب میں گا ہے بگا ہے اس کا تجربہ کرتا رہتا تھا۔ بیٹا والے اپارٹمنٹ میں بھی میں نے اسی عمل کے ذریعے سفیان اور زولبی کی آمد کو محسوس کیا تھا۔ تجویزی ہی دیر کے بعد مجھے کایا کے بارے میں اسٹراٹک مل آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بیڈ پر بیٹھی میری جانب دیکھ رہی ہے۔ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے روشن نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ محسوسات کے ذریعے میری میموری تک پہنچ رہا تھا۔

یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ موتی کیوں نہیں۔ اس کی شب بیداری کا سبب جاننے کی خواہش میرے دل میں جاگی اور میں نے سلپنگ بیگ کے اندر سے پوچھا۔  
 ”کایا! کیا تمہارے ساتھ کوئی پرائیوٹ ہے۔ تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہو؟“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔  
 ”تو تم بھی جاگ رہے ہو۔“

”میری ابھی آنکھ کھلی ہے۔“ میں نے بنی برصطت دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا اور بیگ سے باہر منہ نکال کر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔؟“

”مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ سراپہ آواز میں بولی۔

”کیسا ڈر؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میری آنکھ لگ گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں نے بڑا ڈرناؤ خواب دیکھا ہے۔“

اس کی آواز سے خوف جھلکتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تم نے خواب میں ایسا کیا دیکھا ہے؟“

”ہسکی ڈاکٹر میرا تپا نچا کر رہے تھے۔“ وہ سہمے

”اسد علی۔“

”علی! اگر تم مجھے اسکاٹ میں پہنچانے کے لیے اس ہٹ سے نکلے تو پھر تمہارے چلے کا کیا ہوگا۔ تم تو کسی اولیو یا کو پانے کے لیے اس دور دراز سرد خانے میں بیٹھے ہو۔۔۔۔۔!“

اس کو کہتے ہیں ”کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔“ گویا وہ یہ چاہتی تھی کہ میں اس ہٹ سے پرے نہ ہوں۔ وہ مجھے یہیں پر مقید رکھنے اور مجھ پر خود کو مسلط رکھنے کی خواہاں تھی۔ بلا واسطہ اس نے میرے تمام تر اندیشوں اور خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

”چلے گا کایا ہے۔ تمہیں تمہاری منزل پر پہنچانے کے بعد دوبارہ زبرد سے شروع کر دوں گا۔ ویسے جمع مہینوں میں تو ابھی میں نے چلے کا آغاز ہی نہیں کیا تھا۔ آج پہلا دن تھا اور آج ہی۔۔۔۔۔“

”آج ہی میں نازل ہوئی۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“ اس نے شرارت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ”میں نے تمہارے پروگرام کو گزبڑ کر دیا ہے نا۔۔۔۔۔!“

”تم نازل ہوئی ہو یا پٹاکا مٹی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کبھی انداز میں کہا۔ ”تمہیں خود کو مورد اڑام ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا ہے کہ کس نے کس کو کتنا ڈسٹرب کیا۔“

”اُس اوکے!“ وہ اپنے بوب کٹ بالوں کو بڑی ادا سے جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”لیٹس ویٹ اینڈی۔۔۔۔۔“

اس تمام تر گفتگو میں جو کام کی بات پتا چلی، وہ یہ تھی کہ اکتیس جولائی کو یعنی ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ایک یونٹ طیارہ اسکاٹ میں سے کرائسٹ چرچ کی سمت پرواز کرنے والا تھا۔ اگر میں کسی بھی طرح اسکاٹ میں تک پہنچ جاتا اور کوئی بھی ترکیب آزما کر مذکورہ طیارے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس برف زار جزیرہ راس سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد چوبیس جولائی کا سورج طلوع ہونے والا تھا اور یہ ”طلوع“ محض زبانی جمع خرچ تھا۔ درحقیقت انٹارکٹیکا کے وینر سیزن (جون، جولائی) میں ”طلوع آفتاب“ کا ذکر ”دل کو خوش رکھنے کے لیے غالب یہ خیال اچھا ہے“ کی عملی تفسیر ہے کیونکہ موسم سرما سورج کی شکل دیکھنے بغیر ہی گزر



میں تھی۔ وہ قد میں مجھ سے کافی کم تھی۔ اس کا سر میری پیلوں تک آ رہا تھا۔ میں اس کی جانب کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔  
 کیا کی آتشیں سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔ میں نے مسودہ پلاؤ کا ڈاکٹھ پکھنے کے لیے بے اختیار اس کے بالائی ہونٹ کے سنے کو چوم لیا۔ وہ پست قامت پاکٹ سائز نیوزی لینڈر گڑیا میرے وجود میں بیوست ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے جھج بولی۔

”علی! تم بہت بد معاش ہو.....!“

”شکر یہ.....“ میں نے کہا۔ ”تمہارا دیا ہوا یہ نائل میرے بہت کام آئے گا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ اپنے چہرے کو میرے سینے میں گھساتے ہوئے بولی۔ ”تم کسی کام کی بات کر رہے ہو؟“  
 ”اس نائل کی بدولت میں کسی بھی وقت تم سے بد معاشی کر سکتا ہوں۔“ میں نے اس کے بوب کٹ مختصر بالوں میں اپنی اگھویوں سے لکھنی کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تم مجھے روک نہیں سکو کیونکہ یہ نائل تم ہی نے تو دیا ہے۔“  
 ”کیا کوئی اور بھی بد معاشی باقی ہے؟“ اس نے غور لہجہ میں دریافت کیا۔

”یہ تو ابتدا ہے۔“ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو جامل کرتے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھتی جاؤ، ہوتا ہے کیا!“

”اوں..... مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ مدھوشی بھرے انداز میں بولی۔

”کیا کی نیند اڑانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اس کے کان کی لو پر بوسہ ثبت کیا پھر سر گوشیاد انداز میں پوچھا۔  
 ”اسکل اینڈ یونز میں کب سے کام کر رہی ہو؟“

اس کے ذہن کو گیارہ ہزار دولٹ کا جھٹکا لگا اور اس نے خود کو مجھ سے الگ کرنے کے لیے زور مارا۔  
 میری گرفت اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ چپکنی چمپلی کے مانند پھسل کر میرے بازو کے حلقے سے نکل جاتی۔ وہ بے بسی سے کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان سے لگا کر دوبارہ سرگوشی کی۔

”ڈیٹھینا نے مجھے تمہاری آمد کے بارے میں پہلے سے بتا دیا تھا اور میں نے تمہارے بیگ میں موجود کیسٹ پلیئر میں لگی ہوئی کیسٹ کو ریو اسٹڈ کر کے سن لیا ہے۔“  
 ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ برہمی سے بولی۔

”چھوڑ دو مجھے.....“

میں نے اسے اپنے بازو کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کہا اور میں نے چھوڑ دیا لیکن..... میں جھوٹا نہیں ہوں۔ میں نے اس کیسٹ میں ریکارڈ شدہ بھینڑیوں کی آوازیں سنی ہیں جنہیں تم ہسکی ڈاکٹر کہہ رہی تھیں۔“

”میں نے جھوٹ والی بات اس کیسٹ کے حوالے سے نہیں کی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا اشارہ ڈیٹھینا کی طرف تھا۔“

”تو اس اشارے کے طفیل تم نے تسلیم کر لیا کہ تم ”اسکل اینڈ یونز“ کا حصہ ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میرے استفسار پر تمہیں کرنٹ نہیں لگنا چاہیے تھا۔“

”تم صرف بد معاش ہی نہیں، بہت چالاک بھی ہو۔“ وہ اپنے ہونٹوں کا کبڑا کرتے ہوئے بولی۔ ”ڈیٹھینا نے تم پر نگراں مقرر کرتے ہوئے مجھے ڈیویروں ہدایات دی تھیں۔ میں ہر لحاظ سے بہت محتاط تھی۔ ایک ایک قدم چھوٹک چھوٹک کر رکھ رہی تھی کہ تم نے مجھے پھنسا لیا۔“

”مجھے الزام نہ دو۔ بستر پر تم نے مجھے بلایا تھا۔“ میں نے اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔ ”میں نے جو کچھ بھی کیا وہ حالات اور وقت کا تقاضا تھا اور حالات ابھی جوں کے توں ہیں لہذا وقت کے تقاضوں کی تکمیل کا مکمل جاری و ساری رہنا چاہیے۔“

”کیا نے میری کارروائی کے راستے میں کوئی مزاحمت کھڑی نہیں کی۔“

☆☆☆

چوبیس جولائی کی شام ہم بیڈروم میں بیٹھے ڈرائی فروٹ اور کافی سے شغل کر رہے تھے۔ ”کیا آج صبح ہی سے کافی ٹھہری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں مستی بھری ہوئی تھی۔ اس نے دل آویز انداز میں مجھے دیکھا اور بڑی لگاؤ سے بولی۔

”رات تم نے بڑی مہارت اور چالاک کی سے جھوٹ بول کر مجھے ایکسپوز کر دیا۔“

”میں انجان بن گیا۔“ ”کون سا جھوٹ؟“  
 ”وہ جو تم نے ڈیٹھینا کا ریفرفس دیا تھا۔!“  
 ”اچھا وہ.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔  
 ”ڈیٹھینا سے تو میرا کھانا چلتا ہے۔ ہم ایک دوسرے پر ادھار چڑھاتے اور اتار تے رہتے ہیں لیکن ابھی حساب

کو بے باق نہیں کرتے کیونکہ ریکارڈ کے رجسٹر پر کھانا چلتا رہنا چاہیے اور جہاں تک تمہارے ایکسپوز ہونے کا معاملہ ہے تو میں گزشتہ روز علی الصباح ہی یہ کام کر چکا تھا، جب تم مشروب کو اپنے معدے میں انڈیل کر بے خبری کی نیند سو رہی تھیں۔ اس دوران میں ہٹ سے باہر جا کر میں نے تمہاری سیلف پروڈکشن بھینڑیوں کی آوازوں والی کیسٹ کو پلے کر کے سن لیا تھا جس کے باعث تمہاری ذات شک کے دائرے کے اندر آچکی تھی پھر پچھلی رات میں نے ڈیٹھینا کے حوالے سے ایک بلاسٹڈ چال چلی اور تم اس چال میں آگئیں لیکن تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میں پریشان کیسے نہیں ہوں۔“ وہ متردد نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر یہ بات سوسائٹی کے لوگوں تک پہنچی کہ تم میری اصلیت جان چکے ہو تو یہ مشن کھٹائی میں پڑ جائے گا اور میری اس کوتاہی کے نتیجے میں اوپر سے مجھ پر جو تباہ نازل ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”جہاں تک سیکرٹ سوسائٹی کو اس معاملے کی خبر ہونے کی بات ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ راز ہم دونوں کے ہی راز رہے گا۔ نہ میں کسی کو بتاؤں گا اور نہ ہی تم کسی سے اپنی غلطی کا ذکر کرنا۔ تمہیں جو ذمے داری سونپ کر یہاں بھیجا گیا ہے، تم اس کام سے لگی رہو۔ میں تم سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تمہارا مشن کیا ہے۔!“

چند لمحات تک وہ مجھے ٹٹوتی ہوئی نگاہ سے دیکھتی رہی پھر بے یقینی سے مستفسر ہوئی۔ ”کیا واقعی تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے؟ کیا میری یہ غلطی اسی برف زار میں دفن ہو جائے گی.....؟“

”فی الحال تو میں تمہیں زبان ہی سے یقین دلا سکتا ہوں۔“ میں نے عام سے لہجہ میں کہا۔ ”جب وقت پڑا تو اپنی بات کا مکمل ثبوت بھی پیش کر دوں گا۔“

”تم بہت اچھے ہو.....“ وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تمہیں اپنا دوست سمجھوں؟“

”فریڈ شپ تو ابھی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔  
 ”کل رات تک تو ہم ایک دوسرے کے لیے آہنی (Enemy) یعنی دشمن ہی تھے۔“

”اب چھوڑنا۔“ وہ بڑی ادا سے بولی۔ ”جب دوستی ہوگئی تو پھر ان باتوں کا کیا فائدہ!“



”ہاں، مجھے یہی لگتا ہے کہ وہ ایک یوولکینو ایک بار پھر پھٹ پڑا ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ”اب اسے لاوا اگلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”ہم ایک ایک اور زلزلے پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔“ میں

”یہ تو لگ بھگ ستر سال پہلے کی بات ہے جب یورنیم اور پلوٹونیم کو پہلی بار تباہ کاری اور ہلاکت خیزی کے لیے ایسی بم کی صورت استعمال کیا گیا تھا اور آج تو ایٹمی ریسرچ بہت آگے تک جا چکی ہے۔ اگر میکرو ڈوائسیشن والوں نے اپنی دیوانگی میں کوئی ایسی ویسی حماقت کر دی جس کے نتیجے میں انٹارکٹیکا کی برف گھٹنا شروع ہوگئی تو ہم خود اندازہ لگا لو کہ اس کے کتنے بھیاں تک نتائج دیکھنے کو ملیں

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔

”بھئی، بادل گرے ہیں تو بارش ہوگی۔“ میں۔

اس کی پیٹھ سہلانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کسمپاسی پھر اپنا چہرہ میرے چہرے کے ساتھ لاتے ہوئے بولی۔ ”علیٰ! شاید تمہیں معلوم نہیں، انٹارکٹیکا بارش کا کوئی تصور نہیں۔ منشی، منشی، .... ڈگری سینی گریڈ درجہ

”پچھ بھی ستم نہیں ہونے والا۔ میں نے پر اسے انداز میں کہا۔“ ہمیشہ اچھے کی امید رکھنا چاہیے۔“

”میں اتنی کمزور، اتنی بزدل پہلے بھی نہیں تھی۔“



اس کی نگاہ کی پکار پر فوراً البیک کہتا۔

گم ہوئی تینیدی کی آغوش میں پناہ لے لی۔ اس پناہ میں آکر ہر غم، فکر اور اندیشے کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔

کہتے ہیں، نیند ایسی ظالم ہے کہ یہ تین دنوں پر بھی  
اجاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس  
رات ہم جس نوعیت کے غیر معمولی نامساعد حالات میں  
گھرے ہوئے تھے کہ آنکھ لٹکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا  
تھا مگر ہمارے اعمال کی فہرست اتنی طویل تھی کہ اس کے  
بوجھ نے نیند کی راہ ہموار کر دی تھی۔ ہم تھک کر اس بری  
طرح چور ہو گئے تھے کہ ایسی گہری نیند آئی کہ پھر اگلی صبح ہی  
کی خبر لائے۔

اور یہ خبر کوئی خوشگوار نہیں تھی !.....!

جب ہم نے ہٹ سے باہر جھانکا تو وہاں کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ماحول کے نقشے کی اس تبدیلی نے ہمیں بری طرح چونکا دیا تھا۔ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں موجود بہت سی آکسائیڈ، آکس سلفٹ وغیرہ اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں اور بعض برفانی توودوں کے ساتھ میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہو چکی تھی۔

”یہ..... یہ برف کیسے پگھل گئی.....؟“ کا یا کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

میں نے حکم لے کر جواب دیا۔ ”مجھے تو یہ زیر برف کسی ایسی دھماکے کا شاخسانہ لگتا ہے۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ سیکر ڈاٹیشن والوں نے کسی تجربے نے زیر زمین درجہ حرارت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ برف کو پگھلنے پر مجبور ہونا پڑا۔“

”او مائی گاش.....!“ وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پھر تو یہ ہٹ بھی محفوظ نہیں ہے۔“

آج کل کی نئی پودے گاڑ ڈوگاوش میں بدل دیا ہے۔  
اگرچہ میں بھی اس پودا کا ایک نمائندہ ہوں لیکن ہاتھ نہیں کیوں،  
مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جوان جسم میں کسی  
بوزھی روح نے بسیرا کر رکھا ہو.....!

”یہ ہٹ ابھی تک محفوظ ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ آگے چل کر بھی محفوظ ہی رہے گا۔“ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”وہیے میں ایک بات محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں کی مٹی بہت فضا کے درجہ حرارت میں قدرے کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی لیے ہم کھلے میں کھڑے بڑے آرام سے باتیں کر رہے ہیں.....“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی

”تھینک یو علی۔“ وہ منونیت بھرے لہجے میں بولی۔  
 ”دوستی میں تھینک یو، سوری اور ایلیکسیوز می کی  
 منجائش نہیں ہوتی۔“ میں نے دو لوگ انداز میں کہا۔ ”اپنے  
 مشن کا احوال بیان کرتی جاؤ۔“

”جب تم صحت یاب ہو جاؤ تو اکیس جولائی سے پہلے کسی بھی دن میری نیم کے دیگر افراد اسکر، اولیور اور انیلا مجھے تلاش کرتے ہوئے ادھر آ گئے۔ پھر میں ان کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جاتی۔ تمہیں یہی محسوس ہوتا کہ تمام حالات نارمل انداز میں پیش آئے ہیں اور میرا مشن مکمل ہو جاتا۔“

کایا کی باتوں نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آسکر، اولیور اور آئیلا وغیرہ ہمارے قریب ہی کہیں موجود ہیں؟“

”نہیں!“ اس نے پوری قطعیت سے سر کو نفی میں جھونکا۔ ”انٹارکٹیکا اس کرہ ارض کا سرد ترین حصہ ہے۔ یہ ایک

برف زار ہے۔ یہاں پر موجود میلوں موٹی آئس شیٹ، میلوں طویل آئس شیٹ، ٹنوں، جم رکھنے والے کلیشز اور

سرسر کرنا ممکن ہوتا تو پھر یہ برا عقلم غیر آباد نہ رہتا۔“

”تمہاری وضاحت سے میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ تمہارے ساتھی تمہیں یہاں پہنچانے کے بعد واپس

”ہاں۔ انہیں اسکاٹ بمیں پر ہی قیام کرنا تھا۔“ اس

نے بتایا۔ ”وہ لوگ ایتیس جولائی کو یہاں آتے اور یہی ظاہر کرتے کہ میری گمشدگی سے وہ بہت پریشان تھے۔ پھر وہ

سب اکٹھے جولائی کو واپس کرائسٹ چرچ کے لیے پرواز

بات ختم کر کے اس نے خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

س ڈری سبھی لڑکی پر مجھے بہت پیار آیا۔ میں نے اس کا ڈر کالنے کے لیے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ خود سپردگی

کے انداز میں میرے بدن کا حصہ بن گئی۔ دو زندہ جسموں کے شیزنگ ٹیبلر بچہ نے بحر منجمد جنوبی کی ٹھنڈک کو ٹھکست

رات کے باقی حصے وقفہ وقفہ سے گھن گرج سے

شاہہ گڑگڑا ہٹ سنائی دیتی رہی۔ جب بھی یہ ریت ناک  
آواز ابھرتی، کایا سہم کر سرا سیدہ نظر سے مجھے جھٹکتی۔ میں

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”تم نے پتا نہیں، میرے ساتھ کیا کر دیا ہے.....“

میں نے اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کے پیش نظر تسلی آیز انداز میں کہا۔ ”کیا! تم کہیں نہیں کرو۔ اگر میں نے تمہیں کمزور اور بزدل بنایا ہے تا تو میں ہی تمہارے اندر طاقت بھروں گا۔ تمہاری ساری کمزوری اور بزدلی جاتی رہے گی۔ تم پہلے والی کا یہاں جاؤ گی..... نڈر اور بہادر کا یا!“

”تم نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن میں خود تمہیں بتاؤں گی۔“ وہ میری سنی اُن سنی کرتے ہوئے

اپنی ہی دھن میں یوتی چلی گئی۔ ”تمہیں پتا ہے، میرا مشن کیا تھا؟“

”نہیں پتا.....“ میں نے اس کا نفسیاتی ٹریسٹ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم اپنی زبان سے

”تم سوسائٹی کی نظر میں بہت اہمیت کے حامل ہو۔“

وہ بتانے لگی۔ ”انہیں تمہارا بہت خیال ہے۔ میں ایک تجربہ کار نرس ہوں۔ انہوں نے تمہاری کیئر کے لئے مجھے یہاں

بھج جاتا تھا۔ مجھے ہفتہ بھر یہاں رک کر تمہارا خیال رکھنا تھا۔ جب تمہارا زخم پوری طرح بھر جاتا تو پھر مجھے یہاں سے

اچانک چلے جانا تھا جیسا کہ میں اچانک یہاں آئی ہوں.....

”ڈونٹ وری۔ تم نے پچھلے دو دن میں میری بہت کسر کی ہے اور آئندہ بھی کرنی رہو گی۔“ میں نے قطع کلامی کرتے

ہوئے کہا۔ ”اپنی بات جاری رکھو۔ میں ہمدن گوش ہوں۔“  
موجودہ حالات نے کایا کے ذہن کو بری طرح متاثر

کیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو اعتدال پر لانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیا جائے

اور میں اس پالیسی پر عمل پیرا تھا۔  
 ”میرا کردار ایک سہولت کار ایسا تھا۔“ وہ اپنی بات

کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے مکمل فٹ ہونے تک یہاں قیام کرنا تھا۔ میں نے اس ہٹ پر اپنے قیام کے

لیے جو حال چلی تھی وہ تم نے پکڑ لی۔ تمہیں پتا چل گیا کہ میں نے اس کیسٹ کی مدد سے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش

”گڑے مردے نہیں اکھاڑو۔“ میں نے ایک بار

پھر لقمہ دیا۔ ”اب ہم دوست ہیں اور ہمیشہ اچھے دوست ہی رہیں گے۔“



# بالآخر

## ظفر اقبال ظفر

اس کائنات کی ہر شے کو ایک نہ ایک دن بالآخر اپنے مرکز کی جانب لوٹتا ہے... یہی اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے جسے ہر کوئی باسانی نہیں مانتا جب تک کہ وقت اسے کوئی سبق نہ سکھائے... اسے بھی وقت کی ایک بڑی ٹھوکرنے احساس دلایا کہ وہ مسلسل ایک غلط سمت میں محو سفر تھا۔

**موت سے خوفزدہ ایک مریش کے اذیت ناک خیالات کا اظہار**

”لو بھی شہاب غوری نے بھی اپنا رخت سزا باندھ لیا،  
زندگی کی آخری سانس پوری کر رہا ہے۔“  
”کون شہاب غوری؟“  
”ارے وہی شہاب غوری، کارپوریشن کا چیف انجینئر،  
شراب پی بی کر جگر خراب کر لیا پتا۔“  
”ہاں ٹھیک کہتے ہو، ساری زندگی دو ہی کام کیے ہیں  
اس نے، ٹھیکیداروں سے بیماری رشوتیں لے کر پراپرٹی بنائی یا  
پھر اوپر کی کمائی شراب میں بھائی۔“

”اس دیوبند کی چوٹی کو غور سے دیکھو۔“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو یہ کسی ہوائی جہاز کی دم سے مشابہ لگتا ہے۔“  
”شاید یہ تمہارا وہم ہو۔“ اس نے میری بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ ”انسانی ذہن کو ایسے دھوکے ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر گھرے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر کبھی ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے روٹی کے گالوں سے وہاں مختلف شکلیں بنی ہوئی ہوں۔“  
”یہ میرا وہم ہے یا بھری دھوکا۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”میں اس کلیشیر کو قریب سے دیکھنا چاہوں گا۔ کیا تم میرے ساتھ آ رہی ہو؟“

”میں ہر جنت اور ہر دوزخ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولی۔ ”تم بھی مجھے خود سے ایک قدم پیچھے نہیں پاؤ گے۔“  
رات بھر خوف زدہ رہنے والی وہ پاکٹ سائز بیوزی لینڈر حیدر اس وقت بلا کی خود اعتماد اور ہم جو نظر آ رہی تھی۔ گویا میرے ٹریڈنٹ کے بعد وہ واپس اپنی جون میں آ گئی تھی۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور آگے بڑھنے لگی۔

وہ ننگ سا زبرقانی تودہ اگرچہ ہمیں قریب ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن یہ بھری قریب اس کے دیوبند کی سائز کی بدولت تھی۔ درحقیقت وہ اس برف نگری میں، ہم سے خاصے فاصلے پر ایستادہ تھا۔ میں اور کایا آگے پیچھے اس کلیشیر (برقانی تودے) کی سمت قدم بڑھا رہے تھے۔

میری رفتار کایا کی بہ نسبت قدرے زیادہ تھی لہذا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارے بیچ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا تاہم میں وقفے وقفے سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا اور مطمئن ہونے کے بعد پھر آگے بڑھنے لگتا تھا۔

ہم نے یہ مشکل وحاشی تین سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کایا کی گھبراہٹ ہوئی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ”علی... فوراً دھر آؤ۔“ برف نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں... یہاں کی برف بہت نرم ہے۔ پلیز، میری مدد کرو۔“

کایا کی مصیبت زدہ پکار نے میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے فوراً سے پیشتر اس کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان لحظات میں میرا ذہن صرف ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا کہ مجھے کسی بھی صورت کایا کو برف میں دھنسنے سے بچانا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے میں بھی اسی راستے سے گزر کر آیا تھا اور میں نے اس برفیلی زمین کو چٹان کی طرح سخت پایا تھا پھر یہ اچانک وہاں کی برف نرم کیسے ہوئی تھی؟ اس ”کیسے؟“ کا جواب بھی میرے ذہن میں موجود تھا۔ اس برف زار خطے میں انجی تک جو کچھ ہو چکا تھا، اس کی روشنی میں مزید بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

”علی... پلیز، جلدی کرو۔“ میرے شو ز برف کے اندر دھنس چکے ہیں۔“ کایا کی فریاد نے میرے دل پر گھونسا رسید کیا۔ ”اور میں بھی اس برفانی دلدل کے اندر اتر رہی ہوں۔“

ہمارے بیچ یہ مشکل میں گز کا فاصلہ تھا لیکن اگلے ہی لمحے یہ فاصلہ تین صدیوں کی دوری تک پھیل گیا۔ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے کایا کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا، میں برف کی سخت سطح پر نہیں دوڑ رہا بلکہ کسی سوئنگ پول میں تیر رہا ہوں۔ سینکڑوں دوسروں جیسے میں میرا جسم گردن تک بھر بھری برف کے اندر دھنس گیا۔

یہ سب کچھ آنا فانا میں ہو گیا تھا۔ مجھے سوچنے بچھنے کا موقع ملتا تھا اور نہ ہی اپنا بچاؤ کرنے کی مہلت۔ میں بے رحم بھر بھری برف کے تادیدہ شکنے میں گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور پورا دھڑ زبر برف جا چکا تھا، صرف گردن باہر تھی اور وہ بھی کسی کلیشیر کے مانند سلاخ کرتے ہوئے رفتہ رفتہ برفیلے دفن کی طرف بھڑکتی۔

یہ میری زندگی کے سب سے زیادہ لاچار لحظات تھے۔ میری دوست کایا... چند قدموں کے فاصلے پر مجھ سے زندگی کی چھبک مانگ رہی تھی اور میں اس کے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بج بستی بھر بھری برف نے میرے پورے جسم اور میری سوچ کو منطوق کر کے رکھ دیا تھا۔

دفعۃ میری ساعت اور بصارت نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں مکمل طور پر زیر برف جا چکا تھا۔ میرے دماغ نے جو آخری سنٹل دیا، وہ یہ تھا۔  
”اسد علی! کلمہ پڑھ لو۔ تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔“

امنگون حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں





شہاب غوری کے حلقہ احباب میں یہ تذکرے عام تھے اور وہ خود "لائف ہاسٹل" کے پرائیویٹ روم میں واقعی زندگی اور موت کے درمیان خوف اور ایویسی کی چادر اوڑھے پڑا تھا۔ شہاب غوری کی سرکاری نوکری ابھی جاری تھی۔ ابھی اس کی عمر نے پچاس کا ہندسہ ہی عبور کیا تھا۔ اب تک کی سروس میں اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی تھی۔ زیادہ اولاد کا جنجنٹ اس نے نہیں پالا تھا۔ دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی رباب اور چھوٹا بیٹا عبدالوہاب، رباب نے شوقیہ طور پر ڈریس ڈیزائننگ کا ڈبلو ماکیا تھا۔ شہاب غوری نے اس کی شادی اپنی بہن کے بیٹے ڈاکٹر حسن بھٹی سے کر دی تھی۔ حسن بھٹی نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ ایف سی بی ایس مکمل کیا اور اب وہ شہر کا ایک معروف میڈیکل اسپیشلسٹ فزیشن تھا۔

شہاب اپنے بیٹے عبدالوہاب کو پروفیشنل تعلیم دلا کر اپنی طرح کماؤ پوت بنانا چاہتا تھا لیکن عبدالوہاب اپنے باپ کے برعکس شروع سے ہی نماز روزے کا پابند اور بنیاد مزارع لگا تھا۔ اس نے باپ کی منشا کے بالکل الٹ اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری حاصل کی اور میرٹ پر لیکچرار بھرتی ہو گیا۔ ان دنوں عبدالوہاب ایک مقامی کانچ میں اسلامیات کا لیکچرار تھا۔ شہاب غوری اپنے معاملات کے سبب جتنا بدنام تھا، عبدالوہاب اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے اتنا ہی نیک نام ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ بعض عزیز رشتے دار تو فرعون کے گھر میں موسیٰ والی مثال دے کر باپ بیٹے کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

ابھی ریٹائرمنٹ تک شہاب غوری نجانے کتنی دولت اور سمیتا کر چاٹک اس کا جگر جواب دے گیا اور اب شہاب غوری کی کتاب زندگی کے آخری اور اقی موت کے ہولناک اندیشوں کے درمیان پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"لائف ہاسٹل" شہر کا مہنگا ترین اسپتال تھا۔ غریب تو دور کی بات، سفید پوش لوگ بھی اس اسپتال کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ اس اسپتال کے ڈاکٹروں کی بیماری فیسوں کے علاوہ ضروری اور غیر ضروری میڈیکل ٹیسٹ اور ایگزامز کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن شہاب غوری کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کا داماد ڈاکٹر بھٹی ابھی سرکاری ڈیوٹی کے بعد اس پرائیویٹ اسپتال کا بڑا فزیشن تھا چنانچہ آٹا فانا شہاب غوری کو ابتدائی طبی مراحل سے گزار کر پرائیویٹ روم میں پہنچا دیا گیا اور اسپتال کے پورے عملے کو اہل کر دیا گیا۔

☆☆☆

گزشتہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی رات تھی کہ دوستوں

نے شہاب غوری کو نصف شب کے قریب مکمل مدھوشی کی حالت میں اس کے گھر پہنچایا تھا۔ شہاب کی بیوی سائرہ فزیشن کی مرلینسٹی کی جوانی دو سال لے کر بے خبری کی فینڈسوری تھی تاہم عبدالوہاب دیر تک مطالعہ کرنے کی عادت کے سبب جاگ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی سے نوشی کی عادت سے واقف تو اچھی طرح تھا لیکن ایسی تشویش ناک حالت میں اس نے باپ کو پہلی بار دیکھا تھا چنانچہ وہ گھبرا گیا اور اس نے اپنی ماں کو جگانے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ڈاکٹر بھٹی کو اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر بعد شہاب غوری کو لائف اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں جان لیوا خاموشی تھی۔ شہاب غوری بستر پر دراز تھا اور سامنے نظر آنے والے تشویش زدہ چہرہ کو اب اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے تنگ رہا تھا۔ اس کے پیٹ کے اطراف میں اس کی بیوی سائرہ، بیٹی رباب، داماد ڈاکٹر بھٹی اور بیٹا عبدالوہاب اسے شکر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں کہاں ہوں، مجھے کیا ہوا ہے؟" شہاب غوری کی لرزتی ہوئی آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔

"مدھوشی کی حالت میں آپ کو خون کی ائی آئی تھی اور پھر فوری طور پر آپ کو یہاں لایا گیا۔ آپ اس وقت اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ہیں۔" عبدالوہاب نے بھرتی ہوئی آواز میں وضاحت کی۔

بیڈ کے سائڈر ایک پر کبھی ہوئی بھاری فائل افکار ڈاکٹر بھٹی نے صفحے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "ماموں جان! آپ کا جگر..... بڑی تیزی سے خراب ہو رہا ہے۔ اسکریننگ ٹیسٹ سے پتا چلا ہے کہ آپ کو ہپاوائزل ہے اور پھر الٹراساؤنڈ اور پی آر ٹی کے پورٹس نے یہ ثابت کر دیا کہ..... ہپاوائزل نے آپ کے جگر کو خاصی حد تک متاثر کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی آخری اسٹیج نہیں آئی ورنہ لیور ٹرانسپلانٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، ویسے اب بھی آپ بارڈر لائن پر ہیں۔"

"اف! میرے خدایا....." شہاب نے سامنے دکھائی دینے والی موت سے نظریں چرا کر آنکھیں موند لیں۔

"رباب! بولنے دو اپنی ماں کو، سائرہ کو غصہ کرنے کا تو حق ہے بیٹا۔" شہاب کے حلق سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔

اب اسے رورہ کر وہ شب دروز یاد آ رہے تھے جب اس نے اس بڑی عادت پر سائرہ اس سے لڑتی جھگڑتی تھی۔ کئی کئی دنوں کے لیے روکھ جاتی تھی مگر وہ کسی کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس کے دھندلائے ہوئے ذہن کے پردے پر ایک اور منظر ابھر رہا تھا جب ایک رات وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا تھا اور اوپر کمرے کی طرف جاتی سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے گرنے کو تھا کہ عبدالوہاب نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے تھام لیا تھا اور ڈرتے ڈرتے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

"ابو! اس حرام چیز کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے جو انسان کو سیرجیوں سے بھی گرا دیتی ہے اور..... نظروں سے بھی....." "تیرا..... چپ رہو، تم اپنے بچہ پر کان کے بچوں کو دیا کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ مجھے بچہ دیتے ہو، مجھے؟"

ہاں، یہی کہا تھا شہاب غوری نے اور عبدالوہاب کے بازوؤں کو جھٹک کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ آج عبدالوہاب سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا شہاب کے اندر۔ شاید موت کے خوف نے اسے اعصابی شکست دے دی تھی۔

"ماموں جان! اگرچہ آپ کا کیس پیچیدگی کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے مگر پھر بھی..... ہاں، میں نے اپنے سینکڑوں سے ڈسکس کیا ہے آپ کا کیس اور ان سے ایکسپرت اوپٹین بھی لی ہے۔ آپ کا علاج شروع ہو گیا ہے۔ ہم سب پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر بھٹی نے بے ربط سے جملوں میں شہاب کو تشویش ناک بیماری سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میری بیماری قابل علاج تو ہے نا؟"

سکیاں گونج اٹھیں۔

☆☆☆

شہاب غوری سے عام ملاقات پر پابندی تھی۔ دفتری عملے کے ساتھی، دوست احباب کی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف عبدالوہاب، سائرہ اور رباب باقاعدگی سے صبح و شام آتے تھے۔ سرکاری اسپتال سے چھٹی کے بعد ڈاکٹر بھٹی مستقل طور پر رات بارہ بجے تک ہر دو گھنٹے بعد شہاب کے روم کا وزٹ کرتا تھا..... اس روم کے لیے ایک تجربہ کار نرس کی سربراہی میں باقاعدہ نرسنگ اسٹاف تعین کر دیا گیا تھا۔

علاج کی بہترین سہولیات کے ساتھ ساتھ شہاب کی خوراک کا بھی خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ کھانے میں زیادہ تر پھلوں کا جوس اور زود ہضم مقوی غذا شامل تھی۔ صبح و شام دوا کھلانے کی ذمہ داری نرسنگ اسٹاف کے سپرد تھی۔ گیٹ پر موجود وارڈ بوائے کو سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی اجنبی اور غیر متعلقہ شخص کو کمرے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

شہاب غوری کا بیشتر وقت تنہائی کی صلیب پر گزرتا تھا۔ اگرچہ صبح و شام کمرے اور رابرداری میں ٹھٹھکی کی اجازت تھی اور ہدایت بھی کر دی گئی تھی مگر موسمی مرض کے احساس اور موت کے خوف نے شہاب کو بستر تک محدود کر دیا تھا۔ اسے موبائل فون رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اسپتال سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ شہاب اس سے بالکل بے خبر تھا۔ جگر کے موسمی مرض نے اسے دفتری کچنگاہ آرا زندگی اور دوستوں کی بارون محفلوں سے الٹا کر اسپتال کے سسٹنٹاتے ہوئے بیمار ماحول میں لاکر رکھ دیا تھا۔ موت کے ٹاڈیہ سائے شہاب کو ہر وقت اپنے وجود پر منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ سوچتے سوچتے ایک دن اس کا دھیان دفتر کے ہیڈ کلرک رؤف احمد کی طرف چلا گیا جو پچھلے ہی سال جگر کے کیسر میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ صرف تین ماہ کے اندر اندر پہاڑ جیسے وجود کا حامل رؤف احمد دیکھتے ہی دیکھتے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

شہاب نے خوف سے جگر جھری لی۔

اب دھیرے دھیرے اسے شراب سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ شاید موت کے خوف کے باعث ایسا ہو رہا تھا لیکن سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا آئے.....

ایک شام حسب معمول عبدالوہاب باپ کی مزاج پر سی کے لیے آیا تو گھر سے لائی ہوئی جائے نماز اس نے بیڈ کے سرہانے کی طرف رکھی ہوئی تپائی پر رکھ دی۔ عبدالوہاب نے اس بات کو کچھ کھانا سنایا البتہ باپ کے سرہانے جائے نماز رکھنا ہی اس بات کا اشارہ تھا کہ اب شہاب غوری کو خلوص دل کے

اگست 2018

189

سنسنی دہانجسٹ

اگست 2018

188

سنسنی دہانجسٹ



ساتھ اللہ کی طرف رجوع کر لیتا چاہیے۔ شہاب نے جائے نماز دیکھ لی تھی اور یہ احساس اس کے دل میں بھی چٹکی بھر چکا تھا کہ زندگی موت کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اسے اب یقیناً اپنے معبود کے سامنے سربسجود ہو کر گڑگڑانا چاہیے۔ ممکن ہے اس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی موت اپنی پیش قدمی روک دے۔ ممکن ہے کہ اس کی توبہ خدا کے ہاں قبول ہو جائے اور اس کی بے ترتیب الجھتی ہوئی سانسوں میں نئی زندگی کا سلیقہ پھر سے لوٹ آئے۔

عبدالوہاب ڈبڈبی آٹھوں سے باپ کو دیکھتا رہا، حوصلہ دیتا رہا اور زیر لب دعا میں کرتا رہا اور پھر یوں جمل قدموں کے ساتھ گھر واپس چلا گیا۔

شہاب غوری اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اپنے وجود کی تنہائی سے لڑنے کے لیے اکلیارہ گیا۔ اسے ہر لمحہ احساس زیاں تانے لگا تھا۔ عداوت اس کے قلب و احساس میں بل کھانے لگی تھی۔ کبھی سلیقہ مند بیوی اور وفادار شریک حیات سائرہ کا غزوہ چہرہ و آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا اور بھی ارباب اور عبدالوہاب کی دھمی اور معصوم صورتیں لگا ہوں کے سامنے آ کر ٹھہر جاتیں۔ اب شہاب غوری کو اپنی زندگی کے ان تمام شب و روز اور آلودہ مناظر سے کھن آنے لگی کہ جنہوں نے اسے آج موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد نرس اس کا بلند پریش اور نمبر پچھ لینے آئی تو وہ بھی گھبرا گئی اور شہاب غوری کا چارٹ اٹھا کر لائے قدموں واپس چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد کمرے میں ڈاکٹر جیجی اور ایک سینئر ڈاکٹر ممتاز جیجی موجود تھے۔

”دیکھیے شہاب غوری صاحب! آپ لیور کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ کی تمام میڈیکل رپورٹس میں دیکھ چکا ہوں۔ خاص طور پر لیڈ و سن سٹی اسٹین کی رپورٹ نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ آپ اپنی بلانوسی سے اپنا جگر کافی حد تک خراب کر چکے ہیں۔ اب لیور کو مزید نقصان پہنچانے کی کوئی گمنامش موجود نہیں ہے۔ یاد رکھیے، شراب کا ایک قطرہ موت کی جانب آپ کا ایک اور قدم بڑھادے گا۔“

ڈاکٹر ممتاز جیجی نے نہایت ٹھہراؤ کے ساتھ گلی پٹنی کے بغیر شہاب کے سامنے حقیقت رکھ دی۔

شہاب غوری کے کا سر اظہار میں رکھا ہی کیا تھا کہ وہ جواب دیتا۔ بس دھندلائی ہوئی نظروں سے بے بسی کی تصویر بنا چیت کی جانب دیکھتا رہا اور باقی ماندہ زندگی پھسل پھسل کر اس کی آنکھوں سے رتی رتی رہی۔

دونوں ڈاکٹر کمرے میں موجود نرس کو ضروری ہدایات

دے کر واپس چلے گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ شہاب غوری چپ چاپ بستر سے اتر اتر اور ابٹلی کے ساتھ واش بشن کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد دشوکر کے وہ عبدالوہاب کی لائی ہوئی جائے نماز بچا کر اپنے معبود کے آگے سربسجود تھا۔ توبہ اور استغفار کے الفاظ بے ساختہ اس کی زبان سے جاری تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اپنی مدہوش خطاؤں کے لیے خدا کے حضور معافی طلب کرتا رہا۔

بیڈ کے قریب قدم کھڑکی کے اس پار مسجد کے میناروں سے اذان فجر کی بیدار کن آواز آرہی تھی۔ شہاب کو اس بات کی خوشی تھی کہ آج وہ برسوں بعد نماز فجر ادا کرے گا۔

شام ڈھلے سائرہ اور باب شہاب غوری کے پاس بیٹھی تھیں اور بیٹھکی آنکھوں کے ساتھ اس کی فحارس بندھارہی تھیں۔

آج شہاب پہلے کی طرح مضطرب نہیں تھا۔ توبہ اور استغفار نے اس کی روح کو کسی قدر پرسکون کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جیجی کے آخری راز و نیاز کے کچھ دیر بعد سائرہ اور باب گھر چلی گئیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور باہر راہداری میں دور تک سنا تھا۔

شہاب نے بیڈ پر کروٹ لی اور سونے کی غرض سے آنکھیں موند لیں۔ اسی اثنا میں وارڈ بوائے اٹھا اور گیلری کے اختتام پر واقع واش روم کی طرف چل دیا۔

اجانک ایک اجنبی شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اجنبی شخص کے قدموں کی آہٹ سے چونک کر شہاب نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ بیڈ کی طرف بڑھا تو فوراً ہی شہاب نے پہلو بدلا۔ سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔

شہاب نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ ”کون ہو تم؟“

کمرے میں گھسے آئے۔ وارڈ بوائے کہاں ہے۔

”وارڈ بوائے واش روم گیا ہے۔ میں ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔“ اجنبی نے دبے انداز میں سرگوشی کی۔

”لیکن تم کون ہو اور کیوں آئے ہو؟“ شہاب کے لہجے میں تشویش تھی۔

”آپ سے غالباً موبائل فون بھی لے لیا گیا ہے۔ اس لیے آپ کا اپنے دوستوں سے رابطہ نہیں ہے۔ مجھے آپ دوست ملک شہریار نے بھیجا ہے۔“ اجنبی نے مختلہ انداز میں جواب دیا۔

”ملک شہریار نے، مگر کیوں؟“ شہاب غوری کا ماتھا

لڑکا۔

”غوری صاحب! آپ کا بہت خیال ہے آپ کے اتنوں کو۔ ملک شہریار نے آپ کے لیے واڈ کا بھیجی ہے۔“

اجنبی نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھٹی کی یوٹ لالی۔

”کیوں بند کرو۔ دفع ہو جاؤ۔ لے جاؤ یہ زہر، مجھے نہیں پتا ہے۔“ شہاب پوری قوت سے دہاڑا۔

اجنبی بدحواس ہو کر لائے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

غصے کی وجہ سے شہاب کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اسی اثنا میں وارڈ بوائے کمرے میں داخل ہوا۔ وارڈ

بوائے کے چہرے پر ہلکا ہٹ کے آثار نمایاں تھے۔

”صاحب! کون تھا؟ آپ کس کو ڈانٹ رہے تھے؟“ وارڈ بوائے نے مؤدب انداز میں پوچھا۔

”بس تھا کوئی، چلا گیا۔ خیال رکھنا آئندہ کوئی اجنبی کمرے میں داخل نہ ہو۔“

”ایسا ہی ہوگا صاحب۔“ وارڈ بوائے تائید میں سر ہلا کر

دینا اور رات کی گردش میں وقت پر لگا کر اتر اتر اور تین ماہ کر گئے۔ شہاب غوری کو ایک بار پھر مختلف میڈیکل ایگزامز کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ رپورٹس کیسی آئی تھیں، مرض کی صورت حال اب کیسی تھی، جگر کی خرابی پر کس حد تک قابو پایا گیا تھا، شہاب اس سے بے خبر بھی تھا اور سراپا سوال بن کر زندگی اور

موت کی بارڈر لائن پر پڑا تھا۔

آج سائرہ، رباب اور عبدالوہاب ایک ساتھ آئے تھے۔

”ابو! کل آپ کو اسپتال سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے۔“ عبدالوہاب کے لہجے میں کسی قدر اطمینان تھا۔

شہاب نے خوشگوار حیرت سے تیوں کی طرف دیکھا۔

”ہاں ابو! آپ کا علاج شاید مکمل ہو گیا ہے۔ جیجی کہہ رہے تھے کہ کل آپ کو چھٹی دے دی جائے گی۔“

رباب نے مسکراتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

اب شہاب کی نظر سائرہ سے ملی۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسپتال اور گھر کا درمیانی فاصلہ سیٹھا۔

”شہاب! کل سے اپنے گھر میں رہو گے تم، ہمارے درمیان۔“ سائرہ نے شہاب کی پیشانی پر ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر اگلے روز شہاب غوری کو اسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا۔

شہاب نے اپنی مرضی سے مجھے کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دے کر طویل رخصت لے لی۔

شہاب کے اس اقدام پر سب حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

”چلو، اب تمہارے ابو گھر میں آرام کر رہے گے اور ہمارے درمیان وقت گزرا رہے گے تو عبدالوہاب کی ذہن لانے میں مجھے آسانی ہو جائے گی۔“

سائرہ نے رباب سے ہنس کر کہا تو پاس بیٹھا عبدالوہاب سر جھکا کر ہار نکل گیا۔

شہاب غوری اب بدل چکا تھا۔ ایک خوشگوار مثبت تبدیلی تھی جو شہاب کی عادات و اطوار اور معمولات سے جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنے تمام سے فحاش دوستوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

دفتر کے دو چار بھلے مانس ساتھی تھے جو شہاب سے ملنے گھر آ جاتا کرتے تھے۔ زبان طالب علمی میں شہاب کو مطالعے کا شوق ہوا کرتا تھا اس نے اپنے بیٹے عبدالوہاب سے اپنی پسندیدہ تاریخی، ادبی اور دینی موضوعات کی کتابیں منگوا لیں۔

ایک دن شہاب غوری اپنی ذاتی الماری سے چنیزیں نکال کر اسز نو ترتیب دے رہا تھا کہ اس کی نظر اپنی میڈیکل فائل پر پڑی اور..... بے اختیاری طور پر اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ پہلے تو اس فائل کو چومتے ہی شہاب کو گھبراہٹ سی آئی پھر یونہی کسی خیال کے تحت اس نے فائل میں لگے کاغذات کو دیکھنا چاہا۔

شہاب غوری کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

فائل میں رنگ برنگے سادہ کاغذوں کو تہ در تہ بڑی نفاست سے لگا یا گیا تھا۔ شہاب نے تجسس انداز میں کاغذوں کو دونوں جانب سے الٹ پلٹ کر دیکھا کہ کاغذ پر ایک حرف تک نہیں لکھا ہوا تھا البتہ کاغذوں..... کے سج میں خاک

رنگ کا ایک لقاؤ دبا ہوا تھا۔ شہاب نے کاغذوں کے درمیان سے وہ لقاؤ نکالا اور اسے میز پر الٹ دیا۔

ایک بار پھر شہاب شدید حیرت سے دوچار ہوا۔

میز پر شہاب غوری کی اپنی تصاویر پڑی تھیں۔ ان تصویروں میں شہاب مختلف کیفیات سے دوچار تھا۔

اسپتال کے بیڈ پر، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بیٹھے ہوئے۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے، شدید اضطراب

191

اگست 2018ء



## یتیم

### شرعباس

مغربی معاشرے میں جہاں بہت ساری برائیاں موجود ہیں وہاں کچھ ایسی انوکھی اچھائیاں بھی فعال ہیں جن کے اثرات وہاں کے باشندوں کی معمولی سی زندگی کو بھی بہت غیر معمولی بنادیتے ہیں۔ وہاں یتیموں کے لیے حکومت نے بہت اچھے قوانین بنائے ہوئے ہیں۔ انہی قوانین کے تحت وہ چاروں بھائی جو یتیم ہو چکے تھے کس طرح خوبصورت اور کارآمد زندگی کی طرف لائے گئے، اس کا احساس زیر نظر تحریر پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

کمی نہ چھوڑے رائے رشتوں کی جدائی اور احوال



کہ ہم لڑ رہے ہیں۔ لہذا وہ دونوں کو پکڑ کر لے گئے اور جیل میں بند کر دیا۔ صبح سویرے جیلر آگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے گا لیکن اس نے کوٹھری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کرخ آواز میں بولا۔

وہ جیل میں میرا پہلا دن تھا۔ گزشتہ شب میں نے نئے میں چور ایک راہ گیر کو لوٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے اس مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ ہم آپس میں دست درگیاں تھے کہ گشت پر مامور پولیس والے آگئے۔ وہ سمجھے

بتایا گیا تھا اور پھر میں تین ماہ داخل رہا ہوں اسپتال میں..... شہاب کے لہجے میں بھرپور الجھن کا تاثر تھا۔  
”بس یہیں سے جتنی اور عبدالوہاب کا منصوبہ شروع ہوتا ہے۔“

رباب نے لاڈ بھرے انداز میں باپ کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر عبدالوہاب نے نہایت سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

”ابو! ایہ ہم لوگوں کا بڑا المیہ ہے کہ ہم خدا کے خوف سے برائی کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے لیکن اگر ہمیں موت سامنے دکھائی دینے لگے تو پھر ہم..... موت کے ڈر سے برائی کو چھوڑنے کی ہمت کر لیتے ہیں اور برائی چھوڑنے پر بہر صورت تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ نشہ آور تمام چیزیں حرام ہیں اس کے باوجود ہم ان چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن تصور کرتے ہیں لیکن اگر ڈاکٹر ہمیں یہ بتا کر خوف زدہ کر دے کہ فلاں چیز کے استعمال سے ہمارے جسم کا ایک اہم حصہ ناکارہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ہم موت کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ہم..... جس چیز کے حد درجہ عادی ہو چکے ہیں اسے چھوڑنے کی پوری کوشش کریں گے اور پھر کامیاب ہو جائیں گے۔ کاش! خطرہ مرگ سے زیادہ ہم لوگ خوف خدا کو اہمیت دیتے۔“

آخری جملے پر عبدالوہاب کی آواز جذبات کی شدت سے بھر اگئی۔ اس دوران بے اختیاری طور پر شہاب غوری کی نظریں اپنی تصاویر میں پھلتی رہیں۔

”ماموں جان! ہم نے نیک نیکی کے ساتھ آپ کو اسپتال میں داخل کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ جگر کی خرابی اور میڈیکل رپورٹس کی تشویش پھیلانا ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔ اسی لیے آپ کو خصوصی نگرانی میں رکھا گیا اور آپ کے کمرے میں خفیہ کیمرے نصب کیے گئے تاکہ..... آئی ایم سوری ماموں جان! ہم آپ کی بدلتی ہوئی کیفیات کا پورا مشاہدہ کرتے رہے ہیں اور ہاں آپ کی آزمائش کے لیے اس اجنبی کا کردار بھی فرضی تھا۔“

ڈاکٹر جتنی نے منصوبے کی باقی جزئیات بھی بیان کر ڈالیں۔

شہاب غوری کی نظریں مسلسل اپنی تصاویر میں بیچک رہی تھیں اور پھر ایک تصویر پر شہاب کی نظر کچھ دیر تک جمی رہی۔ تصویر میں شہاب پورے انتہاک کے ساتھ اپنے معبود کے حضور دعائیں مصروف تھا۔

کے عالم میں اپنے بال نوچتے ہوئے اور پھر جائے نماز پر سجدہ ریز ہوتے ہوئے۔

اچانک ایک اور تصویر پر نظر پڑی۔ یہ وہی اجنبی شخص تھا جو اچانک ایک رات کمرے میں آگیا تھا۔

ایک تصویر میں وہ اپنی واڈ کا کی بوتل کوٹ کی اندرونی جیب سے نکال رہا ہے۔ دوسری تصویر شہاب کی جھنجھی جس میں شہاب کے چہرے پر شدید غصہ نمایاں تھا۔

شہاب کا داغ چکرا گیا۔  
”یہ سب آخر کیا ہے؟“

☆☆☆

”یہ سب آخر کیا ہے؟“  
شام کو لاؤنج میں بیٹھے ہوئے شہاب نے سب کے سامنے قائل لہراتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

”یہ عبدالوہاب، ڈاکٹر جتنی، یہ کیا ہے؟“  
سوال سن کر پہلے تو سب نے ہم کر شہاب کے چہرے سے نظریں چرائیں پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

شہاب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔  
”میں پاگل ہوا ہوں یا تمہارا داغ چل گیا ہے؟“

شہاب غوری نے غصے سے تھماتے ہوئے پوچھا۔  
”ابو! خدا! خواست آپ پاگل نہیں ہوئے۔ بس کچھ ہم نے اپنا داغ چلایا تھا، مطلب ہے داغ لڑایا تھا۔“

عبدالوہاب نے سادگی سے جواب دیا اور پھر سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں کچھ نہیں سمجھا۔“  
شہاب کی آواز میں بے چینی اور بے بسی تھی۔

”ماموں جان! آئی ایم سوری، دراصل یہ میرا اور عبدالوہاب کا مشترکہ منصوبہ تھا۔“  
”منصوبہ! کیا منصوبہ؟“

شہاب کی حیرت اب دو چند ہو گئی۔  
”اصل قصہ میں بتانی ہوں۔“ سارہ نے پرسکون لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

”جب اس رات آپ کے دوست آپ کو مدہوشی کی حالت میں گھر چھوڑ کر گئے تھے تو آپ کو خون کی آٹی ہوئی تھی۔ عبدالوہاب نے فوری طور پر جتنی..... کو بلا لیا اور یہ دونوں آپ کو اسپتال لے گئے۔ وہاں آپ کو ابتدائی طبی امداد دے کر قمارغ کر دیا گیا کیونکہ کوئی ایسی فکر مندی کی بات نہیں تھی۔“  
”فکر مندی کی بات نہیں تھی؟ لیکن مجھے تو جگر کا عارضہ



”میں اس کی بات کر رہا ہوں جس نے مجھے گود لیا تھا۔“  
 ”چرچڑ اسپاسٹر اور تم نام اسپاسٹر ہو۔“  
 ”ہاں۔ میں اور میری بیوی ڈورجی اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ لگتا تھا کہ خدا کی مرضی نہیں ہے۔“  
 ”کیا تم نے بھی کوئی پیغمبر گود لینے کے بارے میں سوچا؟“  
 میں نے یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی لیکن وہ سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”ہاں۔ میں نے اس بارے میں سوچا تھا لیکن ڈورجی نے کوئی دیکھی نہیں لی۔ اسے یقین تھا کہ خدا ہماری ضرورت سے گوارا دینا ایسا ہوا، گو کہ اس میں کچھ وقت لگا۔“  
 وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جب میرا بیٹا پیدا ہوا اور میں نے اسے پہلی بار گود میں لیا، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ خاندان کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی تلاش کرنا چاہیے۔“  
 میں نے کافی قسم کرتے ہوئے کہا۔ ”نام! میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کاش تمہارا بیٹا کئی سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا۔“  
 مجھے یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ نام شہر کے بہترین ہوٹل میں ٹیبلر ہوا تھا اور میرے لیے اس سے بھی زیادہ متاثر کن بات یہ تھی کہ کلرک نے مجھے دیکھ کر تاک نہیں چڑھائی۔ یقیناً اس ہوٹل میں بھی کوئی ایسا گاہک نہیں آیا ہوگا جس نے گزشتہ رات جنیل میں گزاری ہو اور اس سے پہلے سونے کے لیے ٹھکانا ڈھونڈنا پھرنا تھا۔  
 وہ ہلکے صرف اتنا جانتا تھا کہ میں یعنی مسٹر فیملی، مسٹر اسپاسٹر کا دوست ہوں۔ اس نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں تمہارے برابر والا کمراد سے ملتا ہوں۔“  
 ”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ کیا تم مسٹر فیملی کے کپڑوں کی فوری دھلائی کا بندوبست کر سکتے ہو، جب یہ غسل کے لیے جائیں۔ ان کا سامان آنے میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔“  
 میزبیاں چڑھتے ہوئے مجھے پکڑ آ رہے تھے۔ چند گھنٹے پہلے میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وقت پر جنیل سے باہر آ جاؤں تاکہ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ پیسے چراسکوں اور اب میں ماربل کی میزبیاں چڑھ رہا تھا۔ واقعی آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ میں کس دنیا میں آ گیا تھا؟  
 میں نے اپنے بھائی سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“  
 میں نے ایسا ہوٹل پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ

میں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ لگ رہا تھا کہ میں پر لوں کے دیس میں آ گیا ہوں۔ میں نے اپنے کپڑے بیدروم کے فرش پر ڈالے اور ہاتھ روم کا کل کھول دیا۔  
 ابھی تک میرا سر جکڑا ہوا تھا۔ بچپن میں ہمیشہ بھائی میرے دماغ میں رہتے تھے۔ میں نے انہیں ایک عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے مجھے امید نہیں تھی کہ ان سے دوبارہ مل سکوں گا۔ نام اب امیر آدمی بن گیا تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے بھائی نے بھی کسی امیر لڑکی سے شادی کر لی ہو۔ ایک میں ہی رہ گیا جس کا نہ کوئی ٹھکانا تھا اور نہ کوئی مستقبل۔  
 دروازے پر دستک ہوئی تو میں بھی اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ ”ایک منٹ.....“ میں نے کہا اور اپنے جسم کے گرد تولیہ لپیٹ کر دروازہ کھولا سا کھول دیا۔ سامنے نام کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوٹل والوں نے تمہارے لیے کچھ کپڑے بھیجے ہیں۔ جب تمہارے کپڑے دھل کر آ جائیں تو یہ واپس کر دینا۔ ہم بعد میں تمہارے لیے نئے کپڑے خرید لیں گے۔“  
 مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“  
 میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں کیا پہنوں گا اور یہ کہ وہ جو کچھ میرے لیے پسند کرے گا وہ میں قبول کر لوں گا۔ میں اس کا پتھر ہوا بھائی تھا یا تنہا دار ملازم؟  
 ”میں شروپ کی بوتل بھی لایا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”گنڈا امیر کے لیے ایک گلاس بناؤ۔“ یہ کہہ کر میں نے وہ کپڑے پہن لیے جو میرے لیے ہوٹل کے کسی ملازم سے ادھار لیے گئے تھے۔ بہر حال وہ صاف ستھرے کپڑے تھے اور میرے جسم پر فٹ آ گئے۔  
 اس کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز بھی تھی۔ اس نے بوتل اور گلاس میز پر رکھے اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو میں نے کہا۔ ”اب بتاؤ۔ تم فیملی سے اسپاسٹر کیسے بن گئے؟“  
 اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں وہ آدمی یاد ہے جو مجھے ٹرین سے اپنے ساتھ لے گیا تھا؟“  
 مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ ٹرین اپنے پہلے اسٹاپ پر رکی۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تمام بچے جن میں زیادہ تر لڑکے تھے اور ان کی عمریں دو سے سترہ سال کے درمیان تھیں، پلیٹ فارم پر قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ گاہک جن میں زیادہ تر کسان اور ان کی بیویاں تھیں، پلیٹ فارم کی دوسری طرف کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے گرد آلود

اور تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک آدمی نے ان کے سامنے تقریر کی اور انہوں نے ہمارا معاملہ شروع کر دیا جیسے فروخت کے لیے لائے گئے ٹھکانوں کا کیا جاتا ہے۔  
 جی نے روننا شروع کر دیا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے دیکھا کہ نام سیاہ سوٹ میں ملبوس کسی آدمی سے باتیں کر رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس شخص نے قہقہہ لگایا اور نام کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا پھر وہ دونوں وہاں سے چل دیے۔ میں نے جی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پیچھے جانا چاہا لیکن ٹرین کے ایک آدمی نے ہمارا راستہ روک لیا اور بولا۔ ”اپنی باری کا انتظار کرو۔“  
 ”وہ نام کو کہاں لے جا رہے ہیں؟“ جی نے پوچھا۔  
 ”اس کے نئے گھر۔“  
 ”کیا ہم بھی اپنے نئے گھر جائیں گے؟“

☆☆☆

”چرچڑ اسپاسٹر وہیں میگر تھا۔“ نام نے مجھے بتایا۔  
 ”اس کے علاوہ ڈاؤن کونسل کارکن بھی تھا اور وہاں صرف ان کی نمائندگی کرنے آیا تھا۔ وہ کسی لڑکے کو ساتھ لے جانے نہیں آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے دیکھ کر اس کا ارادہ بدل گیا۔“  
 ”کیا اس کے اپنے بچے بھی تھے؟“  
 ”نہیں۔ اس کی بیوی بیمار تھی۔ اس کے یہاں ایک یا دوسرہ بچے پیدا ہوئے تھے، بہر حال وہ مجھے پاکر بہت خوش ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔“  
 ”اور اسپاسٹر بھی خوش ہوگا۔“ میں نے کہا۔  
 نام نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ میں وہیں رہ کر بڑا ہوا۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تو اس کی بیوی انتقال کر گئی اور چار سال پہلے چرچڑ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔“

”اور دراخت میں تمہیں اس کا کاروبار مل گیا؟“  
 اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، انہوں نے مجھے گود لے لیا تھا۔ اس کے بعد سے ہم صرف سمجھیاں ہی نہیں بلکہ نوڈ کی گڑیاں بھی بیچ رہے ہیں۔“  
 ”لگتا ہے کہ تم نے اپنے لیے بہت کچھ کر لیا ہے۔“  
 وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔ تم سناؤ تم پر کیا کڑی رہی؟“  
 ”جب تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“ میں کہتے کہتے رک گیا کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی اس کے بھائے میں نے کہا۔ ”اس کے بعد ٹرین تین یا چار بج کر لیکن کسی نے جی مجھے یا جی کو نہیں لیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یونہی ستر

کرتے ہوئے کیلی فورنیا تک پہنچ گئے اور ہمیں کسی نے نہیں لیا تو کیا وہ ہمیں واپس بھیج دیں گے یا سمندر میں پھینک دیا جائے گا؟“  
 نام نے سر ہلا دیا۔  
 ”بالآخر ہم کیسا س کے قصبے وان سم پہنچ گئے۔ وہ ہمیں لے کر ایک ادیبراہاؤس میں گئے اور قد کے لحاظ سے ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ اس طرح میں اور جی جدا ہو گئے۔“  
 میں نے شروپ کا گھونٹ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”کسان ایک ایک کر کے آتے گئے اور ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس گروپ میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ خوب صورت بچے تلاش کر رہی تھیں جبکہ مرد بڑے لڑکوں کو دیکھ رہے تھے۔“  
 ”تاکہ وہ سمجھتوں میں ان کے ساتھ کام کر سکیں۔“

نام بولا۔

”ان میں ایک چھوٹے قد کا بڑی مونچھوں والا شخص تھا جو قطار کے درمیان میں کھڑے ہوئے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے داہیں ہاتھ میں رشہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ شخص بیمار تو نہیں۔ اس کا نام نارمن بنٹر تھا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ چند کاغذات پر دستخط کیے اور اپنے ساتھ لے کر چل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں چھڑے میں اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک میل جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ فارم کتنی دور ہے۔ وہ میری طرف مڑا اور اتنی زور سے میرے منہ پر چھڑ مارا کہ میں گاڑی سے گرتے گرتے پھا۔“  
 ”اوہ میرے خدا۔“ نام بڑبڑایا۔  
 ”اس نے کہا..... جب تک تم سے بولنے کے لیے کہنا نہ جائے، تم خاموش رہو گے اور ہمیشہ مجھے مسٹر کہہ کر مخاطب کرو۔“

”اوہ پیٹ.....“

”مزرے کی بات یہ تھی کہ جب اس نے مجھے تھپڑ مارا تو اس کے ہاتھ کی لڑش رک گئی۔ تب میں سمجھا کہ وہ کیوں ایسے لڑکے تلاش کر رہا تھا جو قد میں اس سے چھوٹے ہوں۔“  
 ”پیٹ! مجھے افسوس ہے۔“  
 ”تمہیں کیسے معلوم ہوتا نام کیونکہ تم تو اسپاسٹر کے ساتھ سو رہے تھے۔“  
 ”اس کی بیوی کیسی تھی؟“  
 ”وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں لمبی اور بھاری جسم کی تھی لیکن وہ دوسروں کے کام آتی تھی۔ اس نے میرے



ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔“

”ایجنٹوں کے بارے میں کیا کہو گے؟“

میں تیزی سے چڑھتا ہوں بولا۔ ”کون سے ایجنٹ؟“

”میںم خانے والے یہ دیکھنے کے لیے اپنے ایجنٹ

بجھے ہیں کہ لے پاؤں بچوں کی کسی پرورش ہو رہی ہے۔“

”اچھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہیں ایجنٹ کہتے ہیں۔

میرے وہاں پہنچنے کے چند ماہ بعد ایک آدمی آیا تھا۔ میں

کھلیان کے باہر مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا، جب وہ ایجنٹ

آیا۔ مسٹر بلر اپرن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئی اور بولی۔

پیٹ! کوئی تم سے ملے آیا ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ

سے ملے کون آ سکتا ہے؟“

”جلدی کرو اور باتوں میں وقت ضائع نہ کرنا۔“

ایجنٹ اور مسٹر بلر مہمان خانے میں بیٹھے ہوئے

تھے۔ میں دروازے پر ہی رک گیا کیونکہ صرف ایک دفعہ

میں نے وہاں قدم رکھا تھا تو مسٹر بلر نے مجھے تھپڑ مار دیا

تھا اور کہا تھا کہ یہ صرف مہمانوں کے لیے ہے۔

”اندرا آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”یہ مسٹر بلر کی ہیں اور

دیکھنے آئے ہیں کہ تم یہاں کس طرح رہ رہے ہو۔“

مسٹر بلر کی لیے قد کا بڑا چٹا شخص تھا۔ اس نے آنکھوں

پر مونے شیشوں کا چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔ کندھے جگھے ہوئے

اور ہونٹوں پر گرم جوش مسکراہٹ تھی۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی پیٹ۔“ یہ کہہ کر اس نے

مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”سیب کھاؤ گے؟“ مسٹر بلر نے پوچھا۔

مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہاں ایسی جرأت

نا قابل معافی جرم تھا لیکن میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، ورنہ

مہمان کے سامنے مسٹر بلر کی بے عزتی ہو جاتی۔ اس لیے میں

نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”مسٹر بلر تم سے کچھ سوالات کریں گے کہ تم یہاں

کس طرح رہ رہے ہو۔“

”بیٹھ جاؤ پیٹ۔“ مسٹر بلر کی نے صوفے پر ہاتھ

مارتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے منہ بولے باپ کی طرف دیکھا۔ اس

نے سر ہلا دیا۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم جتنی دیر

چاہو، باتیں کر سکتے ہو۔“

”یہ لوگ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟“

مسٹر بلر کی نے پوچھا۔

میں نے اسے بتا دیا کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی سی

باتوں پر مجھے مارا جاتا ہے اور اگر مسٹر بلر کی بات نہ سنوں تو

میرا کھانا بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر مسٹر بلر کی کا چہرہ مزید

سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا۔ جب

میں نے اپنی بات ختم کی تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں بہت عرصے سے کسی کو اپنا دکھنا سنا چاہ رہا تھا اور بالآخر

مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔

ایجنٹ نے اپنا چشمہ ناک پر رکھا اور بولا۔ ”یہ تو

میری سوچ سے بھی زیادہ بری صورت حال ہے۔“

اس کے پاس ایک پرانا چڑے کا بستہ تھا۔ اس نے

اس میں سے تین خط نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے اور

بولا۔ ”انہیں پڑھو۔“

میں نے ان میں سے پہلا خط نکالا جو بلر نے باوری

فاؤنڈنگ ہوم کو لکھا تھا۔ اس نے میرے بارے میں کہا کہ

میں ایک نافرمان اور چھوٹا لڑکا ہوں لیکن اس کے باوجود انہوں

نے بلر کی شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے ایک اور موقع

دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے وہ خط ایک طرف رکھ دیا۔

”دوسرے خط بھی پڑھو۔“ مسٹر بلر کی نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”تمہیں یہ خط پڑھنے چاہئیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ

تم نے اپنے والدین کو کتنا پریشان کر رکھا ہے اور اب تم

میرے سامنے بیٹھ کر مزید جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں

اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم کتنے خوش قسمت ہو۔ اگر میں تمہارا

باپ ہوتا تو تمہارا مارا غم خیز کر دیتا۔“

”میرا باپ مر چکا ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

..... ”اس کے بعد میں نے دوبارہ ایسی کوشش نہیں کی۔“

میں نے کہا۔ ”کیونکہ کوئی بھی میری بات پر یقین کرنے کے

لیے تیار نہیں تھا۔ لہذا اس دن کے بعد جب بھی مسٹر بلر کی

یا اس کی جگہ کوئی دوسرا ایجنٹ آیا تو میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ

سب ٹھیک ہے۔ اس طرح میں مزید پٹائی سے بچ گیا۔“

”اوہ پیٹ.....“ ٹام بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

تھے۔ ”مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔“

”تمہیں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔“ میں نے کہا اور دل میں

سوچا کہ تم تو اپنی فی شاخت بنانے اور اپنے منہ بولے باپ

کی دولت میں اضافہ کرنے میں مدد کر رہے تھے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم کمر

جار رہے ہو؟“

ٹام نے مشروب کی بوتل کی طرف دیکھا اور اسے

ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی نہیں۔“ میں سوچ رہا تھا

کہ ہم دونوں مل کر ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہیں۔“

میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید ہم دونوں مل کر

کاروبار کریں گے۔ کیا میں مسوری کے ایک چھوٹے سے

قبضے میں رہ سکوں گا جس کا مطلب ہے کہ مجھے کوئی مستقل

کام کرنا پڑے گا۔ کیا میں واقعی ایسا کام کرنا چاہتا ہوں؟

اس نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکاتے ہوئے

بولا۔ ”میں امید کر رہا تھا کہ تم ایک آدمی کو قتل کرنے میں

میری مدد کرو گے۔“

میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور میں نے کہا۔ ”کیا تم

اسی لیے مجھے جیل سے نکال کر لائے تھے؟ تمہارا کوئی

کاروباری حریف ہے اور تم نے سوچا کہ تمہارا آوارہ اور

شرابی بھائی تمہارے لیے اسے قتل کر سکتا ہے۔“

”پیٹ.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”میں جس آدمی کی بات کر رہا ہوں..... اس نے جی

کو مار ڈالا۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو مار دیا۔“

میں نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے

یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟“

جی بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ اس نے کبھی غصہ نہیں دکھایا

اور نہ ہی کسی سے ناراض ہوا۔ میں نے فاؤنڈنگ ہوم میں

دو گھنٹوں کو اس کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ وہ

اس لیے پریشان تھے کہ اسے قیام کی ٹرین پر بھیجا جا رہا

تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹا تھا لیکن وہ اس سے پہلے بھی چار سال

کی عمر کے بچوں کو بیچ چکے تھے۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اسے

کوئی قبول نہیں کرے گا کیونکہ اس کی بیٹائی کمزور تھی۔

کسانوں نے سب سے مضبوط لڑکوں اور سب سے

خوب صورت چھوٹے بچوں کو منتخب کیا اس لیے مجھے ٹام کی

زبانی یہ سن کر کوئی حیرانی نہیں ہوئی کہ اسے راستے میں آنے

والے قبضوں میں سے کسی نے منتخب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ٹرین

اپنے آخری اسٹاپ ریڈ کلف پہنچ گئی۔

”مجھے میرے سرائی رسالوں نے بتایا کہ وہ ایک

سال سے بھی کم عرصہ وہاں رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔“

”ایجنٹ اسے اس لیے لے گیا ہوگا کہ وہ لوگ جی کو

مارتے تھے۔“ میں نے قیاس آرائی کی۔

”نہیں، اس کی بیوی حاملہ ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں

نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی دوسرے کے بچے کو پالنے کی

ضرورت نہیں۔“

”اوہ میرے خدا۔“ میں بڑبڑایا۔ ”پھر بعد میں اس

کے ساتھ کیا ہوا؟“

”اسے ایک جوڑا اپنے ساتھ لے گیا۔ ان کا فارم

ریڈ کلف سے میں میل کے فاصلے پر تھا۔ ان کی پہلے سے

ایک بیٹی تھی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں حیت پر کام کرنے کے

لیے ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔“

”ننھا جی کیسے مل چلا سکتا تھا؟ وہ تو بڑا ہونے کے

بعد بھی اس کام کے لیے بہت چھوٹا تھا۔“

ٹام کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف یہ

معلوم ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور پھر بارہ سال

کی عمر میں اس کی موت واقع ہو گئی۔“

”تم اس کے مرنے کی وجہ جانتے ہو؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہوں نے ڈسٹھ

سرٹیفکیٹ میں کیا لکھوایا لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ بہت

زیادہ مشقت اور بہت کم خوراک کی وجہ سے اس کی موت

واقع ہوئی۔“

”وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اسی فارم پر رہے جبکہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔

ہم ٹرین کے ذریعے دو دن میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

”تم نے اپنے سرائی رسالوں کے بارے میں سوچا ہے؟“

”کیا؟“

”اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم مارا گیا تو وہ تم پر اس

کا الزام عائد کر دیں گے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“

اگلے روز اس نے میرے لیے کپڑوں کی خریداری

کی پھر ہم نے گیس اور گولیاں خریدیں۔ ایک دن بعد ہم

ٹرین میں سوار ہوئے۔ سفر کے دوران زیادہ تر میں بلر کے

بارے میں سوچتا رہا۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تو برف

باری کے دوران کھلیان سے لاتے ہوئے میں نے آدمی

بالٹی دودھ گرا دیا تھا۔ مسٹر بلر نے مجھ پر وہ دودھ پینے کا

الزام لگا دیا اور غصے میں آکر مجھے زوردار تھپڑ مارنے کے

لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس

کی کلائی پکڑ لی۔ ہم ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہے

اور میں سمجھتا ہوں کہ بالٹی بار ہمیں احساس ہوا کہ میں قدمیں

اس سے زیادہ اور قدرے طاقتور ہوں۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب بھی مجھے دیکھ رہا

تھا۔ ”اسکول جاؤ۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”دیر ہو رہی ہے،



جلدی کرو۔“

مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے اس نے کبھی دیر ہونے کی پروا کی ہو یا کبھی پوچھا ہو کہ میں اسکول کیا تھا یا نہیں۔

جب میں چھٹی کے بعد اسکول سے باہر آیا تو شریف ایک سوٹ کس لیے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تمہارے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اسے دھکا دیا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ بیکار چیزیں بھی فائدہ مند نہیں ہوتیں۔“

”شریف! کیا میں زیرِ جراست ہوں؟“

”تمہارا باپ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے تمہارے لیے ٹرین کا ٹکٹ بھی خریدا ہے۔ میں تمہارا سوٹ کس لیے کر آیا ہوں۔ اب یہاں بھی مت آنا۔ ورنہ میں تمہیں جیل میں ڈال دوں گا۔“

میں نے وہیں کھڑے کھڑے سڑک پر سوٹ کس کھول لیا۔ سب بچے یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

”میرے پیسے کہاں ہیں؟ اس جینٹ میں چودہ ڈالر تھے۔“

”جھوٹ مت بولو فیملی۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

”اوہ پیٹ۔“ نام نے ایک بار پھر کہا۔ ”واقعی مجھے بہت افسوس ہے۔“

”جج پوچھتو میں بلکہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“

”وہ کیوں؟“

”اگر میں وہاں رہتا تو ایک دن اسے ضرور قتل کر دیتا

پھر مجھے ضرور پھانسی ہو جاتی۔ یوں سمجھو کہ میری جان بچ

گئی۔ کچھ عرصہ قبل مجھے معلوم ہوا کہ ان کے مکان میں آگ

لگ گئی اور وہ دونوں اس میں قتل ہو گئے۔ اگر میں وہاں رہ رہا

ہوتا تو میں بھی اسی آگ میں جل کر اڑھ بوجاتا۔“

میرا سکا بچہ کرہم نے ایک ہول میں قیام کیا اور

دوسرے دن فارم کی تلاش میں نکل پڑے۔ بڑی مشکل

سے اس کا پتلا۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی۔ میں نے کہا۔

”لگتا ہے کہ آج کل اس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”شاید۔“

”وہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟“

”صرف ہومر۔۔۔۔۔ اس کی بیوی مرچکی ہے اور بیٹی

کہیں چلی گئی۔“

ہم نے بھی روکی اور گھوڑوں کو ایک جگہ باندھ دیا۔

اس کے بعد ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ دالان میں کھڑے

ہو کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ دروازہ کھڑکی کا تھا اور اس کا رنگ اڑچکا تھا۔ نام نے میری طرف دیکھا اور دروازے پر ہلکی دستک دی۔

”کون ہے، اندر آ جاؤ۔“

پورا گھر ہول کے ایک بڑے کمرے کے برابر تھا۔

اس میں سادہ اور پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ ایک میز، تین

کرسیاں، ایک صندوق، کھانے پکانے کے برتن ایک دیوار

کے ساتھ رکھے ہوئے تھے سائے دالی دیوار کے ساتھ ایک

سرخ رنگ کا صوفہ پڑا ہوا تھا اور اس صوفے پر ایک بوڑھا

آدمی لٹاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔

”کیا تم ہی ہومر و کارٹ ہو؟“ نام نے پوچھا۔

”ہاں لیکن تم کون ہو؟“

نام اچانک اتنی تیزی سے آگے بڑھا جیسے ابھی پستول

نکال کر اس کا خاتمہ کر دے گا لیکن اس نے لٹاف کی طرف

پر پیچک دیا اور بولا۔ ”میں صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کہیں

تم نے لٹاف کے نیچے کوئی ہتھیار تو نہیں چھپا رکھا ہے کیونکہ تم

جیسے آدمی کو لڑائی کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔“

اس بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ

بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔

تم نے بتایا نہیں کہ کون ہو؟“

”دوسرے کمرے میں دیکھو۔“ نام نے مجھ سے کہا۔

وہاں دو کمرے اور بھی تھے۔ ایک کمرے میں ڈبل

بیڈ اور ڈریسنگ روم دوسرے کمرے میں سنگل بیڈ اور میز رکھی

ہوئی تھی۔

”یہاں کوئی نہیں ہے۔“ میں نے نام کو بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس کی نظریں بدستور ہومر پر جمی

ہوئی تھیں۔ ”تم جانتا چاہتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ تو سنو، ہم

تمہارے بچ اور جلا دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم تک پہنچنے

میں آتی دیر لگی۔“

ہومر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کس جرم

کی سزا دینے آئے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میرا فیملی برادر ہیں۔ جنہیں کچھ یاد آیا؟“

اسے سمجھنے میں کچھ دیر لگی پھر اس کی آنکھیں حیرت

سے پھیل گئیں۔ ”تم جی کے بھائی ہو؟“

”ہاں۔“ نام نے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ ہمیں

کہاں لے گا؟“

”وہ چرچ کے قبرستان میں ہے۔ اسے اپنی ماں کے

پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔“

نام نے اس کے منہ پر قبضہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی ماں کا نیو یارک میں انتقال ہوا تھا۔ تم کس ماں کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ عورت جو تمہاری بیوی تھی؟ کیا تم نے اسے

بھی جی کی طرح زد و کوب کر کے مار ڈالا یا وہ تمہارا ظلم

برداشت نہ کر سکی اور اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں

نے کبھی جی یا اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں ان دونوں

سے بہت محبت کرتا تھا۔“

”میرا نام تھاد باپ بھی کرتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ

ذرا ذرا سی بات پر مجھے چڑے کی سیٹھ سے مارتا اور لوگوں

سے یہی کہتا کہ اس نے کبھی مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔“

”کیا تم مجھے مار ڈالو گے؟“ ہومر نے کہا۔

”ہاں، یہ تمہارے لیے کم سے کم سزا ہوگی۔“

”تو پھر جلدی کرو۔ پڑوسی عورت میرے لیے کھانا لے

کر آنے والی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں یہاں دیکھے۔“

”تم اس لیے پریشان ہو رہے ہو کہ کہیں ہم کچلے

نہ جائیں؟“ نام نے کہا۔

”نہیں، مجھے پریشانی یہ ہے کہ کہیں تم اسے بھی نہ

مار دو۔ میرے جرم کی سزا اسے نہیں ملنی چاہیے۔“

”اچھا ہوا کہ تم نے اسے جرائم کا اعتراف کر لیا۔“

نام بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم ان کی تفصیل بھی بتا دو۔“

میں نے کہا۔ ”نام! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں

جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”ابھی نہیں پیٹ۔“ نام بولا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں

کہ اس نے جی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

”تمہارے پاس گھن ہے۔“ ہومر بولا۔ ”مجھے گولی

مار دو۔“

”اگر تم اپنی پڑوسن کو بچانا چاہتے ہو تو اپنے جرائم کا

اعتراف کر لو۔“ نام نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ہومر بولا۔ ”میں اعتراف کرتا ہوں

کہ میں نے تمہارے بھائی سے بہت زیادہ کام لیا۔ اسے

پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیا لیکن میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔“

”لیکن تم اسے مارتے بھی تھے؟“

”مارتا تھا؟“ وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے

بولا۔ ”ہاں تاکہ وہ سیدھے راستے پر چلے۔ بالکل بھی نہیں

کہتی ہے۔“

نام نے گھن اس کی ٹھوڑی پر رکھی اور بولا۔ ”جب وہ

بیار ہو گیا اور کام کرنے کے قابل نہ رہا تب بھی تم نے اسے

مارا۔ اس طرح اس کی موت واقع ہو گئی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے اسے۔۔۔۔۔“ وہ اپنا جملہ پورا نہ

کر سکا۔ اس کی آواز بھرائی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”پاپا!“ ایک زنانہ آواز آئی۔ وہ ایک لمبے قد کی

عورت تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہومر نے چلاتے ہوئے کہا۔

”میری! یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔۔۔ بھاگو۔“

میں نے اس عورت کا بازو پکڑ لیا لیکن اس نے

چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے

غصے سے بولی۔ ”تم کون ہو اور تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ایک

بیار آدمی کو تنگ کرو۔“

”ہم جی کے بھائی ہیں۔“ نام بولا۔ ”کیا تم نے

اسے کبھی یاد کیا؟“

”بالکل۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ تم میں نام

کون ہے اور پیٹ کون؟“

”تمہیں ہمارے نام کیسے معلوم ہوئے؟“ میں

حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھی ہر وقت تمہاری باتیں کرتا تھا۔ وہ تمہیں کبھی

نہیں بھولا تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں یاد کرتا ہوگا۔“ نام بولا۔

”اور دعا میں مانگا ہوگا کہ ہم یہاں آکر اسے بچائیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میری بولی۔ ”وہ یہاں خوش

تھا۔ ہم سب اس سے محبت کرتے تھے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ نام نے کہا اور اس کی

طرف گھن تان لی۔

”اسے جانے دو۔“ ہومر بولا۔ ”یہ معاملہ میرے اور

تمہارے درمیان ہے۔“

میں نے نام کا گھن والا ہاتھ نیچے کیا اور اس عورت

سے پوچھا۔ ”جی کی موت کیسے ہوئی تھی؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز

میں بولی۔ ”اسے بخار ہو گیا تھا اور میری ماں اس کی

تیار داری کرتے کرتے خود بیمار ہو گئی۔“

”تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو۔“ نام نے کہا۔

”کسی نے بھی اس کا خیال نہیں کیا۔“

”تم میرے والدین کے بارے میں کچھ نہیں

جانتے۔“ میری بولی۔ ”وہ بہت مہربان اور محبت کرنے

والے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے

ہوں کیونکہ تم ان کی حقیقی بیٹی ہو لیکن ایک یتیم بچے سے انہیں



بنی اسرائیل کے درمیان ایک شخص ”سامری“ بھی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معتقد ہو کر بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل آیا تھا۔ وہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن ”سامری“ ہونے کے ناتے اس کے دل میں بتوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصر میں بھی۔ سامری اس کا نام نہیں تھا بلکہ سمیری ہونے کی وجہ سے سامری کہا گیا۔

## حضرت موسیٰ علیہ السلام

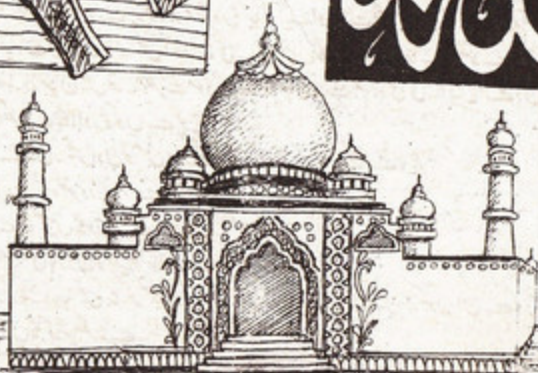
رضوانہ صاحبہ

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔۔۔ یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا۔۔۔ ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے۔۔۔ حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارہ دکھاتی ہے۔۔۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرہ کی علامت بنا کر اشارہ نہ دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے۔۔۔ جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و بدبختی کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا۔۔۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریامیں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر سرورنی سازشیں اور

پیغمبر کے معجزات کا احوال

آٹھواں حصہ



میں دیا تو یہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ اس لیے میں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے حالانکہ بعد میں جب میں اسے اچھی طرح جان گیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ہم تینوں کو اپنے ساتھ لے جاتا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس پر یہی غاہر کیا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی بیوی سے بھی جھوٹ بولا۔“

میں اور میری اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی اور اس نے پتھول کی نال ابھی تک اپنی چوٹی سے لگا رکھی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ٹام! اگر تم مر گئے تو تمہارے بیٹے کا کیا ہوگا؟“

”سمیری بیوی اسے سنجال لے گی۔ میرے پاس بہت پیسا ہے جو اس کے کام آئے گا۔“

”اگر اس کے ساتھ بھی کچھ ہو گیا۔“ میری بولی۔ ”کوئی بیماری یا حادثہ۔۔۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بیٹا یتیم ہو جائے اور اسے بھی یتیموں کی ٹرین میں سوار ہونا پڑے اور وہ اپنی بقیہ زندگی کسی ظالم شخص کی غلامی میں گزار دے؟“

میرے بھائی کا ہاتھ کاٹنے لگا۔ پتھول اس کا ہاتھ سے گر گیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دو ہفتے بعد ہومر کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میں اور میری اس کے پاس موجود تھے۔ ٹام واپس اپنے گھر جا چکا تھا۔ میں میری کی دلجوئی کے لیے اس کے پاس رک گیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک میں نے اپنے بھائی کو نہیں دیکھا۔ البتہ ہم خط اور ٹیلی فون کے ذریعے رابطے میں رہے۔ جب اس کی چھوٹی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس نے مجھے اور میری کو بھی بچوں سمیت بلایا اور ہمارے لیے ریل کے ٹکٹ بھیجے۔ اس شادی میں شہر کے امراء اور معززین شریک ہوئے جبکہ میری حیثیت ان کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن مجھے اپنے بھائی سے کوئی حسد محسوس نہیں ہوا بلکہ اس قریب کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ اگر ٹام اس روز اپنے آپ کو کوئی مار لیتا تو اس کی بیٹی کی اتنی دھوم دھام سے شادی نہ ہوتی اور اس کے بچے بھی یتیموں کی ٹرین میں سوار ہو کر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ خدا کسی بچے کو بھی ماں باپ کے سامنے سے محروم نہ کرے۔

کیا ہمدردی ہو سکتی ہے جسے وہ نوکر سمجھ کر لائے تھے۔“ ”میں ان کی حقیقی بیٹی نہیں ہوں۔ کوئی مجھے چرچ کی سیزبوں پر چھوڑ گیا تھا۔ یتیم خانے والوں نے مجھے وہاں سے اٹھایا اور پھر ایک دن یتیموں کی ٹرین میں سوار کر دیا۔ یہ لوگ مجھے لے آئے اور بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں۔“ ”ایسا مت کہو۔“ اس کے باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں پہلے دن سے ہی گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہی تھی اور اسی طرح مجی کو بھی انہوں نے رکھا۔ ہم سب اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ شاید ہی کسی یتیم بچے کو اتنا پیارا ملتا ہو۔“

میں نے ہومر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ تم نے اسے مار ڈالا۔ کیا اس لیے کہ ہم تمہاری بیٹی کے آنے سے پہلے چلے جائیں؟“

ہومر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میری بولی۔ ”اے معلوم نہیں تھا کہ میں آ رہی ہوں۔ اس نے صرف اس وجہ سے اپنے آپ کو قصودار ٹھہرایا کہ تم اسے گولی مار دو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں یا پا؟“ ”مجھے افسوس ہے بے بی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”اے کینر ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو دو ایسے ہی اثر نہیں کر رہی ہیں۔“

میں نے ٹام سے کہا۔ ”ہمیں چلنا چاہیے۔ اب یہاں ہمارے کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ہمیں جی کا قرض اتارنا ہے۔“

”وہ پیار ہو گیا تھا۔ اس کے لیے کسی کو لازم نہیں دیا جاسکتا۔“

”کسی نہ کسی کو تو لازم دینا ہوگا۔“ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی تو ڈسے دار ہے۔ اگر یہ نہیں ہو تو پھر میں۔“ یہ کہہ کر اس نے گن اپنی بیٹی پر رکھ لی۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

ٹام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کہنے لگا۔ ”یہ

اس دن کی بات ہے جب سٹر اسپا سٹر مجھے اپنے ساتھ لے

جا رہے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور

بھائی یا بہن بھی ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ صرف ایک بچہ ہی

لے رہے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر جواب ہاں



وہ دن بھر گھومتا رہا اور یہی باتیں کرتا رہا۔  
وہ دن بھی گزر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں آئے کیونکہ خدا نے انہیں دس دن تک اور روک لیا تھا۔  
دوسرے دن وہ پھر نکلا اور سینہ تان کر کہہ رہا تھا کہ موسیٰ اب بھی نہیں آئیں گے۔ تم کہو تو میں تمہارے لیے ایک دیوتا بنا دوں گا کہ تم موسیٰ کے محتاج نہ رہو۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ دیوتاؤں کی پرستش کے لیے پہاڑ پر چلا جاتا ہے اور تم پرستش سے محروم رہ جاتے ہو۔ کب تک پرستش سے محروم رہو گے۔  
”تم ہمارے لیے کس قسم کا دیوتا بناؤ گے؟“  
”کیا تم حورس دیوتا سے واقف نہیں ہو۔ مصر میں تم دیکھ چکے ہو۔ حورس کا منہ گائے کا ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک گائے میں تمہیں بنا دوں گا۔“

صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عقائد کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں خاصی حد تک رنگے جا چکے تھے۔ گائے کی پرستش مصر کا قدیم عقیدہ تھا اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اسی لیے ان کے ایک بڑے دیوتا حورس کا منہ گائے کی شکل کا تھا۔ وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرہ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔

سامری نے جب بنی اسرائیل کو غریب دیوتا نہیں نے اسے بد آسانی قبول کر لیا۔  
بنی اسرائیل میں کچھ صالح لوگ بھی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور اپنے لوگوں سے کہا کہ تم سامری کی باتوں میں مت آؤ، جو کچھ یہ کہہ رہا ہے وہ گمراہی کا راستہ ہے۔ تم موسیٰ اور اس کے رب کے احسانات یاد کرو وچترم یقیناً ان کے خلاف نہیں جاؤ گے۔  
سامری نے اسرائیلیوں کو اتار غلامی کا تھا کہ وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ انہی بھولوں سے بھڑنے لگے۔ یہ چند صالح افراد دور تھے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پہنچے کہ جا کر ان کے سامنے تمام معاملات بیان کریں۔

ان کے چلے جانے کے بعد سامری اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔  
”تمہارے پاس چاندی سونے کے وہ زیورات موجود ہوں گے جو تم مصری عورتوں سے عاریتاً لے کر آئے تھے؟“  
”ہاں وہ ہیں تو۔“  
”انہیں میرے پاس لے کر آؤ۔“  
”تم ان زیورات کا کیا کر دو گے؟“  
”ان زیورات کو گھلا کر ہی تو میں وہ بچھڑا ہواؤں گا جس کی تم پرستش کر سکو گے۔ اس سے جو مانگو گے وہ تمہیں دے گا۔“

جب وہ بے جان ہونے کے باوجود آوازیں لگائے گا تو تمہیں خود یقین آ جائے گا کہ وہ دیوتا ہے۔“  
چند لوگ حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پہنچے اور انہیں سامری کے ارادوں سے ناخبر کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام پابند تھے کہ قوم کو گمراہی کے راستے پر نہ جانے دیں۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ سامری اس وقت کہاں ہوگا۔  
وہ سامری سے بات کرنے کے لیے پہنچے۔ وہ اس وقت بھی اسرائیلیوں کے درمیان گھبراہٹا تھا۔ لوگ اسے اپنے اپنے زیورات لا کر دے رہے تھے۔ اس کے سامنے زیورات کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام وہاں پہنچ گئے۔  
”سامری! اتو نے یہ کیا ڈھونڈ کر چاہا ہوا ہے۔ خود بھی گمراہ ہو رہا ہے اور دوسروں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا رہا ہے۔“

”مجھے ڈانٹنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اپنے لوگوں سے خود پوچھ لو کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔“  
حضرت ہارون علیہ السلام نے بڑی امیدوں کے ساتھ اپنی قوم کی طرف دیکھا لیکن کوئی ایک فرد بھی ان سے آنکھ ملانے کا روادار نہیں تھا۔ وہ اپنے زیورات بڑے ذوق و شوق سے سامری کے حوالے کر رہے تھے۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں بہت غیبت دلائی تو وہ سینہ تان کر ان کے سامنے آ گئے۔  
”تم دونوں بھائیوں نے ہمیں مصر سے نکال کر بڑی غلطی کی۔ اب ہم زیادہ دیر صبر نہیں کر سکتے یا تو ہمیں مصر واپس جانے دو یا ہمیں اس بچھڑے کی پرستش کرنے دو جو سامری ہمارے لیے بنانے والا ہے۔“

”موسیٰ بس آئے ہی والے ہیں، تم یہ مقدمہ ان کے سامنے رکھنا۔“  
”سامری خبیث کہتا ہے۔ موسیٰ اب آئے والے نہیں اور ہم تمہاری بات ماننے کے حق میں نہیں۔“  
”میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ یہ گمراہی کا راستہ ہے۔ اس سے باز آ جاؤ ورنہ میں تم پر سختی کروں گا۔“  
”اگر تم نے زبردستی کی تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔“

یہ شخص جوں کے جسے بنانے کا باہر تھا۔ مصر میں وہ یہی کام کرتا رہا تھا۔ وہ دھاتوں سے مجسمے تیار کر سکتا تھا۔  
وہ بنی اسرائیل کی ذہنی حالت کا اس وقت سے مشاہدہ کرتا چلا آ رہا تھا جس دن سے وہ مصر سے نکلا تھا۔ اس نے وہ منظر بھی دیکھا تھا جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے لیے معبودوں کے بت بنا دے تاکہ ہم ان کی پرستش کریں۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ڈانٹنے پر خاموش ضرور ہو گئے تھے لیکن ان کے دلوں سے جوں کا شوق گیا نہیں تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ اپنے اس شوق کو ظاہر بھی کر دیا کرتے تھے۔ سامری یقیناً یہ سب سن رہا ہوگا۔ وہ بنی اسرائیل کے ذہنوں میں یہ بات پہلے ہی ڈال چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان سے فرار ہونے والے ہیں۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ بنا دے۔ اس کے لیے اسے ابھی کچھ اور محنت کرنی تھی۔ اس نے مختلف جگہوں پر بیٹھ کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دیں جن سے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے شک میں پڑ جا گیا۔

”کچھ معلوم ہے یہ موسیٰ علیہ السلام کہاں گئے ہیں۔“  
”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کوہ طور پر اپنے رب سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔“  
”انہیں ملاقات کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی؟“  
”وہ خدا سے ہمارے لیے ہدایات لیتے رہے ہیں اور اب ملاقات کو گئے ہیں۔“  
”انہوں نے کہہ دیا اور تم نے یقین کر لیا۔ یہ کیا خدا ہے جو وہاں ہے، یہاں نہیں ہے۔ وہ تم سے جھوٹ موٹ آ کر کہہ دیں گے کہ اپنے خدا سے مل آئے اور تم یقین کر لو گے۔“  
”انہیں ہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“  
”وہ نہیں چاہتے کہ تم کسی معبود کی پرستش کرو۔ اس طرح ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے منع کر دیا تھا کہ زمین پر کوئی بت نہ بنانا۔“

”خود جا کر پرستش کر آتے ہیں اور تمہیں منع کرتے ہیں۔ انہوں نے ضرور وہاں کوئی بت بنا کر رکھا ہوگا۔“  
”کچھ معلوم ہے وہ کتنے دنوں کا کہہ کر گئے تھے؟“  
”انہوں نے کہا تھا وہ تیس دن کے بعد پہاڑ سے نیچے آئیں گے۔“  
”مدت ختم ہونے میں دو دن باقی ہیں۔ اگر وہ پھر بھی نہیں آئے تو میں تمہارے لیے دیوتا بنا دوں گا۔“  
”یہ دیوتا کیسا ہوگا؟“  
”یہ تو میں دیوتاؤں سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔“

سامری نے یہ گفتگو سنیں چھوڑ دی اور ان سے الگ ہو گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کے دلوں میں شوقِ صنم پرستی پیدا کر دیا تھا۔ وہ ابھی دیکھنا چاہتا تھا کہ ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آتے ہیں یا نہیں۔ اگر ابھی جاتے ہیں تو اس نے ان کی قوم کو اتار غلامی کا تھا کہ وہ خود ان سے بت بنانے کا تقاضا کرتی۔  
گھر پہنچ کر اس نے اپنے منصوبے پر غور کرنا شروع کیا تو ایک اور بات بھی اس کے ذہن میں آئی۔ اگر موسیٰ کی قوم ان سے منحرف ہو جائے تو قیادت میرے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اس خیال کا آ تھا کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ ایک رات کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ انہیں اگلے دن آ جانا چاہیے تھا۔

وہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکلا اور لوگوں سے پوچھتا پھرا۔  
”موسیٰ ابھی آئے نہیں۔ تیس دن تو مکمل ہو گئے۔ تم سے یہی کہہ رہے تھے تھے نا؟“  
”ابھی تو دن نکلا ہے۔ وہ ضرور پہاڑ سے اتریں گے۔“  
”میرا تو خیال ہے وہ تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“  
”اگر ایسا ہے تو ہم ابھی ہارون (علیہ السلام) سے جا کر پوچھ لیتے ہیں۔“  
”خبردار! ایسا نہ کرنا۔ وہ باتیں بنا کر تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ جب تک میں نہ کہوں ان سے کوئی ذکر نہ کرنا۔ آج اور دیکھ لو۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“



آوازیں غروں کی شکل میں سنائی دے رہی تھیں۔  
 ”ہارون! یہ میں کیسا شور سن رہا ہوں؟ بستی میں کوئی غنیمت محسوس آیا ہے؟“  
 ”چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، وہ چاہتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام خود دیکھیں کہ ان کی قوم کس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔  
 یہ دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا سونے کا ایک بچھرا رکھا ہے۔ لوگ اس کے گرد گھوم رہے ہیں، گانے گارہے ہیں۔ گویا بچھڑے کی عبادت کی جارہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ منظر دیکھ کر بے پناہ غضب ناک ہو گئے۔  
 ”تم لوگوں نے یہ کیا ڈھونڈ کر چایا ہوا ہے اور یہ کیا حرکت ہے جو تم کر رہے ہو۔ تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اگر وہ یہی ایمان ہے تو انفس اس ایمان پر کیا بری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے۔“  
 حضرت موسیٰ کی لگاتار سنتے ہی ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔ پھر ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شخص جو سامری کھڑا ہے، یہ بچھڑا اس نے بنا کر دیا ہے۔ اس نے ہم سے کہا تھا، موسیٰ تم کو بھول گئے۔ تمہارا رب تو یہ ہے چنانچہ ہم اس کی پرستش کرنے لگے۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصے سے حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ گمان گزرا کہ حضرت ہارون علیہ السلام نیا بت کا حق صحیح طرح ادا نہ کر سکے اور قوم کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔

”انفس! تم نے کس طرح میرے طریقے سے میری جانشینی کی۔ تم اپنے پروردگار کے حکم میں ذرا بھی اعتقاد نہ کر سکتے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عیش میں آکر حضرت ہارون علیہ السلام کو بالوں سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچنے لگے۔  
 حضرت ہارون علیہ السلام نے بے بسی سے کہا۔ ”اے میرے بااں جانے بھائی! میں کیا کروں۔ لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں۔ میں میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہمیں اور تم مجھے ان ظالموں کے ساتھ شام کر۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی احساس ہوا کہ انہوں نے بھائی پر حملہ کیا۔ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی۔  
 ”پروردگار! میرے قصور بخش دے اور میرے بھائی کا بھی اور میں اپنی رحمت میں داخل کر۔ تجھے سے بڑھ کر کون ہے جو ہم پر رحم کرنے والا ہے۔“

اس پکار کے جواب میں خدا نے فرمایا۔ ”جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے حصے میں خدا کا غضب آئے گا اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنی صفائی پیش کی۔  
 ”میرے بھائی! اس معاملے میں میری مطلق خطائیں ہیں۔ میں نے ان کو ہر چند سمجھا لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی اور کہنے لگے جب تک موسیٰ..... نہ آیا ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انہوں نے مجھے کمزور سمجھ کر میرے قتل کا ارادہ تک کر لیا تھا۔ کہتے تھے ہم بہت ہیں اور تو اکیلا ہے۔ میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا جائے جو اس بچھڑے کی پوجا کے خلاف تھے تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ آجائے کہ میں نے قوم میں فتنہ ڈال دیا۔ میں ان سے جنگ کر سکتا تھا لیکن میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا۔ اب آپ آگئے ہیں جو فیصلہ کریں۔“  
 حضرت ہارون علیہ السلام کی یہ معقول دلیل سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ان کی طرف سے فرو ہو گیا۔ اب وہ سامری کی طرف متوجہ ہوئے جو وہیں ایک گوشے میں کھڑا سب کی باتیں سن رہا تھا۔

”اے سامری! تو نے یہ کیا ڈھونڈ کر چایا ہے۔ تو تو ایمان لے آیا تھا اور یہاں تک میرے ساتھ لگا چلا آیا۔ پھر تیرے دل میں کفر کی یہ بات کیسے سنائی کہ تو تم کو گمراہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔“  
 ”اس میں میرا قصور نہیں۔ تیری قوم ابھی تک مصر کو یاد کرتی رہی تھی۔ ان کا دل بچل رہا تھا کہ مصر کی طرح یہاں بھی وہ بتوں کی پرستش کریں۔ آپ نے آنے میں دیر لگائی۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بچھڑا بنا کر انہیں دے دیا۔ اگر یہ نہ چاہتے تو اپنے زیورات لا کر مجھے کیوں دیتے جنہیں ڈھال کریں نے یہ بچھڑا بنا دیا۔“  
 ”یہ بچھڑا آوازیں کیوں نکالتا ہے؟ کیا یہ تیرا کوئی جادو ہے؟“

”میں نے ایسی بات دیکھی جو ان اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی۔ غرق.... فرعون کے وقت اللہ کا فرشتہ

”میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں قوم میں انتشار پیدا نہ ہونے دوں اس لیے تمہاری کافرانہ خدے کے سامنے خاموش ہوئے جاتا ہوں۔ جب موسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو تم سے خودنشت لیں گے۔ بس اتنی گواہی ضرور دینا کہ تمہیں میری رضامندی حاصل نہیں تھی۔ میں نے تم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔“

حضرت ہارون علیہ السلام بے بس ہو کر ان کے سامنے سے ہٹ گئے۔  
 سامری نے زیورات کو پھینکا اور اس سے ایک بچھڑا تیار کر لیا۔ جب اس نے اپنے فن کا شہکار تحقیق کر لیا تو اس نے اس بچھڑے کو ایک نمایاں جگہ رکھ دیا اور تمام بنی اسرائیل کو بلایا۔

”یہ تمہارا خدا ہے۔ اسے سجدہ کرو۔“  
 ”تو نے تو کہا تھا کہ بچھڑا بے جان ہو گا لیکن بولتا ہو گا۔“  
 ”تم سجدہ کر کے اسے خدا تسلیم کر تو یہ بولے گا۔“  
 اسرائیلی سجدے میں گر گئے۔ سامری نے ایک مشت خاک اس کے اندر ڈال دی۔ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہوئے اور وہ ”بھائیں بھائیں“ کی آوازیں نکالنے لگا۔

”دیکھا تم نے؟ تمہارا معبود تو یہ ہے جو تمہیں سلامتی کی نوید سناتا رہا ہے۔“  
 اسرائیلیوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور بچھڑے کے گرد ناچ کر دعا مانگنے لگے، جیسا کہ انہوں نے مصر میں مصریوں کو دیکھا تھا۔

مجیب قوم تھی۔ ان کا پیغمبر پروردگار عالم سے راز و نیاز میں مصروف اور ان کے لیے آئین الہی (توریت) حاصل کرنے میں مشغول تھا اور قوم نے سامری کی قیادت میں خود ہی اپنا معبود تلاش کر کے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔  
 اللہ کو سب معلوم تھا کہ نیچے واوی سینا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعے سے مطلع کر دے۔

”موسیٰ! تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟“ اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔  
 ”خدا! اس لیے کہ جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں۔“  
 ”جس کی ہدایت کے لیے تم اتنے مضطرب ہو، اس نے گمراہی اختیار کر لی۔ تمہارا چلہ پورا ہو چکا۔ تم قوم کی طرف واپس جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے ایک گائے کی شکل میں اپنا معبود بنالیا ہے اور وہ اس کی پرستش کر رہے ہیں۔“

یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت اندامت ہوئی۔ شرمندگی سے گردن جھکا لی۔  
 ”موسیٰ! تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔ تم نے تو اپنا کام پورا کیا۔ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں مجسم کر دوں۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے تمام تر غصے کے باوجود اب بھی قوم کا خیال تھا کہ کہیں اللہ کا غضب ان پر نہ ٹوٹے۔ وہ خدا سے منت گزار ہوئے۔

”اے خداوند! کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے جن کو تو مصر سے نکال لایا ہے۔ مصری لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ موسیٰ..... انہیں پہاڑوں میں مار ڈالنے کے لیے نکال کر لایا تھا۔ تو اپنے بندوں ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کا خیال کر جن سے تو نے اپنی قسم کھا کر کہا تھا کہ تو ان کی نسل کو آسان کے تاروں کی طرح بڑھائے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو ریت کی ٹوسیاں ہاتھوں میں اٹھائیں اور پہاڑ سے نیچے اترے۔  
 حضرت ہارون علیہ السلام بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار پہاڑ کے نزدیک جا کر دیکھ آتے تھے۔ بالآخر وہ دن آیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ہارون علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ قوم گمراہ ہو گئی ہے دوسرے اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چہرہ خدا سے ہم گلائی کی وجہ سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

جب وہ نزدیک آئے اور بھائی کو اچھی طرح دیکھ چکے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر بستی کی طرف چلے۔ دل میں ڈرتے بھی بات تھے کہ جب قوم کی گمراہی کا راز کھلے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا گزرے گی۔  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام بستی کے قریب آئے تو انہیں کچھ شور سنائی دیا۔ گانے کی آوازیں تھیں۔ درمیان میں بے ہنگم



ہوتی تھی۔ پھر گناہ سے پاک لوگوں نے ان کی گردنیں اڑانا شروع کر دیں۔ توریت میں ہے کہ اس طرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے۔ بعض اسلامی روایات میں یہ تعداد ستر ہزار تک بیان کی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد جب قوم اپنے عزیزوں کا ماتم کر چکی تو حضرت ہارون علیہ السلام کے کہنے پر ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے خطاب کیا۔

اے قوم! بلاشبہ تم قتلے میں ڈال دیے گئے۔ بے شک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے۔ پس اب بھی سمجھو اور میری پیروی کرو اور میرے حکم کو مانو۔

کچھ دن بعد پھر ایک خطاب کیا۔ دنوں کا تقداس لیے دیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی حالت پر غور کریں۔ ان نشانیوں کا جائزہ لیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دکھائی ہیں۔ اس کے بعد انہیں توریت ملنے کی خوش خبری سنائی جائے۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا شروع کیا۔

”تم نے پچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ پھر تم نے حقیقی توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ جرم اپنی بے پایاں رحمت سے معاف کر دیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ تمہیں اس ملک تک لے جائے گا جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے بشرطیکہ تم اس کی پیروی کرتے رہو۔ جو وہ کہے اس پر عمل کرو تا کہ وہ تمہارے دشمنوں پر تمہیں فتح یاب کرے اور تمہیں ان ملکوں پر قابض کر دے اور ہرگز نہ ڈرنا کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔“

”اب میں تمہیں ایک خوش خبری دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہاری راہبری کے لیے کتاب اتاری ہے۔ اس میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو میں اب تک تمہیں بتاتا رہا ہوں یا آئندہ تمہیں ان سے ساتھ پڑ سکتا ہے۔ اس میں وہ تمام قوانین درج ہیں جو تمہیں دوسری قوموں پر ممتاز کر دیں گے۔ میرے پاس جو یہ ”لواح“ (تختیاں) ہیں، یہی وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور نبی و رسل کی فلاح کے لیے مجھے عطا کی ہیں۔ یہ تورات ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔“

اتنی شکریوں کے بعد وہی ہو چاہے تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سوچ رہے تھے۔ دلوں کی سختی میں کی آجانی چاہے تھی لیکن بنی اسرائیل تھے جسے اللہ تعالیٰ ”گردن کش قوم“ قرار دے چکا تھا۔ ابھی کچھ لمحوں پہلے احکام کی تعمیل پر زبان دے چکے تھے، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن کر بالکل ہی بدل گئے۔

”موسیٰ! ہم کیسے یقین کر لیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ صرف تیرے کہنے سے تو نہیں مان سکتے۔ ہمیں تو اس وقت یقین آئے گا جب خدا کو بے حجاب دیکھ لیں۔ وہ خود ہم سے کہے کہ تورات میری کتاب ہے، تم اس پر ایمان لے آؤ۔“

پہلے ایک آواز آئی پھر ہر طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں۔ یوحنا بن نون اور حضرت ہارون علیہ السلام نے بڑی مشکل سے اس شور پر قابو پایا اور مجھے کو اس قافلہ بنایا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن سکیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا۔ ”تم کیوں نادانیوں پر نادانیاں کرتے چلے جا رہے ہو۔ یہ تمہارے لیے محال ہے کہ انسانی آنکھ سے خدا کو دیکھ سکو۔ یہ تم نے یہی خدا باندھ لی ہے کہ خدا کو دیکھنے کی ضد کر رہے ہو۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جسے میں پوری نہ کر سکوں۔“

”تو ہمیں مصر سے یہاں لے آیا اور اب ہماری بات سننے کو بھی تیار نہیں۔“

”اپنے رب کے احسانات یاد کرو اور مانو کہ وہ تم پر مہربان ہے لیکن یہ تمہاری بے جا ضد ہے۔“

”یہ جب تک نہ ہوگا تم تورات کو ماننے والے نہیں۔“

”تمہاری یہی ضد ہے تو مانے لیتا ہوں لیکن یہ ناممکن ہے کہ تم لاکھوں کی تعداد میں طور پر جاؤ۔ میں تم میں سے ستر اشخاص منتخب کر کے پہاڑ پر لے جاتا ہوں وہ آکر تصدیق کر دیں تو تم مان لینا۔ تم ایک گناہ عظیم کر چکے ہو۔ اس پر اظہارِ ندامت اور معافی کے لیے بھی یہ ایک اچھا موقع ہے۔ یہ سب تمہاری طرف سے اظہارِ ندامت کریں گے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے ستر علماء کا انتخاب کیا اور قوم کو بھی اعتماد میں لے لیا کہ وہ ان کی تصدیق کو تسلیم کریں گے اور بعد میں کوئی بہانہ نہیں تراشیں گے۔ قوم نے ان لوگوں پر اعتماد کیا۔

ان علماء کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور یوحنا بن نون بھی تھے۔ ان سب کو حکم ملا کہ غسل کر کے پاک کپڑے پہن لیں اور خوشبو میں بس جائیں کیونکہ وہ دو جہانوں کے بادشاہ کے حضور جا رہے ہیں۔

اسرائیلیوں اور فرعونوں کے درمیان حائل تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کے ”سُوم“ کی خاک میں اثر حیات پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے قدم جہاں پڑتے ہیں، وہاں ہبزہ اگ جاتا ہے۔ یہ بات مجھے عجیب سی لگی۔ میں نے گھوڑے کے قدموں کی خاک اپنے پاس محفوظ کر لی۔ میں نے وہی خاک اس پچھڑے میں ڈالی تو یہ پچھڑے جیسی آواز نکالنے لگا۔“

قرآن نے بھی اس کی گواہی دی ہے۔

” (سامری نے کہا) میں نے وہ بات دیکھی تھی جو اردوں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش قدم سے ایک مٹی بھری پھراس کو (دھلے ہوئے پچھڑے میں) ڈال دیا۔ میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے بھائی۔“ (طہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جب تو نے اعتراف کر لی لیا ہے تو تیرے لیے یہ سزا تجویز کی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو تو اس سے دور بھاگے اور کہتا جائے کہ مجھے ہاتھ نہ لگنا۔ یہ دنیاوی عذاب ہوگا اور قیامت میں جو عذاب ایسے انسانوں کے لیے مقرر ہے وہ الگ ہے اور یہ بھی دیکھ لے کہ تو نے جس معبود کو بنایا تھا میں اسے جلا کر خاک بنادوں گا اور اس خاک کو دریا میں بہا دوں گا تا کہ تیرے مقتدیوں کو اور تجھے معلوم ہو جائے کہ تیرا بنایا ہوا معبود و سرور کو فنا کر دیتا ہوں، خود اپنے آپ کو بھی جلا دے گا۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے بعد بنی اسرائیل سے مخاطب ہوئے۔ ”بد بختو! تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ پچھڑا صرف بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ تمہاری باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ تمہارا معبود صرف خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔“

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پچھڑے کو جلا چکے اور سامری کا حال پاگلوں کی طرح ہو گیا۔ وہ جس طرف جاتا لوگوں سے کہتا جاتا، میرے قریب نہ آتا۔ مجھے ہاتھ نہ لگانا اور نہ میری بیماری تمہیں بھی لگ جائے گی تو بنی اسرائیل پر خوف طاری ہوا۔ وہ آپس میں ان گناہ گاروں سے بچھڑنے لگے جنہوں نے اس پچھڑے کی پرستش کی تھی۔ تمام بنی اسرائیل کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں ان کا حال بھی سامری جیسا نہ ہو جائے۔ وہ سب موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کے لیے دوڑے کہ وہ انہیں اللہ کے غضب سے بچائیں۔

”ہم سے بہت بڑی نادانی ہو گئی ہے۔ تو ہمیں اللہ کے غضب سے اسی طرح بچالے جس طرح اب تک بچا تا آیا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور انہیں باہر کھڑے رہنے کا حکم دے کر خیمے کے اندر چلے گئے۔ اگر کا ایک ستون خیمے کے دروازے پر آکر ٹکڑھ گیا۔ اس امر کے ستون سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں۔

جب آپ باہر تشریف لائے تو مجھے کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”فرمان! اُمی ہے کہ ہر گناہ کی معافی فقط توبہ و ایمان صالح سے ہو جائے گی مگر پچھڑے کی عبادت کے عظیم گناہ کی معافی میں تمہیں اپنی جانوں کی قربانی دینی ہوگی۔“

”میں تم سے کہتا ہوں، تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔ اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔“

قرآن کے الفاظ ہیں۔

”یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام (یہ نعت لیے ہوئے پلٹا تو اس نے) اپنی قوم سے کہا۔ لوگو! تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔ اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔“ (سورۃ بقرہ)

”موسیٰ!..... ہم توبہ کرتے ہیں لیکن ہم اپنی جانوں کو ہلاک کیسے کریں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟“

”ان آدمیوں کو قتل کرو جنہوں نے پچھڑے کی پرستش کی۔ اسی میں ان کی توبہ اور تمہاری نجات ہے۔“

نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے کہ مجرموں کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرنا چاہیے کہ جو شخص رشتے میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو۔

بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا کیونکہ جو بے گناہ تھے، وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ گناہ گاروں کی وجہ سے کہیں ان پر خدا کا غضب نازل نہ ہو۔

جو لوگ اس گناہ سے پاک تھے انہوں نے نکواریں ہاتھ میں لیں اور گناہ گار لوگ دوزخوں میں جھک کر صفوں میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت بادل مگر کر آئے اور ایسا اندھیرا چھا گیا کہ قریب والے کو اپنا ساتھی بھی نظر نہ آتا تھا اور نہ کسی کو اپنے رشتے دار کی خبر



کر لیں گے لیکن جو باتیں مشکل ہوں گی، ہم انہیں چھوڑ دیں گے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تم اپنی آسانیاں تلاش مت کرو، اللہ کی رضا کو دیکھو۔ کوئی آقا اپنے اس غلام سے کیسے خوش ہو سکتا ہے جو یہ کہے کہ میں تیری کچھ باتیں تو مانوں گا، کچھ نہیں مانوں گا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ سب تمہیں قبول کرنا ہوگا۔ اللہ کی براس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالو۔ دیکھو اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں تمہیں کھول کھول کر بتاتا رہوں گا اور تم اس پر عمل کرنے کے پابند ہو گے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔“

”اے موسیٰ! تو بے شک اس کی باتیں بتاتا رہ۔ ہم تو صرف اتنا مانیں گے جس میں ہماری سہولت ہوگی۔“

”دیکھو، اللہ کے غضب کے حق دار نہ بنو۔ یہ کتاب تمہاری ہدایت کے لیے ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔“

”موسیٰ! ہم تیری باتیں سنیں گے ضرور لیکن ہم اس صحرا میں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ شقت کرتے رہیں۔ اپنے خدا سے کہو اس میں آسان باتیں لکھ کر دے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی گستاخیوں کے باوجود رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے اور قوم کا یہ حال کہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔ وہ قوم کی بے راہ روی کا گلہ کرتے ہی رہے تھے لیکن اس وقت ان پر ان کے تیز مزاج کا غلبہ تھا کہ نہایت سخت الفاظ استعمال کر بیٹھے۔

”اے اللہ! یہ قوم اب میرے اختیار میں نہیں رہی۔ یہ تیری کتاب کے احکام تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ تو اب ایسا کر کہ میرا نام ہی اس کتاب سے منادے۔ میں اب ان سے یہ کہنے کا نہیں کہ یہ کتاب مجھے دی گئی ہے اور تم اسے تسلیم کرو۔“

فوراً ندا آئی۔ ”موسیٰ! تم دل چھوٹا کیوں کرتے ہو۔ ان نافرمانوں کے لیے میں تجھے ایک معجزہ عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ پر تو مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور جس پر تیرے سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا اور جس پہاڑ پر ہونے والی گفتگو کو یہ جھٹلا رہے ہیں، وہی پہاڑ ان کے سروں پر آ کر کھڑا ہوجائے گا۔ جب یہ مانیں گے کہ تو میرا سچا پیغمبر ہے اور تورت گجی کتاب ہے۔“

یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ بادل گرے اور بجلی چمکنے لگی۔ کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ بنی اسرائیل اپنے ڈیروں میں بیٹھے کانپ رہے تھے پھر وہ دشت زدہ ہو کر باہر نکلے۔ کوہ طور ان کے سامنے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ ان میں سے بہت سے کہنے لگے کہ وہ قیامت آگئی ہے جس کا ذکر موسیٰ اکثر کرتے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ پہاڑ کو جنبش ہو رہی ہے جیسے وہ اپنی جڑیں چھوڑ رہا ہو۔ انہوں نے اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا سمجھا لیکن یہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ پہاڑ نے زمین چھوڑ دی اور اوپر کی طرف اٹھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بلند ہو گیا کہ ان کے سروں پر سائبان کی طرح چھا گیا۔ اب تو چیخنے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب انہیں موسیٰ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے کچھ دنوں سے اپنے ارشادات میں کہنا شروع کر دیا تھا اگر

انہوں نے تورت کو قبول نہیں کیا تو وہ پہاڑ جس پر تورات نازل ہوئی، تمہارے سروں پر چھا جائے گا اور زبان حال سے کہے گا کہ اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے تو تسلیم کرو کہ جو خدا تمہیں یہ معجزہ دکھا سکتا ہے، اسی نے تمہیں تورت دی ہے۔ یہ بے جا جان پتھر کا ٹکڑا (پہاڑ) اپنے رب کا حکم سننے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا مگر تم ہو کہ اپنے گھمنڈ میں غفلت کے پردے میں جیسے ہوئے ہو۔ تورت کو قبول کرو اور ان میں درج احکام پر عمل کرو۔ یہ نہیں کہ اپنی سہولت کی چیزیں قبول کر لو اور باقی کو رد کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان ارشادات کو یاد کرتے ہی وہ سمجھ گئے کہ اللہ کا غضب ان کے سروں پر آ پہنچا ہے۔ اب اگر انہوں نے ذرا بھی دیر کی تو یہ پہاڑ ان کے سروں پر آ گرے گا۔ وہ بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ کن آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے کہ پہاڑ انہیں کھلنے کے لیے نیچے ٹوٹیں آ رہے اور دل ہی دل میں اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے جاتے تھے۔

وہ اس وقت تک سجدے میں پڑے رہے جب تک انہوں نے ترجمی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیا کہ پہاڑ ان کے سروں سے ہٹ گیا اور اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ دھواں ختم ہو گیا، بادل چھٹ گیا۔

یہ یہودی آج تک کے لیے سنت ہو گئی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس سجدے سے بڑھ کر کوئی سجدہ نہیں جس نے ہم پر سے عذاب ٹھوکانا۔

بہت دیر بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں تو انہوں نے سر کو سجدے سے اٹھایا اور ہر قبیلے نے اپنے اپنے نمائندوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے تورات کی قبولیت کا وعدہ کریں۔

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور کو اٹھایا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور پھر تم نے اس کے بعد پیٹھ پھیر لی۔ پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو

بنی اسرائیل نے وادی میں کھڑے ہو کر ان لوگوں کو طور کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ جب یہ افراد طور پر پہنچ گئے تو ایک سپید بادل کی طرح ”نور“ نے پہاڑ کو ڈھانپ لیا ہے۔

یہ دراصل جمالِ خداوندی کا نور تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھیر لیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الہی میں عرض کیا۔

”اے رب ذوالجلال! تو میری قوم کے حالات سے واقف ہے۔ ان کی بے جا خندوں کو بھی جانتا ہے۔ اب انہوں نے اپنی نادانی سے یہ ضد پکڑ لی ہے کہ وہ تورات کو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک انہیں تصدیق نہ ہو جائے کہ یہ کتاب تو نے ہی انہیں دی ہے۔ میں ان کی ضد پر سزا دی انتخاب کر لیا ہوں تاکہ وہ بھی اسے قبول کر لیں اور تیری ہم کلامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کر دیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور کر لی گئی لیکن ان سرداروں نے وہی اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں۔ ان کے اس بے جا مطالبے پر غیرت الہی جوش میں آگئی۔ پہاڑ اس طرح ہلنے لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ایک ہیبت ناک چمک نے ان کو آ لیا اور جلا کر خاک کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ باجرا دیکھا تو سجدے میں گر گئے۔ یہ دعا ان کے ہونٹوں پر تھی۔

”الہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ اے خدا! اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے۔“

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش کی لاج رکھی اور ان سب کو اپنی قدرت سے دوبارہ حیات بخش دی۔

”موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے سزا دی چنے پھر زرا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا تو موسیٰ نے عرض کیا۔ پروردگار! اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا اور میری زندگی بھی ختم کر دیتا۔ پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے بھلا دے جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دے۔ خدا یا تو ہمارا ولی ہے۔ ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر۔“ (سورۃ اعراف)

”اور جب تم نے کہا۔ اے موسیٰ! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں پس آنکھوں دیکھتے تمہیں بجلی کی کڑک نے آچکرا۔ پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گزار رہو۔“ (سورۃ بقرہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔ خدا نے انہیں دوبارہ زندگی دے دی اور اس طرح کہ ایک دوسرے کو نہ صرف زندہ ہوتے ہوئے دیکھا بلکہ ان کے کپڑے بھی وہی تھے جو انہوں نے مرنے سے پہلے پہنے تھے۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور انہیں بجلی کی وہ کڑک یاد آتی تھی جو انہوں نے مرنے سے پہلے سنی تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے، ہم تو مر گئے تھے پھر ہمیں زندہ کس نے کیا؟ یہی سوال انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”یہی تو رب ہے جو موت کا بھی مالک ہے اور زندگی کا بھی۔ جو مجھے دکھاتا ہے اور جو ہر شے پر قادر ہے۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا عام قانون تو یہی ہے کہ مرنے کے بعد عالمِ آخرت ہی میں دوبارہ زندگی ملے گی لیکن وہ ہر شے پر قادر ہے اس لیے اس نے تمہیں اس دنیا ہی میں دوبارہ حیات دے دی تاکہ تم اسے پہچانو اور اس کی تسبیح کرو۔“

ان سب نے اقرار کیا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے موسیٰ سے کلام کیا اور اسے کتاب دی۔ ہم قوم کے سامنے جا کر اس کی تصدیق کریں گے۔ اس کتاب پر خود بھی عمل کریں گے اور دوسروں کو بھی مجبور کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پورا اطمینان تھا کہ تصدیق ہو چکی۔ اب قوم کو تورات قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوگا۔ ہر قبیلے کے سرداروں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ کیا اب بھی وہ کوئی عذر پیش کر سکیں گے؟

ان نمائندوں نے قوم کے سامنے تصدیق کر دی۔ تقاضا تو یہ تھا کہ اب وہ کسی جنگ و جدوجہد کے بغیر اسے تسلیم کر لیتے لیکن انہوں نے عجیب بحث شروع کر دی۔

انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ”اے ہم پر کھول کر بیان کرو۔ جو باتیں آسان ہوں گی انہیں تو ہم قبول

سنیں، ڈانچیں،



پانی کے جانوروں میں جن کے پر اور پھلکے ہوں تو انہیں کھانا۔ جن کے پر اور پھلکے نہیں، وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں۔ پرندوں میں جو تمہارے لیے مکروہ ہیں اور جن سے تمہیں کراہیت کرنا ہے، وہ یہ ہیں۔ عقاب، چیل، ہر قسم کا باز اور ہر قسم کے کوءے، شتر مرغ، چخدر اور ہر قسم کے شاہین، الو، گدھ، سب قسم کے بگے، بدہد اور چکاڈز بھی تم پر حرام کیے گئے ہیں۔ پردار بگئے والے جاندار جتنے چار پاؤں پر چلتے ہیں، وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں۔

نیلہ، چوہا اور ہر قسم کی بڑی چھچھلی تمہارے لیے حرام ہے، ان سب حرام جانوروں اور پرندوں کو کھانا تو بڑی بات، ان کو چھونے سے بھی تم نا پاک ہو جاؤ گے۔ جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو چھوئے گا، وہ شام تک نا پاک رہے گا۔

”ہمیں کچھ اور باتیں بتاتا کہ ہماری زندگیوں کا پکڑہ ہوں۔“

اس سوال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں چند نصیحتیں کیں۔

ابھی آپ کا خطاب جاری تھا کہ ایک شخص نے عجیب سا سوال کر ڈالا۔

”میں آپ کو تو جانتا ہوں، کسی اور کو نہیں جانتا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچ کر اپنا نام لے دیا کہ اس شخص کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو اور وہ میرا مطیع بن کر ہے۔ دوسرے لوگ جو شیخ، وہ بھی میری نبوت پر ایمان کا نام نہیں۔

”موسیٰ! تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اس کو علم الہی کے سپرد کرتے اور کہتے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”تیرے قریب ہی ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے پاس وہ علم ہے جسے تو نہیں جانتا۔“

”میرے مالک! تو نے یہ بتا کر مجھے بے چین کر دیا کہ میرے قریب ہی ایک ایسا شخص ہے جو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔  
 اُسے بتا کہ میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟“

لو جو مناسب سمجھا اسے دیا۔“

سینئر ڈائجسٹ 213 اگست 2018ء

یہ جماعت رخصت ہوئی اور اپنے اپنے قبیلوں میں جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اب بنی اسرائیل کے لیے پیچھے ہٹنے کا کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے سروں پر پہاڑ کو منڈلاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے پیغام سنا اور جس جس کے پاس جو کچھ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نذرانے کے طور پر لانا لگے۔

ایک قبیلہ ایسا بھی تھا جو صنعت کاری میں اور سونے چاندی اور تیش کے کام اور جڑاؤ پتھر اور گلدی کو تراشیدہ مہر،

ان کارندوں نے خیر اجتماع کی تیاری کے لیے کام شروع کر دیا۔ دوسرے کارگیر ”عبد کا صدوق“ بنانے میں مشغول رہے۔ انہوں نے یہ صدوق خدا کے حکم کے مطابق نیکری لکڑی کا بنایا۔ اس کی لمبائی دو اسی ہاتھ اور چوڑائی دو ہاتھ ہاتھ اور اونچائی دو ہاتھ تھی۔

جب سب کام پایہ تکمیل کو پہنچ گئے تو بنی اسرائیل نے حضرت مکیا علیہ السلام کو بتایا کہ:

دست شروع کر دی۔ چڑھاوے بھی چڑھائے جانے لگے، قربانیاں بھی دی جانے لگیں۔  
 خدا اب بھی اسرائیل سے مطمئن نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بار بار وحی آتی رہتی کہ: "میرے بندوں میں سے جو تمہارے ساتھ ہیں، ان میں سے کچھ تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔ انہیں تم سے الگ کر دو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا فریضہ بخوبی انجام دیتے رہے۔

بنی اسرائیل کو اپنے حالات کے مطابق جو بھی مشکل پیش آتی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور ان سے  
تھے کہ تیرے خدا نے اس بارے میں کیا احکام صادر کیے ہیں۔

ایک روز آپ خطاب فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے حرام و حلال کے بارے میں سوال کیا۔ ”آپ سے بتائے کہ حلال اور حرام کیا ہے؟“

اپنے بتائے کہ ہمارے لیے کن جانوروں کو حلال کیا گیا ہے اور کن جانوروں کو حرام۔“  
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”زمین کے جن حیوانات کو تم کھا سکتے ہو، ان کی پکوان یہ ہے کہ جانوروں میں جن

ہوئے نہیں، تم ان کو نہ کھانا چھیے اونٹ کیونکہ وہ چگالی کرتا ہے مگر اس کے پاؤں الگ نہیں۔ سو وہ تمہارے لیے حرام  
خوش کنی تم پر حرام ہے کیونکہ وہ بھی چگالی کرتا ہے اس کے پاؤں الگ نہیں۔ سو مجھے بتاؤ کہ اگر تم اس کے پاؤں

کے پاؤں الگ اور چمے ہوئے ہیں لیکن وہ جگہ کی ہیں کرتا۔

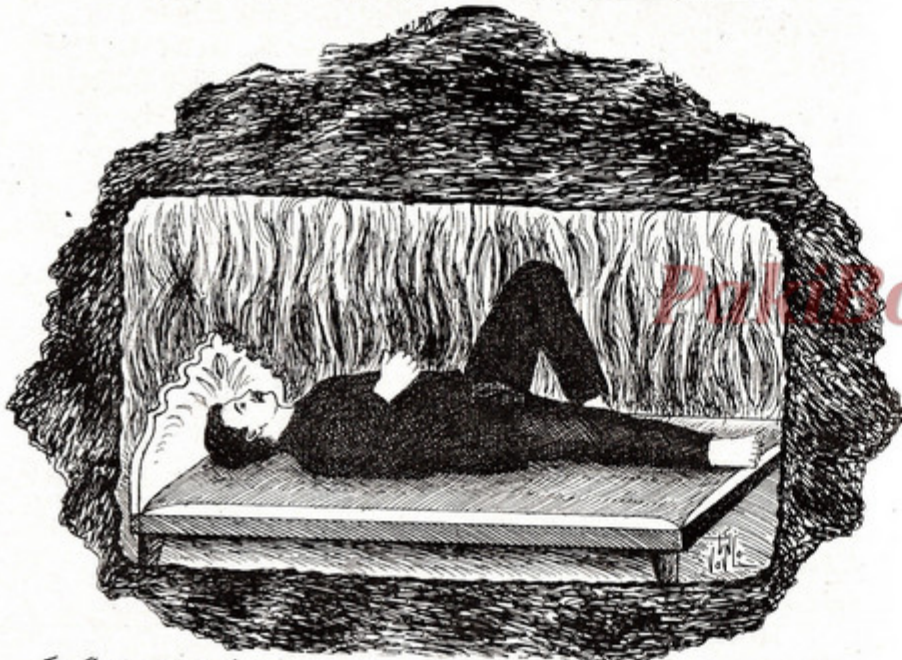


## شک

بابراخوان

کبھی کبھی زندگی کے کچھ خاص دن دل پر اتنے گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی پہلو سے پوری جزیات کے ساتھ یاد رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی واقعے کے کچھ یادگار حوالے ہیں جب زندگی کے گرد قص اجل جاری تھا اور کوئی رستہ فرار کاممکن نہیں تھا لیکن انہی ناممکنات میں سے کچھ ممکن لمحات بھی اپنا کام کر گئے... اور ایک ذرا سے شک نے کسی کی زندگی کا پورا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

ایک ایماندار پر جوش پولیس آفیسر کی باریک بین نگاہوں کا کمال



کے موضوع پر اس طرح بات کرتا کہ اس سے ٹریننگ کے بعد شاگرد... عملی زندگی میں جا کر ان شعبوں میں بڑی مہارت حاصل کر لیتے تھے۔ میں نے خود اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ سب سے زیادہ کارآمد سبق وہ یہ تھا کہ ”مستقل مزاجی سے محنت جاری رکھو۔ شک ذرا سا بھی ہو، اسے نظر انداز نہ کرو۔ شک باپ پر بھی ہوتا ہے بھی شامل تفتیش کرلو۔ تمہاری ساری ہمدردی مظلوم کے لیے ہو۔“

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب میں بطور اے ایس پولیس ٹریننگ کے دوران ہی میرے انشورنگ کی چھوٹی چھوٹی چیز نگاہوں نے میری غیر معمولی ذہانت کو جانچ لیا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا۔ ستر سال کی عمر ہونے کے باوجود اس کی صحت قابل رشک تھی۔ دراز قد، چاق و چوبند، کسرتی جسم کا مالک، ہمارا یہ انشورنگ، روزانہ صرف ایک گھنٹے کا کیچر دے کر غائب ہو جاتا تھا اور پھر دوسرے دن کلاس روم میں مقررہ وقت پر ہی نظر آتا۔ اس کی زبان کرخت تھی لیکن سراغ رسانی اور تفتیش

تلاش کرتا نہیں پڑے گا۔ وہ شخص خود تمہارے پاس آئے گا۔ تمہارا دل گواہی دے گا کہ یہی وہ مرد صالح اور دانا شخص ہے جس کے پاس تمہیں بھیجا گیا ہے۔“

حضرت موئی علیہ السلام کو یہ بتا کر اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔ اب انہیں روانہ ہونا تھا اور اس طرح کہ کسی کو اس سفر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ اسکیلے جانے سے ہچکچاہٹ بھی رہے تھے۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو طلب کیا اور انہیں سارا ماجرا سنایا۔

”میں چاہتا ہوں اس سفر میں تم میرے ساتھ چلو۔ تم سے رازداری کی امید رکھ سکتا ہوں۔ تم یہاں بھی کسی سے کچھ نہ کہنا اور وہاں جا کر بھی خاموش رہنا۔“

یوشع بن نون نے سامان سفر تیار کیا اور ایک بھی ہوتی مچھلی بھی اپنے ساتھ رکھ لی لیکن یہ سوچ ضرور رہے تھے کہ یہی ہوتی مچھلی آخر کس طرح راہنمائی کرے گی۔

جب سامان سفر تیار ہو چکا تو حضرت موئی علیہ السلام، یوشع بن نون کے ساتھ اس نامعلوم سفر کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ وہ جنوب مغرب کی سمت سفر کر رہے ہیں۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خشکی کتنے دنوں کا سفر طے کرنے کے بعد ختم ہوگی اور دو پانیوں کے ملاپ سے خداوند تعالیٰ کی کیا مراد ہے۔ کون سے دو سمندر ہوں گے جو کسی مقام پر آپس میں ملتے ہوں گے۔

سفر دشوار گزار تھا لیکن منزل تک پہنچنا بھی ضروری تھا۔

کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ دونوں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بحیرہ روم اور بحیرہ احمر آپس میں ملتے تھے۔ حضرت موئی علیہ السلام نے اس مقام کو غور سے دیکھا۔

”یوشع! شاید یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کے لیے مجھے کہا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہمیں یہاں سے کنارے کنارے سفر کرنا ہوگا۔“

”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میرا بھی ٹھنکن سے برا حال تھا۔ میں آپ سے کہہ نہیں سکا لیکن دل یہی چاہتا تھا کہ یہاں کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔“

انہوں نے وہ تھملا ایک طرف رکھ دیا جس میں مچھلی تھی اور ایک پتھر کو تکیہ بنا کر لیٹ گئے۔ حضرت موئی علیہ السلام نے بھی ایک پتھر کو تکیہ بنالیا۔

”ایسا نہ ہو کہ ہم پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور کوئی تھملا اٹھا کر چلتا ہے۔“ حضرت موئی علیہ السلام نے کہا۔

”یا اللہ کے رسول، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کوئی انسان تو کیا کوئی جانور بھی دو دو رنگ نہیں۔ تھملا کون اٹھائے گا۔“

”پھر بھی ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ تم ایسا کرو، لیٹتے وقت تھیلے پر ہاتھ رکھ لو۔“

حضرت یوشع اس طرح لیٹ گئے کہ ان کا ایک ہاتھ تھیلے پر تھا۔

دونوں اتنا تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی نیند آنھوں میں اتر آئی۔ نہ جانے کتنی دیر سوتے رہے تھے کہ حضرت یوشع کو نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے ہاتھ کو تھیلے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ کچھ دیر اسے خواب سمجھتے رہے لیکن پھر اچانک مچھلی کا خیال آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اتنی دیر میں ایسا ہوا کہ ان کے اٹھنے کے بعد مچھلی میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور وہ تھیلے سے نکل کر سمندر میں چلی گئی۔ مچھلی پانی کی جس سطح پر بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی، وہاں کے پانی نے برف کی طرح جم کر پگھلنے کی شکل اختیار کر لی تھی معلوم ہوتا تھا سمندر میں ایک لکیری مچھلی تھی ہے۔ حضرت یوشع نے یہ منظر دیکھ لیا اور انتظار کرنے لگے کہ حضرت موئی علیہ السلام بیدار ہوں تو انہیں یہ واقعہ سنایا جائے۔

(جاری ہے)

## ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریث،..... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔







”ایک کام کرنا شرافت خان!“ میں نے چوکی انجارج سے کہا۔ ”ٹھیکیدار میر حسن کو اطلاع دے دو کہ وہ چوکی پر آجائے، ہم وہاں چوکی میں ہی آئیں گے۔“

ہینڈ کاشیٹیل ہمیں اس عورت کے گھر کے باہر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ دروازے پر دستک دی تو تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ اندھیرا گہرا ہونے کی وجہ سے لڑکے کی شکل واضح نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا اور یونس کا تعارف کرایا اور لڑکے سے کہا کہ اندر جا کر کہو کہ آپ نے جو درخواست دی تھی، ہم اس سلسلے میں آئے ہیں۔ لڑکا فوراً اندر چلا گیا اور دو منٹ بعد ہی ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آگئی۔ اس کے ذیل ڈول سے پتا چلتا تھا کہ وہ مڈل کلاس کی معزز عورت ہے۔

وہ ہمیں اندر لے گئی۔ شکل صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کی خوب صورتی باقی تھی۔ جولا کا باہر آیا تھا، وہ بھی خوب صورت تھا۔ عورت کے چہرے پر اداسی تھی۔ مڈل کلاس کا یہ گھرا چھا اور صاف ستھرا تھا۔ عورت نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ ہمارے منہ بند کرنے کے باوجود وہ چائے بنا کر لے آئی۔

عورت کا بیان شروع ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اپنے بیٹے جمال کو یاد کرتی رہی۔ اس کا ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا، جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ ہماری دستک پر بیٹا لڑکا باہر نکلا تھا۔ اس عورت کے شوہر کو فوت ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس کا ایک بھائی اسے کچھ پیسے دے جاتا تھا۔ یہ مکان اس کا اپنا تھا۔ جمال احمد اس کا بڑا بیٹا تھا جسے اس نے میٹرک تک پڑھا کر ٹھیکیدار میر حسن کے پاس ملازم رکھوا دیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بیٹا بھی نہ رہا۔ عورت نے اپنا نام خالدہ بتایا تھا۔

”آپ یہ بتائیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کو یہ شک کیسے ہوا ہے کہ آپ کے بیٹے کو دھکا دے کر آگ میں گرایا گیا تھا؟“

”میرا بیٹا جمال ہر رات خواب میں آتا ہے۔“ خالدہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ ”ہر رات ایک ہی بات کہتا ہے کہ میرے قاتلوں کو پکڑو، میں خود نہیں کرتا تھا۔“

”کیا وہ یہ نہیں بتاتا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں!“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”میں پوچھتی ہوں تو بھی نہیں بتاتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خود آگ میں نہیں گرا۔“ یہ تو اب کے جذبات تھے، جن کا اظہار وہ اس طرح

کر رہی تھی کہ اس کا بیٹا ہر رات اسے خواب میں ملتا ہے۔ میں نے یونیس نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ یہ اس کا وہم ہے اور اس کے جذبات ہیں۔ میں اس وقت تک قتل کی بے شمار وارداتوں کی نقش کش کر چکا تھا اور ایسی بہت سی ماحول میرے سامنے آئی تھیں، جن کے جوان بیٹے قتل ہو گئے تھے، وہ سب ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔

ہم دونوں پولیس آفیسر، اس کے جذبات کا ساتھ دیتے رہے اور اسے یہی تاثر دیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ہم حقائق معلوم کرنا چاہتے تھے تاکہ قاتل کو پکڑ سکیں۔

یہ میرا تجربہ تھا کہ بعض اوقات حادثاتی موت، جس کے متعلق ڈاکٹر یا اور کوئی یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ موت اتفاق یا قدرتی ہے..... وہ قتل کی واردات نکلتی ہے۔ اس لڑکے کی موت بھی قتل کی واردات ہو سکتی تھی۔ ہم نے خالدہ سے حقائق معلوم کرنا شروع کیے۔

”وہ بچنے پر کیا کام کرتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا بیٹا، بچنے پر ملازم نہیں تھا۔“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”ٹھیکیدار کا کلرک یا پیشی کہہ لو۔ ٹھیکیدار کے گھر بھی جاتا تھا اور گھر کی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ پوری کرتا تھا۔ ایک ڈیوٹی اس کے ذمے اور بھی تھی..... ٹھیکیدار میر حسن کی بیٹی کا کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے لیے باپ نے انجمن تالکا لگوا دیا ہوا ہے۔ میرا بیٹا جمال صبح اس لڑکی کے ساتھ کالج تک جاتا تھا اور چھٹی کے وقت کالج سے اسے گھر لاتا۔ ٹھیکیدار اس کام کی اسے الگ تنخواہ دیتا تھا۔ پانچ چھ دنوں سے وہ بچنے پر جا رہا تھا کیونکہ بچنے کا منشی چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا اور جمال نے بچنے پر حساب کتاب کرنا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا.....“ میں نے کہا۔ ”کہ ٹھیکیدار کو آپ کے بیٹے پر بہت ہی اعتماد تھا۔“

”جی ہاں۔“ خالدہ نے کہا۔ ”یہ اعتماد کی ہی بات تھی کہ میر حسن میرے بیٹے کو اپنی بیٹی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ ٹھیکیدار میر حسن ہمارا دور کارٹھے دار بھی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے میر حسن کا ایک بیٹا تھا جس کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اتنے مکان بننے ہی کہاں تھے۔ ہندو اور سکھ مکان بناتے تو ہندوؤں اور سکھوں کے بھنوں سے ایشیائیں لیتے۔ جنگ شروع ہوئی یعنی پاکستان بنا تو میر حسن کا بیٹا بھی چل پڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا ٹھیکیدار بن گیا اور دولت اس کے گھر کی غلام بن گئی۔ کار، گاڑی، بینک بیلنس اور نوکر چاکر سب کچھ اسے میر ہو گیا۔ میرا خاندان تو

ہو گیا تھا۔ میر حسن نے میرے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ جمال کو اپنے ہاں ملازمت دے دی کیونکہ اس وقت وہ میٹرک پاس کر چکا تھا اور وہ اسے اچھی تنخواہ دینے لگا۔ حادثے کے بعد جمال جل کر فوت ہو گیا تو ٹھیکیدار میر حسن نے مجھے تیس ہزار روپے پیش کیے تھے مگر میں نے رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میں اپنے بیٹے کی قیمت نہیں لوں گی۔“

”آپ کو ٹھیکیدار پر تو شک نہیں ہوگا؟“ راجا یونس ملک نے پوچھا۔

”اس پر تو شک نہیں ہونا چاہیے۔“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میر حسن کے خلاف مجھے شکایت ضرور ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”میں نے رقم قبول نہیں کی۔“ خالدہ بولی۔ ”بلکہ میں نے اسے کہا کہ مجھے تھانے لے چلو، کیونکہ مجھے شک ہے کہ میرے بیٹے کو آگ میں زبردستی جلا دیا گیا ہے۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ ایسے فضول شک نہ کرو۔ سب کہتے ہیں کہ تمہارا بیٹا پھسل کر مر گیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں خود تھانے چلی جاؤں گی..... میر حسن نے پھر مجھے سمجھایا بجھایا اور چالیس ہزار روپے کی رقم پیش کی، جو میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ٹھیکیدار کو غصہ آگیا اور وہ کہنے لگا کہ تم خود بھی خراب ہو گی اور مجھے بھی خراب کر دو گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اس ضد سے باز نہ آئیں تو دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ چھوٹے بیٹے کو میٹرک پاس کر لینے دو، میں اسے جمال کی جگہ اپنے پاس رکھ لوں گا۔“

”ایک بار پھر سوچ لیں۔“ میں نے تکی سے کہا۔ ”اگر آپ کو ٹھیکیدار پر شک ہے تو ہمیں صاف صاف بتائیں۔“

”میر حسن پر شک کی کوئی وجہ نہیں۔“ خالدہ نے جواب دیا۔ ”اتنے امیر کبیر آدمی کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسے تو جمال پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی جوان بیٹی کو میرے بیٹے کے ساتھ بھیجا کر رہا تھا۔“

”یہ بھی دشمنی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے خاتون!“ میں نے کہا۔ ”اس کی لڑکی جوان ہے اور آپ کا بیٹا بھی جوان تھا۔ ہو سکتا ہے ان دونوں میں ایسی بے تکلفی ہو، جس کا میر حسن کو پتا چل چکا ہو۔“

”میں یہ نہیں مان سکتی۔“ خالدہ نے کہا۔ ”میرا جمال اتنا ہوشیار اور چالاک نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ٹھیکیدار مجھ سے گلہ کرتا اور جمال کو نوکری سے بھی نکال دیتا۔ ہمارے لیے یہی سزا کافی تھی۔“

ٹھیکیدار میر حسن نے خالدہ کو تیس ہزار کی رقم پیش کی

تھی اور پھر یہ رقم چالیس ہزار کر دی۔ خالدہ نے یہ رقم قبول نہ کی اور وہ تھانے چلی گئی۔ تھانیدار شرافت علی خان نے اس سے کہا کہ اسے شک ہے تو کوئی گواہ ساتھ لائے اور اپنا شک ثابت کرے۔

ہم جاننے میں کہ پولیس والے ایسی بات اس صورت میں کرتے ہیں جب وہ کوئی گواہ لانا چاہتے ہوں۔ جبکہ خالدہ کے پاس ایک شہادت اور اور بھی ایک جوت تھا کہ اس کا بیٹا خواب میں اس سے کہتا تھا کہ وہ آگ میں خود نہیں مگر بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

دو سب سے گزر گئے۔ جمال کا چالیسواں ہوا تو میر حسن ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ خالدہ دو تین مرتبہ پھر تھانے چوکی گئی۔

جس آدمی نے اس کی درخواست ایس بی طاہر وقار صاحب تک پہنچائی تھی، وہ اس کے شوہر کا دوست تھا۔ ایک روز یہ خالدہ کے گھر گیا تو خالدہ نے اسے اپنے شک کے بارے میں بتایا۔

اس غمزدہ ماں سے ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی، جس سے کوئی شک واضح ہوتا۔ صرف ایک بات ایسی تھی جو مجھے مشتبہ کر رہی تھی اور وہ یہ کہ جمال ٹھیکیدار کی بیٹی کو کالج لے جاتا تھا اور پھر واپس بھی لاتا تھا۔

جس شخص کو اچانک دولت مل جائے اور اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی دولت نہ دیکھی ہو تو اس کا اپنا دماغ خراب ہو یا نہ ہو، اس کی اولاد کا لازمی خراب ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ میر حسن کی یہ بیٹی اخلاقی لحاظ سے کیسی ہے؟ رات کے بارہ بج رہے تھے جب میں اور یونس اسی مسئلے پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے چوکی چلے گئے۔

ٹھیکیدار میر حسن تھانیدار شرافت خان کے پاس بیٹھا تھا..... وہ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر کا آدمی تھا۔ شکل صورت سے معزز لگتا تھا۔ وہ جس طرح ہم سے ملا، میری رائے میں وہ شاندار اور مہذب آدمی تھا یا پکا استاد تھا اور ہر ڈھنگ سے کھیلنا جانتا تھا۔ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میر حسن کو کھٹے پر لے جائیں گے۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ صبح دو بجنے پر ہمیں ملے۔ رات کافی ہو چکی تھی اور ہمیں آرام کی سخت ضرورت تھی۔ شرافت خان نے پہلے سے ہی ایک کمرے میں میرے اور میرے ماتحت سب انسپکٹر یونس ملک کے لیے بستر لگا دیے تھے اور باقی محلے کو دوسرے کمرے میں ٹھہرا دیا۔

پولیس چوکی سے پھرتا تقریباً سب گلو میٹر دور تھا۔ جونہی



ہماری جیب بھنے پر پہنچی میر حسن دوڑتا ہوا ہمارے استقبال کے لیے لپکا۔

ایک کھلی سی جگہ پر میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ہمارے ناشتے کا پرکھٹا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم اس جگہ پر گئے، جہاں سے جمال آگ میں گرا تھا۔ پچھلے کی جگہ گولائی کے بجائے لیوڑے انداز کی خندق ہوتی ہے جس میں چکی ایشیں ایک خاص ترتیب سے جوڑی جاتی ہیں۔ یوں تمبھیں کہ ایک ترتیب میں ڈیر ساربن جاتا ہے۔ ڈیر کے درمیان ایک خاص فاصلے پر جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ کونکے، لکڑیاں یا چٹنے والی اشیاء رکھ انہیں آگ لگا دی جاتی ہے پھر اس ساری خندق کو اوپر سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں آگ جل رہی ہو، وہاں اوپر لوہے کے ڈھکن رکھ دیے جاتے ہیں اور ایک جگہ چکی رکھ کر ادھر ادھر سے باندھ دی جاتی ہے۔ اس سے تمام بھنے کا دھواں باہر نکلتا ہے۔

ٹھیکیدار میر حسن نے ہمیں وہ جگہ دکھائی، جہاں سے جمال پھسل کر آگ میں گرا تھا۔ میں نے اور پولیس ملک نے بھنے کے کنارے کو غور سے دیکھا۔ میں نے پولیس کی جانب اور اس نے میری طرف دیکھا کیونکہ وہاں پھسلنے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر ہم نے میر حسن کو اپنے رد عمل کا احساس نہیں ہونے دیا۔ آپ ایک دس فٹ گہری خندق کا تصور ذہن میں لائیں۔ اس میں آگ جل رہی ہے۔ خندق کے قریب جاؤ تو چش اتنی زیادہ ہوگی کہ آپ اس کے کنارے تک جانے کی ہمت نہیں کریں گے۔

بھنے کی آگ تو خاصی تیز ہوتی ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ جمال کنارے تک چلا گیا تھا۔

”کیا وہ اکیلا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ میر حسن نے جواب دیا۔ ”مزدور بہت ہیں، اس لیے میں نے ان پر ایک میٹ مقرر کر رکھا ہے، جو انہیں سنبھال سکتا ہے۔“

”کیا اس وقت آپ بھی یہاں موجود تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ باتیں میٹ نے بتائی تھیں۔“

”اور آپ نے اس کی ہر بات سچ مان لی؟“ میں نے کہا۔ ”تھانے چوکی میں آپ نے کیا رپورٹ دی تھی؟“

”میں نے کہ میرا ایک ملازم آگ میں گر کر جل گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آپ کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ آپ کے اس ملازم کو کسی نہ کسی وجہ سے آگ میں گرایا گیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی۔“ میر حسن نے کہا۔

”اس پچھارے کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ اسے اس بھنے پر آئے چارہ دن ہوئے تھے۔“ پولیس ملک نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ٹھیکیدار کا میٹ بھی وہیں تھا۔ ہم نے اسے صرف دیکھا، لیکن اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہاں پھسلنے والی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کونکوں میں آدی جھک کر دیکھ لیتا ہے کیونکہ اس میں آگ نہیں، پانی ہوتا ہے لیکن بھنے کی اتنی تیز آگ کے قریب کوئی نہیں جاسکتا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مزدور چلے گئے تھے۔ میٹ وہیں تھا اور دو چوکیدار پہنچ گئے تھے۔ ہم نے ٹھیکیدار میر حسن سے کہا کہ وہ رات دس بجے میٹ کو ساتھ لے کر بی ڈویژن پولیس اسٹیشن پہنچ جائے۔

رشت خوری اور ناحق سفارش کے میں ہمیشہ خلاف رہا ہوں۔ جب سے میں نے اس پولیس اسٹیشن کا چارج سنبھالا تھا، بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور میرا تمام عمل اس بات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جتنے بھی کیسوں میں ہاتھ ڈالا، کامیاب رہا۔ اس کیس کی ایک کڑی۔۔۔ میرے ہاتھ لگ چکی تھی، مگر یہ سب کچھ مل از وقت تھا۔

میں اور پولیس ملک وہاں سے ایک خشک لے کر اپنے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ ہم نے انہیں دس بجے کا وقت دیا تھا اور ہم ایک گھنٹا تاخیر سے آئے۔ یہ میرا طریقہ تھا۔ مشتبہ افراد کو میں کئی گھنٹوں انتظار میں رکھتا تھا تا کہ وہ ذہنی طور پر نڈھال ہو جائیں۔ پہلے میں نے ٹھیکیدار میر حسن کو بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر اس سے چند سوال کیے جن کے جواب میں اس نے وہی باتیں بتائیں جو جمال کی والدہ بتا چکی تھی۔

”جناب انسپٹر صاحب۔“ میر حسن نے کہا۔ ”مجھے اس لڑکے جمال کے مرنے کا اتنا زیادہ غم ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بے چارہ یتیم تھا اور چھوٹے بھائی اور بیوہ ماں کا واحد سہارا بھی وہی تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس ذات نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں جمال کو نوکری پر لگا کر خاصی زیادہ تنخواہ دیتا رہا۔ بڑا شریف اور قابل اعتماد لڑکا تھا، اس کی موجودگی میں مجھے حساب کتاب اور روپے

بیسے کی طرف سے بے فکر رہتی تھی۔ میں اسے اپنی جوان بیٹی کے ساتھ کالج بھیج دیا کرتا تھا اور یہی لڑکا میری بیٹی کو کالج سے واپس بھی لاتا تھا۔ خدا کی قسم! میں اس کی ماں کا سامنا نہیں کر سکتا۔“

اس نے اپنے بیان کا یہ حصہ روٹی صورت بنا کر مجھے سنایا۔۔۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی رو پڑے گا۔

”آپ نے اس کی والدہ کو تیس ہزار روپے دیے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ رقم اس نے نہیں لی، پھر آپ نے اس میں دس ہزار کا اضافہ کر دیا۔۔۔ اس نے یہ رقم بھی نہیں لی، تو آپ نے اسے دھکی دی کہ تم دوسرے بھنے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔۔۔ آپ نے اسے یہ دھکی کیوں دی تھی؟“

”نہیں جناب انسپٹر صاحب!“ اس نے ذرا گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں نے خالدہ کو ایسی کوئی دھکی نہیں دی، بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تمہارا دوسرا بیٹا میٹر کر لے، تو میں اسے اپنے پاس اتنی ہی تنخواہ پر ملازمت پر رکھ لوں گا، جتنی تنخواہ پر جمال کو رکھا تھا۔ اصل بات یہ ہے جناب! بے چارہ ماں ہے اور اس کا جوان بیٹا مر گیا ہے اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ اسے شک ہے کہ اس کے بیٹے کو کسی نے اغوا کر آگ میں پھینک دیا تھا، بار بار کہتا ہے، چوکی کی طرف دوڑتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ہی اس کا والی وارث ہوں۔۔۔ اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے تھانے سے روکنے کے لیے کوئی سخت بات کہہ دی ہو۔ جسے اس نے دھکی سمجھا ہو، میں نے خود ہی پولیس کو اطلاع دے کر موقع پر بلایا تھا۔

تھانیدار شرافت علی خان صاحب نے بڑی محنت سے تفتیش کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے ذہن میں یہ شک رکھ کر تفتیش کی تھی کہ کسی نے جمال کو آگ میں دھکیلا ہوگا۔ جمال بے چارے کو بھنے پر آئے ابھی چار دن ہی گزرے تھے، یہاں اس کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟“

”جمال آپ کے گھریلو کام کرتا تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ”پھر اسے آپ نے پھینک کر کیوں بھیج دیا؟“

”یہ ایک عارضی تبدیلی تھی۔“ میر حسن نے جواب دیا۔ ”مجھے کاشمیری چھ، سات دنوں کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ پیچھے جو میرے ملازم ہیں، وہ بیسیوں میں گڑبڑ کر دیتے ہیں چونکہ بھنے کی آمدنی ابھی خاصی ہے۔ بددیانت ملازم جتنے چاہے پیسے مار سکتا ہے۔ یہ فٹنی جو چھٹی پر چلا گیا تھا ایماندار آدمی ہے۔ میں نے اس کی جگہ جمال کو بھیج دیا کہ یہ بھی اسی جیسا دیانت دار اور میرے گھر کا اپنا فرد ہے۔“

”کیا یہ فٹنی پہلے کبھی چھٹی پر گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”شاید۔۔۔ مجھے۔۔۔ ہو سکتا ہے۔“ اس کی زبان پھلانگی پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ”میں یہ پوچھ کر بتاؤں گا۔“

اس سوال پر اس کا جواب مل اس کے چہرے پر اور اس کے انداز میں ظاہر ہوا، وہ میرے لیے ایک واضح اشارہ تھا۔ میں نے اس فٹنی کو بھی بلانے کا سوچ لیا تھا پھر میں نے میر حسن پر سوالوں کی اتنی بوچھاڑ کی کہ اس کی زبان لکڑھڑانے لگی اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ پہلے کیا کیا کہہ چکا ہے۔ میں فی الحال یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ جمال کو اس کے حکم سے آگ میں پھینکا گیا ہے، لیکن میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ جمال پاؤں پھسلنے سے آگ میں نہیں گرا، بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

”میر حسن صاحب!“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو برادرانہ مشورہ دیتا ہوں۔ ابھی آپ کے پاس وقت ہے کہ آپ سچ بات بتادیں تو آپ کے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔ اگر ہمیں دوسروں سے سچ بات معلوم ہوگئی تو پھر آپ نہیں جانتے کہ آپ کا انجام کیا ہوگا، آپ سب کچھ جانتے ہیں ٹھیکیدار صاحب۔ یہ جان لو۔۔۔ کہ اس کیس کی تفتیش انسپٹر جلال کر رہا ہے اور مجھے اس کی کرائم راج اور آئی جی پولیس کی براہ راست حمایت حاصل ہے۔ ابھی تو آپ کے ساتھ باعزت طریقے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے مجبور نہ کریں اور حقیقت بتلا دیں، ورنہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

”آپ کے دل میں کیا شک ہے جناب انسپٹر صاحب؟“ ٹھیکیدار نے پوچھا۔

”شک نہیں ٹھیکیدار صاحب! یقین ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک یقین کو سامنے رکھ کر بات کر رہا ہوں۔ جمال کو آگ میں گرایا گیا ہے اور اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے۔“

”لیکن حضور!“ اس نے کہانے سے انداز میں کہا۔ ”اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔“

”وجہ آپ بتائیں گے ٹھیکیدار صاحب!“ میں نے کہا۔ ”دولت کا فضا تا براہے کہ ذہن اور دل سے خدا کو بھی نکال دیتا ہے۔ ایک وجہ ہے کہ اس لڑکے نے آپ کی بیٹی سے دست دراز کی کی ہوگی یا آپ کی لڑکی اس لڑکے کے ساتھ قابل اعتراض حد تک بے تکلف ہوگئی ہوگی اور آپ نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا ہوگا۔“



میر حسن کو میری یہ بات بری محسوس ہوئی۔ ”آپ میری بیٹی کو ایسا بد چلن نہ سمجھیں۔“ وہ بولا۔ ”اور میں جمال کے بارے میں اور اس کے کردار کے متعلق بھی ایسی کوئی بات گوارا نہیں کر سکتا۔“

”پھر دوسری بات یہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا میٹ (نمبردار) اور کوئی دوسرا آدمی مجھے سے پیسے مارتے ہوں گے اور جمال ان کے لیے رکاوٹ بن گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی کورنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو اور اسے چپ کرانے کے لیے ان لوگوں نے جمال کو آگ میں دھکیل دیا ہو۔۔۔۔۔؟“

”اس بارے میں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”ٹھیکیدار نے کہا۔“ میں خود بھی معلومات لوں گا اور آپ بھی تحقیق کریں۔“

”ٹھیکیدار صاحب!“ میں نے کہا۔ ”آپ سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی عزت قائم رہے۔ میں آپ کو کل شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اپنا برا بھلا سوچ لیں اور آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو وہ بتا دیں، اب آپ جا سکتے ہیں۔“

”ٹھیکیدار کے جانے کے فوراً بعد میں نے میٹ کو بلا لیا۔ وہ چھتیس سال کی عمر کے لگ بھگ تھا۔ اس نے اپنا نام اشرف بتایا تھا اور اچھو بھولا کے نام سے مشہور تھا۔ چھریے بدن اور مضبوط ڈیل ڈول والے، اچھو بھولا کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شریف آدمی نہیں ہے۔

”تم کب سے مجھے پرکام کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً دس سالوں سے مجھے پر ہوں جناب!“

”ایک بات ذہن میں رکھ لو اچھو!“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جھوٹ بولو گے تو چھین جاؤ گے۔ یہ دولت مند لوگ اپنے جرم اور گناہ اپنے ملازموں کے کھاتے میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ تمہارے ٹھیکیدار صاحب بھی کچھ ایسا ہی کرنے والے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی خاص بات ہے تو پہلے ہی بتا دو ورنہ۔۔۔ ہمیں معلوم ہو گیا تو تم پھر ہمارے کٹھنے سے نہیں نکل سکو گے۔ یہ بتاؤ کہ جمال کو ٹھیکیدار نے دوسرے کاموں سے ہٹا کر مجھے پر کیوں لگا یا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے کتنی چھٹی پر چلا گیا تھا۔“ اچھو بھولے نے جواب دیا۔

”کتنی کب سے مجھے پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سات، آٹھ سالوں سے وہ منشی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ پہلے بھی چھٹی پر گیا تھا؟ اور کب؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے۔“ اس نے سوچ کر کہا۔ ”تین سال پہلے وہ چھٹی پر گیا تھا۔“

”کیسا اس وقت بھی میر حسن نے کسی اور کو اس کی جگہ مجھے پر بھیجا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں عالی جاہ!“ بھولے نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔“

”مجھے پر کون شخص ایسا ہے جو پیسے مارتا ہے، یا بے ایمانی کرتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”کوئی بھی نہیں عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔

”باقاعدہ کیش میو بننے ہیں، پیسے مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”پیسے تم مارتے ہو۔“ میں نے اسے ہنر کانے کے لیے جھوٹ بولا۔ ”اسی لیے ٹھیکیدار نے جمال کو مجھے پر بھیجا تھا۔“

”کیا یہ ٹھیکیدار صاحب کہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیکیدار صاحب تو بہت کچھ کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیکیدار نے صرف یہی ایک بات نہیں بتائی۔ وہ تمہاری اور حرم تیس اور کروت بھی بتا رہا ہے۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان دولت مند ٹھیکیداروں اور جاگیرداروں کی وفاداری بڑی خطرناک اور ہنگامی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گناہوں پر، پردہ ڈالنے کے لیے اپنے وفادار نوکروں اور مزارعوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ اگر تم کوئی بات دل میں چھپائے ہوئے ہو تو مجھے بتا دو۔“

میں نے اس کے چہرے پر نمایاں تہذیبی دیکھی۔

میں نے کافی سوال کیے اور اس کے جوابوں پر اتنی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے بدلے ہوئے انداز اور چہرے کے تاثرات کو نوٹ کرتا رہا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں کوئی بات ضرور تھی، جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

عام طور پر بھٹوں میں کافی مزدور کام کرتے ہیں اور ان مزدوروں کو کنٹرول کرنے کے لیے جومیٹ یا انچارج مقرر کیے جاتے ہیں، وہ بکے جرائم پیشہ اور غنڈے ہوتے ہیں۔ خاص کر بھٹوں پر بچی ایشیں بنانے کے لیے پورا پورا کتبہ کام کرتا ہے، ان میں نوجوان لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ میٹ اور مالک ان کو مزدوری سے ہٹا دینے کی دھمکی دے کر اور کام کم کر دینے کا کہہ کر انہیں خراب کرتے ہیں۔ اخبارات میں آئے دنوں خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ بھٹوں پر مزدوروں کے ساتھ نا انصافی، حقوق منہی اور ان کی عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہو رہی ہے۔

ٹھیکیدار میر حسن کا یہ میٹ جس کا نام اچھو بھولا تھا، ایسے ہی بھٹیروں میں سے تھا۔ اس نے خود اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ غنڈا اور بد معاش ہے۔ یہ رائے میری تھی جو میں نے اس کی باتوں اور اس کے انداز سے قائم کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اکیلا میٹ ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی ہے؟

اس نے بتایا وہ اکیلا ہے۔

میں نے اچھو کو تھا۔ نے میں رہی رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اگلے روز میرا ارادہ مجھے پر جا کر مزدوروں سے ملاقات کرنے کا تھا۔ اگر اچھو بھولا مجھے پر ہوتا تو مزدور اس کے ڈر سے کل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔

دو گھنٹے بعد میں نے اچھو بھولا کو پھر بلا کر اپنے سامنے بٹھالیا اور کچھ سوال کیے۔ ”جمال، اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے کیسا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ٹھیک ٹھاک تھا عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔

”اپنے کام سے کام رکھتا تھا، اس لیے سب اس کی عزت کرتے تھے اور دوسرے وہ میر حسن صاحب کے دور کے رشتے داروں میں سے بھی تھا۔“ بھولانے جواب دیا۔

”ٹھیکیدار کی بیٹی کے ساتھ جمال کا کیا چکر چل رہا تھا؟“ میں نے ہوا میں تیر چلایا تھا حالانکہ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کوئی چکر چلا رہی تھی۔ یائیں، میں اچھو کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ مجھے سب معلوم ہے۔

”میں اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا صاحب!“

بھولا نے جواب دیا۔ ”لڑکا ان کا اپنا تھا، ان کے گھر بھی جاتا تھا اور لڑکی کے ساتھ کالج بھی جاتا، آتا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں سنی۔“

”اور لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”لڑکی پردہ نہیں ہے عالی جاہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”برقعے میں کالج جاتی ہے اور گھر سے باہر نہیں نکلتی۔“

ایک اور بات صاحب! ٹھیکیدار صاحب کے اپنے خاندان کی عورتیں ہی نہیں بلکہ ان کی ساری رشتے دار عورتیں بیروں سے میں رہتی ہیں اور صحیح معنوں میں شریف عورتیں ہیں۔ ٹھیکیدار صاحب کو اچانک دولت مل گئی تو انہوں نے شراب چینی شروع کر دی اور دوسری عیاشیوں میں پڑ گئے لیکن ان کی عورتیں جیسے پہلے تھیں ویسی ہی اب ہیں۔“

”جمال جب مجھے میں گرا، اس وقت تم اس کے ساتھ تھے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے آگے جانے سے روکا نہیں تھا؟“

”ہاں عالی جاہ!“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے روکا تھا لیکن پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ گر پڑا اور چل گیا۔ میرا خیال ہے، اسے مجھے کی آگ دیکھنے کا شوق تھا۔“

”یہ شار سوال و جواب کے ذریعے میں جان چکا تھا کہ یہ شخص پکا بد معاش ہے۔ اس کے باوجود میں نے سوالوں کی بوچھاڑ جاری رکھی۔“

اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہ میٹ استاد اور غنڈا ہے۔ اسے میں نے باقاعدہ گرفتار نہیں کیا بلکہ یوں ملک سے کہا کہ اسے تھانے کی حوالات میں ہی رکھے اور ادھر ادھر نہ ہونے دے۔ اگلے روز صبح نو بجے میں مجھے پر پہنچا۔ ٹھیکیدار کو دانستہ اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی گئی۔

وہاں وہی منشی موجود تھا، جس کی جگہ جمال مجھے پر آیا تھا اور جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ گپ شپ کے انداز میں۔۔۔۔۔ میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ مجھے جانتا تھا، گزشتہ روز اس نے میں دیکھا تھا۔

میں نے نوٹ کیا کہ یہ جواں سال منشی خود اعتمادی سے بات کرتا ہے اور اس کا انداز بھی دوستانہ سا ہے اور یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ مزدوروں کے میٹ اچھو بھولا سے مرعوب ہے۔ کیونکہ جب اچھو بھولا کا ذکر آتا تو وہ جھینپ جاتا اور اپنی کوئی رائے نہ دیتا۔

”تم پچھلی چھٹی پر کب گئے تھے منشی صاحب!“ میں نے پوچھا۔

”شاہد تین سال پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان تین سالوں میں تمہیں چھٹی نہیں ملی یا خود ہی نہیں گئے؟“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اشارے سے بتایا۔ ”وہ سامنے جو گاؤں ہے وہاں میرا گھر ہے، کوئی مسئلہ بن جائے تو ایک آدھ دن کے لیے گھر چلا جاتا ہوں۔“

”اب شاید کوئی لمبا کام آن پڑا تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں صاحب!“ اس نے کہا۔ ”ٹھیکیدار صاحب سے ذکر نہ کیجیے گا۔۔۔۔۔ کام کوئی نہیں تھا۔ اشرف بھولا نے ایک دن کہا کہ تم چھٹی لے سکتے ہو پھر لیتے کیوں نہیں؟ ٹھیکیدار نے تمہیں کونسا انعام دے دینا ہے۔۔۔۔۔ کچھ دن کی چھٹی لو، آرام کرو اور گھومو پھر دو۔“

چھٹی والا سوال میری چھٹی حس نے مجھ سے کروا ڈالا تھا اور یہی وہ جواب تھا، جس نے مجھے چونکا دیا۔ اچھو بھولا نے



زبردستی اسے چھٹی پر بھجوا دیا تھا۔ ایک ہفتے کی چھٹی کے ساتھ کچھ رقم بھی تحکیکدار سے لے کر اس کے حوالے کی گئی تھی۔

”چلو اچھا ہوا..... آپ کو کچھ آرام کا موقع تو ملا۔“

میں نے کہا۔

”سیر و تفریح اور آرام کر کے میں چھٹی گزار آیا لیکن جمال بے چارہ، آگ میں گر کر جل مرا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ نہ میں چھٹی پر جاتا نہ اسے میری جگہ بٹھے پر بھیجا جاتا۔“

مٹی بولا۔

وہ تو سادگی میں یہ باتیں کہہ گیا لیکن میرا ذہن اس انکشاف پر اٹک گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مٹی کو چھٹی پر بھجوانا..... جمال کے قتل کی سازش کی ایک کڑی تھی۔ اس

بہانے جمال کو بٹھے پر لانا اور اسے آگ میں پھینکنا تھا۔

مجھے اب اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی کہ یہ سازش اور پلاننگ اکیلے اچھو بھولا کی تھی یا اس میں تحکیکدار میر حسن بھی شامل تھا؟ میں نے مٹی سے اور باتیں بھی پوچھیں لیکن اس کی زبان سے مجھے اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔

”تم تو بڑے اہم آدمی ہو یا ر!“ میں نے مٹی کی پیٹھ پر جھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ بیٹا تم ہی چارہ رہے ہو۔“

اشرف بھولا تو غنڈا گردی کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا ہوگا۔“

اس طرح میں نے اسے خوب ہوا دی تاکہ وہ کچھ اور اگلے دے۔ اسے میں نے دانش منداور کیا کہ خطاب دے ڈالے۔

”ایک بات بتاؤ مٹی صاحب!“ میں نے کہا۔

”جمال کو مرے ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ تم نے چھٹی سے واپس آ کر مزدوروں سے تو پوچھا ہوگا کہ جمال آگ میں کیسے گرا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”تم نے اچھو بھولا سے بھی پوچھا ہوگا، یہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟“

”سب حیران تھے۔“ مٹی عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ”حیران اس بات پر تھے کہ وہ آگ میں گرا کیسے؟ اتنی زیادہ آگ کے قریب جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اچھو بھولا کہتا تھا کہ جمال بے وقوف لڑکا تھا۔“

”ایک بات اور عزیز!“ میں نے کہا۔ ”یہ بات بھی تم ہی بتا سکتے ہو، کیا ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ جمال نے یہاں کسی لڑکی پر ہاتھ رکھا ہو اور اچھو بھولا اس لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو؟“

”نہیں صاحب!“ مٹی نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کسی نے مجھے ایسا واقعہ نہیں سنایا۔“ اور دوسری بات یہ ہے کہ اشرف بھولا

کے بارے میں یہاں کوئی آدمی اپنی زبان نہیں کھولے گا..... میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔“

”کہاں ہے اشرف بھولا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ابھی آجائے گا۔“ مٹی عزیز نے جواب دیا۔

”دس گیارہ بجے آیا کرتا ہے۔“

”وہ اب نہیں آئے گا۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ گرفتار ہو چکا ہے، ہماری حوالات میں بند ہے۔“ مٹی نے آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”حیران مت ہو عزیز!“

میں نے کہا۔ ”اچھو بھولا کو ہم نے واقعی گرفتار کر لیا ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور جیب کے ڈرائیور اور ایک کانشیل کو پولیس اسٹیشن بھجوا دیا تاکہ اچھو کو ہتھکڑی لگا کر رکھنے پر لے آئیں۔

یہ اقدام اس لیے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے دلوں سے اچھو کا خوف نکل جائے اور وہ مکمل کر بیان دے سکیں۔

مٹی عبدالعزیز کو جب یقین ہو گیا کہ ان کا غنڈا میٹ اشرف بھولا گرفتار ہو چکا ہے تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

”یہ حادثہ میری غیر حاضری میں ہوا ہے۔“ مٹی نے کہا۔ ”مگر میں یہاں ہوتا تو مجھے کچھ تو پتا چل جاتا۔“

مجھے کچھ آری ہے کہ اچھو میٹ..... کیوں مجھے چھٹی پر بھجوانے پر بلند تھا اور تحکیکدار صاحب سے چھٹی بھی دلوا دی، حالانکہ مجھے اتنی چھٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو کے متعلق میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ بٹھے کے تمام مزدور اس سے ڈرتے ہیں اور یہ شخص مانی کرتا ہے۔“

مٹی نے اس کا ڈول ملدا اور عمر بھی بتا دیا، جہاں وہ رہتا تھا۔ میں نے مٹی عزیز سے پوچھا کہ مجھے ان مزدوروں کا نام بتاؤ، جنہوں نے جی ایشیوں کو جوڑ کر یا رکھ کر آگ جلائی تھی۔ مٹی نے پانچ چھ مزدوروں کے نام لیے اور میرے کہنے پر اس نے ان آدمیوں کو بلا لیا۔

میں نے ان میں سے ایک کو الگ کر لیا۔ ”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے بھائی!“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ جب جمال آگ میں گرا، اس وقت تم کہاں تھے؟“

اس غریب مزدور کا روتل ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر بے بسی صاف نظر آنے لگی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میری جانب یوں دیکھا جیسے رو پڑے گا۔ یہ التجا اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی کہ جناب مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔

”ڈرو نہیں جوان!“ میں نے کہا۔ ”جس سے تم ڈرتے ہو، وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے سامنے آجائے گا اور تم جو بھی بات بتاؤ گے کسی کو

نہیں بتائی جائے گی۔“

مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ پر کھڑا تھا اور اس نے جمال کو اچھو میٹ کے ساتھ بٹھے کی خندق کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین اور مزدور وہاں کام کر رہے تھے اور اچھو میٹ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سب کو ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، ادھر چلے جاؤ۔ وہ آدمی وہاں سے بٹھے تو فوراً بعد اچھو میٹ نے شور مچایا کہ لڑکا آگ میں گر پڑا ہے۔

میں نے اسے بٹھے کو کہا اور مٹی سے اسے پانی پلانے کا کہا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے پانی لے کر میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”حضور!“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں۔“

پھر میں نے ان تینوں، چاروں مزدوروں کو باری باری الگ کیا اور وہی سوال پوچھے جو پہلے مزدور سے پوچھے تھے۔ ہر ایک کا رد عمل وہی تھا جو پہلے کا تھا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ اچھو میٹ نے انہیں ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس وقت اچھو اور جمال کس طرح چل رہے تھے، یعنی آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ؟..... انہوں نے بتایا کہ جمال آگ کی طرف تھا اور اچھو میٹ اس کی دوسری طرف کے پہلو کے ساتھ چل رہا تھا۔

میں نے ان سے اچھو میٹ کے متعلق کچھ اور باتیں پوچھیں تو سب نے گول مول سے جواب دیے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ڈر کے مارے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔

اسے میں تحکیکدار میر حسن آگیا اور سید حامد میرے پاس آ کر اس طرح کی حرکتیں اور باتیں کرنے لگا، جیسے میرا انگوٹھا نیار یا بے تکلف دوست ہو۔

”ایک بات یاد رکھنا تحکیکدار صاحب!“ میں نے ذرا دبدبے سے کہا۔ ”یہاں کے کسی درگزر سے آپ نے یہ نہیں پوچھنا کہ میں نے اس سے کیا پوچھا ہے اور اس نے کیا جواب دیا ہے۔ کسی مزدور کو کوئی ہدایت نہیں دینی، جو میری تعینات میں رکاوٹ بنے۔ اگر آپ نے کسی مزدور پر اس طرح دباؤ یا اثر ڈالا تو میں آپ کو گرفتار کر لوں گا۔“ تحکیکدار سر جھکا کر چلا گیا۔

ان تین چار مزدوروں سے مجھے پتا چلا کہ دو مزدور اور بھی تھے جو جمال کے گردے وقت موجود تھے۔ میں نے انہیں بلایا۔ اسے میں اشرف بھولا ہتھکڑیوں سمیت ہمارے سامنے آ پہنچا۔ کانشیل نے ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مزدور کام چھوڑ کر حیرت سے اچھو میٹ کو

ہتھکڑیوں میں جکرا دیکھ رہے تھے۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ..... بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔

میں نے اچھو بد معاش کو ایک جانب بٹھا کر دو مزدوروں سے پوچھ کچھ شروع کی۔ ایک مزدور نے بتایا کہ اسے یقین تو نہیں لیکن اسے ایسا لگا تھا جیسے اچھو میٹ نے لڑکے کو آگ میں دھکیلا ہو۔ وہ یقین اور شک کے درمیان بات کر رہا تھا۔ بہر حال اس کی اس بات سے یہ یقین ہو گیا کہ اچھو میٹ، جمال کو آگ کے بہت قریب لے گیا تھا۔

مجھے کوئی ایسی شہادت تو نہ ملی کہ اچھو نے جمال کو آگ میں گرایا تھا مگر یہ شک پختہ ہو گیا کہ جمال کو جلانے میں اچھو میٹ کا ہاتھ ہے۔ اس کے بارے میں مزید انکشاف ہوا کہ وہ ہر مزدور سے پچاس روپے ماہانہ کمیشن لیتا تھا۔ مزدوروں کی نو جوان لڑکیوں کو وہ اپنی زرخیز لونڈیاں سمجھتا تھا۔

میں نے وہاں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ کافی حد تک حاصل کر لیا تھا۔ آدھے سے زیادہ دن وہیں گزار گیا تھا۔

ہم نے اچھو میٹ کو گاڑی میں بٹھایا اور واپس پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ اچھو بھولا کو تعینات والے کرے میں بٹھا کر کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے مگر وہ انکار کرتا رہا۔

میں دوسرے طریقے سے بھی اس کی زبان کھلوا سکتا تھا مگر اس کے متعلق پولیس رپورٹ لینا بہتر سمجھا۔

اچھو میٹ کا ٹھہر جس پولیس اسٹیشن کی حدود میں تھا، میں نے وہاں کے ایس ایچ او کو فون کیا اور اسے اشرف میٹ کا پورا نام اور عرفیت بتا کر کہا کہ اس کے متعلق مجھے جلدی رپورٹ دے۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر اس کا کوئی جاننے والا آدمی ہو تو اسے میرے پاس بھیج دے۔

ایس ایچ او نے مجھے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ شخص تھانے کے ریکارڈ پر ہے اور ایک بار کا سزایا تھا بھی ہے۔

شام کے وقت ایک شخص مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک بند لافزدیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔ یہ اشرف بھولا کی ہسٹری تھی۔ اسے چاقو زنی کی واردات کے جرم میں دو سال سزا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی جھگڑے میں دو بار پکڑا گیا تھا لیکن تھانے والوں نے راضی نامہ کر دیا تھا۔ چاقو زنی میں ہی ایک بار پھر پکڑا گیا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا۔ تھانیدار نے اپنی رائے لکھی تھی کہ یہ پکا غنڈا اور بد معاش ہے۔ دلیر بھی ہے، پولیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی رہی ہے۔

یہ رپورٹ طویل اور بڑی واضح تھی۔ جو آدمی یہ رپورٹ لایا تھا، وہ اس تھانے کا پرانا کانشیل تھا۔ تھانیدار



نے اس کا شیل کو خاص طور پر بچھا تھا کیونکہ اس کا شیل کے ساتھ اشرف بھولا کی بڑی گہری یاری تھی۔ اس کا شیل نے خود ہی کہا کہ وہ اشرف بھولا کی پوری رپورٹ دے سکتا ہے۔ اس نے اشرف کی پوری زندگی کی کہانی اور اس کے جرائم کی تفصیلات سنا ڈالیں۔

اس نے بوہڑ گٹ کی ایک طوائف کا نام بتایا، جس کے ساتھ اچھو بھولا کے گہرے مراسم تھے اور وہ فارغ وقت اسی کے ہاں گزارتا تھا۔ اس طوائف کا ایڈریس معلوم کر کے میں نے اس شیل کو واپس بھجوا دیا۔

میں نے اگلے روز اپنے اسے ایس آئی ممتاز خان کو طوائف کے کوشے کی جانب روانہ کیا تاکہ اس سے کچھ سرائے مل سکے۔

عادی قاتل بھی قتل کر کے اپنی مخصوص طوائف کے پاس جاتا ہے اور شراب کے نشے میں بڑے فخریہ انداز میں طوائف کو بتا دیتا ہے کہ وہ قتل کی واردات کر کے آیا ہے۔ میں نے اس طوائف کو اس توقع پر بلایا تھا۔

ایک گھنٹے بعد طوائف پولیس اسٹیشن آئی تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ تقریباً آٹھائیس سال کی خوب صورت طوائف تھی۔ میں نے اسے بٹھایا، اس کی گھبراہٹ اور خوف قدرتی تھا۔

اسے نارمل حالت میں لانے کے لیے میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں تاکہ وہ ذہنی طور پر سیٹ ہو جائے۔ میں نے اس کے حسن کی تعریف کی۔

آخر طوائف تھی، جس کا سوسائٹی میں نہ کوئی مقام تھا نہ کوئی وقار۔ میں نے اسے ہوا دینی شروع کی تو وہ غبارے کی طرح پھوٹی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”سرکار! ہمیں کیوں بلایا گیا ہے؟“

”تمہارا یار پچاسی چڑھ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”اشرف عرف اچھو بھولا۔“ میں نے بتایا۔ ”اس رات وہ تمہارے پاس گیا تھا اور اس نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ وہ پورا بیان دے چکا ہے۔ تمہیں صرف تصدیق کے لیے بلایا ہے۔“

”ہاں!“ طوائف نے اس طرح کہا جیسے آہ لی جاتی ہے۔ ”وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس رات وہ بہت زیادہ ٹیٹا گیا تھا۔ نشے میں کافی کچھ ہلکا رہا اور اوٹ پٹا تک باتیں بھی کرتا رہا۔ کہہ رہا تھا کہ آج دولت بھی کمائی ہے اور ایک لڑکے کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ ہے کوئی جو میرے سامنے آئے۔ میں بھی ڈینگیں مار رہا ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ڈینگیں نہیں۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ تمہیں اس نے تنہی رقم بتائی تھی؟“

”پچاسی ہزار کہتا تھا۔“ طوائف نے جواب دیا۔

”میں نہیں مانتی تھی۔ اتنی زیادہ رقم کون دیتا ہے؟“

طوائف نے فوراً راز اگل دیا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ طوائف اس کی بھی نہیں ہوتی، جس سے ہزاروں روپے کھاتی ہے۔ اچھو بھولا نے بھی اسے اپنی محبوبہ بنا رکھا تھا اور طوائف نے بھی اسے یہی تاثر دے رکھا تھا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اور اس پر مرمی ہے لیکن اسے ایک پولیس انسپٹر کا میک کی صورت میں سامنے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کو کیا بڑی غی کی کہ اچھو بھولا کے لیے جھوٹ ہوئی۔ بہر حال وہ اس کیس میں ایک اہم گواہ تھی۔

طوائف کے جاتے ہی میں نے اچھو میٹ کو حوالات سے لکھوا کر اپنے سامنے بٹھایا اور کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے۔

”دیکھو اچھو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم اقبالی بیان نہیں دو گے، تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، نقصان تمہارا ہوگا۔ اگر بیان دے دو گے تو میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں کم سے کم سزا ملے۔ اگر پریشان کرو گے تو ہم تمہیں سیدھا چھاسی کے تختے پر پہنچا دیں گے۔“

”ٹھیکیدار نے بیان دیا ہے کہ تم نے جمال کو اپنی کسی دشمنی کی بنا پر آگ میں دھکا دیا تھا۔“ ٹھیکیدار نے مجھے گواہ بھی دیے ہیں اور پھر ایک طوائف پر تم نے بھروسہ کیا، جو ابھی ابھی میں بیان دے گئی ہے۔“

وہ خود جرائم پیشہ تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس کا ناپر کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس کے آگے جو شہادت رکھی تھی، وہ ایسا جال تھا، جس سے وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹھیکیدار کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور اقبالی بیان دینے کے لیے رضامند ہو گیا۔

اشرف عرف اچھو بھولا ٹھیکیدار میر حسن کا محافظ تھا اور مجھے پر کام کرنے والے مزدوروں کو کنٹرول کرنا بھی اس کی ذیونی تھی۔ کاروبار کے سلسلے میں ٹھیکیدار کو ضرورت پڑتی کہ فلاں شخص کو ڈرانا دھمکانا ہے یا رکی ہوئی رقم لکھوائی ہے تو اچھو کو استعمال کرتا تھا۔

ایک روز ٹھیکیدار نے اس سے کہا کہ جمال کو زمین سے اتھاڑ یعنی ختم کر دو۔ اچھو نے وجہ پوچھی تو میر حسن نے کہا کہ اس کی بیٹی جمال کے ساتھ تانے پر کالج جایا کرتی تھی۔ ٹھیکیدار خاندانی امیر کیر نہیں تھا۔ یہ لوگ ملتان کے مضافات میں ایک پسماندہ سے گاؤں میں رہتے تھے۔ یہ ایک ہی برادری تھی۔ جمال اور ٹھیکیدار کی بیٹی نرمس بچپن

سے ہی اکٹھے کھیلتے رہے تھے۔ لاکھن تک ان کا پیار ان کی رگوں میں اتر گیا تھا۔ پھر یہ نوجوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میر حسن کی قسمت کا دروازہ کھل گیا اور وہ دولت مند ٹھیکیدار بن گیا۔

ادھر جمال یتیم ہو گیا۔ گھر کی دال روٹی پوری کرنا محال ہو گئی۔ جمال نے میٹرک پاس کر لیا تو ٹھیکیدار نے اس پر رحم کرتے ہوئے اسے ملازم رکھ لیا۔ ساتھ ہی ڈیوٹی اس کے ذمے لگا دی کہ وہ اس کی بیٹی کو تانے پر کالج لے جائے اور واپس بھی لے آ کرے۔ ان دونوں میں پہلے ہی محبت تھی۔ انہیں ایک اچھا موصل قتل کیا۔

میر حسن کی بیٹی نے دولت مندی سے اپنا دماغ خراب نہیں ہونے دیا۔ اس نے جمال کی محبت کو ایسا سینے سے لگا یا کہ اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بھی جمال کو لو کر نہیں سمجھا تھا۔

نرمس کے لیے رشتے کا ایک اچھا پیغام آ گیا۔ لڑکا تعلیم یافتہ اور امیر تاجر کا بیٹا تھا۔ ٹھیکیدار نے ہاں کر دی مگر نرمس نے اپنی ماں کو اعلان طور پر کہا کہ وہ اس آدمی سے شادی نہیں کرے گی۔ اور اگر زبردستی کی گئی تو کالج کے وقت وہ انکار کر دے گی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ جمال کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکی ہے اور وہ یہ قول نبھائے گی۔

اسے ماں، باپ کے علاوہ بہنوں نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا، جو ذہنی طور پر معذور تو نہیں تھا مگر کم عقل اور احمق سا تھا۔ اس نے نرمس پر رعب جما ڈالا تو نرمس نے خودکشی کرنے کی دھمکی دے دی۔ جمال کو نرمس کے ساتھ کالج جانے سے روک دیا گیا اور اس احمق بھائی کو اس کے ساتھ تانے میں جانے کو کہا گیا۔ نرمس نے کالج جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے سوچا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے، پڑھ کر کیا کرے گی۔ لہذا اسے کالج جانے سے روک دیا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

نرمس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور ساتھ ہی ضد کرنے لگی کہ جمال کو بلاؤ۔ جمال اس گھر میں چونکہ آتا جاتا تھا، لیکن اسے روک دیا گیا تھا۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر میر حسن نے جمال کو اپنے گھر بھیجنا شروع کر دیا۔ باپ کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اچھو میٹ کو بتایا اور کہا کہ جمال کو اس طرح مارا جائے کہ نرمس یہ نہ سمجھے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ اتفاقی یا

حادثاتی موت معلوم ہو۔

پھر جمال کو بھنے کی آگ میں پھینکے جانے کا طریقہ ٹھیکیدار نے سوچا جو اچھو میٹ کو سب سے اچھا لگا۔

”اور یہ کام تم کرو گے۔“ ٹھیکیدار نے اچھو میٹ سے کہا۔

”میرے علاوہ اور کون ہے، جو یہ کام کر سکے؟“ اچھو نے کہا۔ ”لیکن عالی جاہ! یہ بھی سوچ لیں کہ کسی نے دیکھ لیا تو پچاسی کا تختہ ہی ہے۔“

”پچاس ہزار روپے، اچھو!“ ٹھیکیدار نے کہا۔

”کام ہوئے ہی پچاس ہزار روپے نقد پیش کروں گا۔“ میری عزت بجاؤ اشرف!

”جمال نہ رہا تو کیا لڑکی آپ کی پسند کی شادی کر لے گی؟“ اچھو نے پوچھا۔

”مجھے امید ہے کر لے گی۔“ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔ ”نہیں کرے گی تو میں اس کا بھی پتا کاٹ دوں گا۔“

اچھو میٹ اور ٹھیکیدار میر حسن نے جمال کو بھنے کی آگ میں پھینکنے کا پلان بنایا۔ اچھو نے کہا کہ بھنے کی فٹی عبدالعزیز کو چھٹی پر بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ جمال کو بھنے پر بھیجا جائے۔ فٹی کی غیر حاضری میں وہ بھنے پر کام کرے گا۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔

پچاس ہزار میں بڑی طاقت تھی۔ فٹی کو چھٹی پر بھیج کر جمال کو بھنے پر بھیج دیا گیا۔ تین چار دن میں ہی اچھو میٹ نے اس کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی پیدا کر لی اور..... ایک دن بھنے میں بیٹی اٹھیں رکھو کر جہاں جہاں آگ جلائی تھی جلا دی گئی۔ اچھو نے جمال سے کہا کہ آؤ تمہیں دکھاؤں کہ بھنے میں جی اٹھیں کیسے رکھی جاتی ہیں اور آگ کہاں کہاں جلائی جاتی ہے۔ پھر دیکھنا جی اٹھوں اور آگ کو کس طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے۔

جمال کو موت اچھو کے ساتھ لے گئی۔ اچھو نے وہاں سے کام کرنے والے درکروں کو بہانے سے ادھر ادھر کر دیا۔ جمال کو بھنے کے کنارے کے ساتھ ساتھ لے جاتے اچھو اس کے پہلو کے ساتھ ساتھ رہا۔ آگ کی چٹش اتنی زیادہ تھی کہ جمال کنارے سے دور بھاگنے لگا۔ اچھو نے اسے ہاتھوں سے آگ میں نہیں دھکا بلکہ جمال کو اپنا کولہا اتنی زور سے مارا کہ جمال آگ میں جا پڑا۔ وہ جگہ دفن گہری تھی۔ جمال کی صرف ایک جھنجھٹ سناٹی دی۔

اچھو میٹ نے شور مچایا، مزدور اکٹھے ہو گئے۔ جمال جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ ٹھیکیدار کو اطلاع دی گئی۔ وہ آیا اور اس نے جمال کے چوکی اطلاع دی۔ آگ پر پانی پھینکا گیا تھا۔



آگ تو بجھ گئی مگر یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ جل جانے والا کوئی انسان تھا یا کسی درخت کا تانا۔

اچھو نے اپنے بیان میں کہا کہ علاقہ تھانیدار شرافت علی خان آوارہ کی ساریاں لے کر چلا گیا۔

”شرافت خان نے تفتیش تو کی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”خاک تفتیش کی تھی۔“ اچھو نے جواب دیا۔ ”میں ہزار روپے لے کر اس نے لکھ دیا تھا کہ گواہوں اور بیٹی شاہدوں کے بیانات کی روشنی میں متوفی حادثاتی موت مرا ہے۔“

”ہم تو خوش تھے عالی جاہ کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے لیکن جمال کی ماں کی فریادیں خدا نے سن لیں اور ہمارا مکافات عمل شروع ہو گیا۔“

اشرف بھولا کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ٹھیکیدار میر حسن، اچھو جیسے جرائم پیشہ، چری اور شرابی کے ساتھ اتنا بے تکلف تھا کہ اپنی سگی بیٹی کی محبت اور اپنے گھر کی نازک باتیں بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔

ٹھیکیدار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

”میر حسن صاحب!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اقبالی بیان دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس بیان میں یہ ضرور شامل ہو کہ تم نے تھانیدار شرافت علی خان کو بیس ہزار روپے دے کر لکھوایا تھا کہ یہ حادثاتی موت ہے۔ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ کچھ چھپاؤ گے تو ہم یہاں پہلے تمہاری ہڈیاں توڑیں گے پھر عدالت میں پیش کریں گے۔“

اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو اچھو نے دیا تھا۔

”واہ ٹھیکیدار صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی بیٹی کی شادی جمال کے ساتھ کر دیتے تو کیا حرج تھا؟..... جمال تمہارا رشتہ داری تھا۔“

”یہ تو میری بے عزتی تھی صاحب۔“ اس نے کہا۔

”رشتہ داری تو بعد کی بات ہے، اصل بات یہ تھی کہ وہ میرا نوکر تھا اور غریب تھا۔“

میں نے میر حسن سے کہا۔ حقیقت کو جھٹلانے اور دوسروں کو حقیر جاننے کو تکبر کہتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں.....

تمہیں تکبر کی یہ سزا مل رہی ہے۔ تم نے دولت کو خدا بتالیا تھا۔ تمہارا ایم احتساب آچکا ہے۔“ ٹھیکیدار نے مجھے رشوت پیش کی۔

”مجھے اس کیس سے نکال دو۔“ میر حسن نے کہا۔

”مجھتی رقم کہو گے فوراً دے دوں گا۔“

”جیتیم کا خون ہضم نہیں ہو سکتا ٹھیکیدار صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ خون..... مجھے نہ ملاؤ۔ ایک بیوہ ماں کی آہوں کا عذاب دیکھ لو۔“

میری تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ اس تفتیش کے دوران میرا ایس بی طاہر وقار سے مکمل رابطہ رہا تھا اور آج جب میں نے انہیں اپنی کامیابی کی خبر سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔

میں نے انہیں تھانیدار شرافت علی خان کو معطل کرانے کی درخواست کی اور انہوں نے وعدہ کر لیا۔

صرف اقبالی بیان طرم کوزا انہیں دلا سکتا۔ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت عدالت میں پیش کرنے پڑتے ہیں چونکہ جمال کو آگ میں جلا کر اچھو طوائف کے پاس گیا تھا اور شراب کے نشے میں اس نے طوائف کو بتایا تھا۔ طوائف کو اطلاع بھجوا دی گئی کہ اگلے روز پولیس اسٹیشن پہنچ جائے۔ سب سے مضبوط گواہ ٹھیکیدار کی اپنی بیٹی نرگس تھی۔

یہ خیال رہے کہ جمال کے قتل کے بعد میر حسن نے اپنی بیٹی نرگس کی شادی وہیں کر دی تھی جنہوں نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ ہم اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ سب انسپکٹر پولیس ملک بھی بہت خوش تھا کیونکہ اس تفتیش کے آغاز میں اس نے بڑی ذمہ داری سے سارے کام کیے تھے۔ میری غیر موجودگی میں پولیس اسٹیشن پر وہی سینئر افسر تھا۔ اس کیس کو چل کر کے جہاں ہمیں روحانی سکون ملا..... وہاں ہم دونوں کی ترقی کے جاس بھی بڑھ گئے تھے۔

ہماری تفتیش مکمل ہو چکی تھی، لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس تفتیشی کہانی کا ایک انتہائی جذباتی، عجیب و غریب اور دلوں کو ہلا دینے والا حصہ ابھی باقی ہے۔

اگلے روز ہمارے پاس جو گواہ آئے۔ ان میں پہلے طوائف آئی اس سے ضروری گفتگو کے بعد اسے فارغ کیا تو نرگس اور اس کا شوہر چلے آئے۔ جن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ نرگس نے پہلی ہی رات میں شوہر کو اپنی اور جمال کی محبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جس پر شوہر نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کر کے معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نرگس کو اپنے پیار اور محبت سے سمجھایا

اسے اس کی مرضی کے مطابق جسے کا حق دیا اور اس پر اپنی طرف سے کوئی زور بردستی نہیں کی۔ البتہ نرگس نے اپنے گھر والوں سے رابطہ بالکل ختم کر دیا تھا۔ جب باپ کی گرفتاری کی خبر سنی تو جیسے اس کی ہچکتی ہوئی روح کو قرار مل گیا تھا۔

اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

”کیا آپ نے واقعی میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے؟“ نرگس نے اداس سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں نرگس۔“ میں نے کہا۔ ”نرگس نے اسے اور اس کے یار اشرف عرف اچھو بھولا کو جہاں کو آگ میں پھینک کر قتل کر دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”اللہ تیرا شکر۔“ نرگس نے آسمان کی جانب دیکھا اور دو ہاتھوں میں پھیلا کر کہا۔ ”قاتل آخر پکڑے گئے۔ اب میری روح کو تسکین مل گئی ہے۔“

”کیا تمہیں اپنے والد صاحب کی گرفتاری کا انوس نہیں ہوا؟“ سب انسپکٹر راجا پولیس ملک نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نرگس نے دانت چیں کر کہا۔ ”مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہتی ہوں۔“

ہم نے اس سے یہ تصدیق کرائی تھی کہ یہ متوکل کو چاہتی تھی اور متوکل کے قتل کا باعث یا وجہ یہی تھی۔ میں نے دو چار سوال کر کے یہ تصدیق کر لی اور نرگس سے پوچھا کہ وہ عدالت میں بیان دیے آئے گی؟

”کیوں نہیں آؤں گی۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں چلا چلا کر لوگوں کو سناؤں گی کہ یہ شخص قاتل ہے اور قتل کی وجہ یہ ہے۔“

ہم نے نرگس اور اس کے شوہر کو رخصت کر دیا لیکن یہ دونوں مجھے جذباتی طور پر حیران کر گئے۔ اشرف بھولا عرف اچھو کا بیان مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کر اسے جوڈیشل لاگ اپ میں بھیج دیا۔

ٹھیکیدار میر حسن نے مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دو روز ہماری حوالات میں رہا پھر خود ہی بیان دینے کے لیے راضی ہو گیا۔ اس کا بیان لے کر ہم نے اسے بھی جوڈیشل لاگ اپ میں بھیج دیا۔ مقدمہ چلا لیکن نرگس جب گواہی دینے آئی تو کورٹ میں سناٹا طاری ہو گیا۔

وہ..... اپنے باپ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہا کر بیان دیتی رہی تھی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ دو تین مرتبہ پیشین بخ نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکی اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے بیان تو ٹھیک دیا لیکن وہ آگ بگولائی ہوئی تھی۔

میں آپ کو مقدمہ سے کچھ انجام بتاتا ہوں۔ ٹھیکیدار کو

نوسال قید کی سزا ہوئی اور اچھو بھولا کو سزا موت دی گئی۔ دونوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔ دونوں مسترد ہو گئیں۔ میرا یہ کیس تو ختم ہو گیا اور ہم دونوں پولیس آفیسروں نے ایس بی صاحب اور آئی جی بی پولیس سے خوب داد و تحسین وصول کی۔

ہم دونوں کی ترقی متوقع تھی لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی نرگس کی دعائیں لے کر ہوئی۔ دو چار ماہ تک نرگس اور اس کا شوہر میرے ذہن پر سوار رہے۔ تقریباً ایک سال بعد میں اپنی بیوی اور بچوں کو سیر پانے کے لیے ملتان لے گیا۔ میری بیوی کو خانقاہ میں دیکھنے کا شوق تھا۔ وہاں گئے تو نرگس اور اس کا شوہر مل گئے۔ وہ بھی سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نرگس بہت خوش و خرم تھی۔

انہوں نے پہلی خبر یہ سنائی کہ اشرف عرف اچھو بھولا تو پھانسی چڑھ گیا تھا اور ٹھیکیدار میر حسن کو بیس تین ماہ بعد قلعہ کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ مر گیا۔ ”اس کی لاش گھر آئی تو میں وہاں نہیں گئی تھی۔“ نرگس نے کہا۔ ”یہ میرا شوہر بن رہا ہے، میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا کہ اب میں جذباتی اور روحانی لحاظ سے آپ کی ہوں۔ میں تو بھتی ہوں کہ یہ ایک فرشتہ تھا، جو اللہ نے میری نجات کے لیے اتارا۔“

میں نے اس کے خاندان کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔

”اب ہم بہت اچھے پیار کرنے والے میاں بیوی ہیں۔“ نرگس کے شوہر نے کہا۔

یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ماضی کا یہ کیس جب یاد آتا ہے تو کچھ ایسے نیک صفت لوگ یاد آ جاتے ہیں جن کی وجہ سے شاید دنیا قائم ہے۔ جس میں ایس بی طاہر وقار صاحب اور جمال مرحوم کے والد کا وہ دوست جس نے درخواست لکھ کر براہ راست ایس بی صاحب تک پہنچائی۔

جیسا کہ تھانیدار شرافت علی خان جیسے بے ضمیر انسان نے ایک ماں کو دھکے مار کر تھانے سے نکال دیا۔ اسے ملا کیا؟ ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ ظالموں کو اس دنیا میں ہی پکڑ لیتا ہے۔

سلام کرتا ہوں اس روشن ضمیر انسان طاہر وقار کو جس نے دفتری کارروائیوں میں اٹھنے سے پہلے حکم دے دیا کہ اس ماں کا شک و فہم کرو..... یا اس کے بیٹے کے قاتل کو پکڑو۔ سلا کر اسے ایس بی کو جواب پر کے حکم کے بغیر ہی ایک کیس کی تفتیش کا حکم دے دے۔



دوسرا اور آخری حصہ

## سنگین خاتمہ

نثر پادی

سب سے خوب صورت تحفہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کا دیا جس کی بدولت وہ غلط اور صحیح میں فرق کر پاتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ جب اس انتخاب کا وقت آتا ہے تو انسانی فطرت اسے اکثر لالچ اور مفاد کے نام پر انتہائی پستی میں گرا دیتی ہے۔ اسے بھی اپنی ذات پر اتنا ہی گھمنڈ تھا کہ ہر پسندیدہ چیز اور شخصیت پر اپنا استحقاق قائم رکھنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا تھا مگر... بڑے کروفر سے مستقبل بنانے والا... ماضی کی کوتاہیوں میں ایسا الجھا کہ اپنے حال کو بھی فراموش کر بیٹھا جبکہ دوسری جانب دوستوں کے روپ میں ملنے والے دشمن اسے بڑے پیار سے تباہی کی طرف دھکیلے رہے اور جب خود انہی میں مبتلا ہوئے تو احساس ہوا کہ ناحق کسی کو گناہ کی طرف راغب کر کے خود انہوں نے کتنی بڑی عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا...

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو مست زلزل کرنے

والے خمیر روشن لوگوں کی سیرت اور داستان





نیل منجید گی سے چند لمبے اِصبا کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "میں مطلق ہوں۔ طلاق ہو چکی ہے میری۔"

اِصبا کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ نیل منجید کے انداز میں مسکرائی۔ "کیا اب بھی تم مجھ سے شادی کرنا چاہو گے؟"

"دھچکا تو لگا ہے تمہارے جواب سے۔" اِصبا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں اس کے باوجود تمہیں اپنا نا پسند کروں گا۔"

"سچ؟" نیل منجید کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "سچ کہہ رہے ہو اِصبا؟"

"کہو تو ابھی چلیں؟" اِصبا نے بے صبری سے کہا۔ "ابھی عدالت کا وقت ختم نہیں ہوا ہے۔"

"عدالتی شادی تو میں پسند نہیں کرتی۔"

"تو بتا دو ہم کب شادی کر سکتے ہیں؟ تمہیں اپنے والدین سے بات کرنی ہوگی شاید۔"

"بات تو کروں گی لیکن اسکی کوئی بات نہیں ہے کہ مجھے اجازت ملنی پڑے۔"

"اجازت تو لیتا چاہے، رسا ہی کیا!"

"تمہیں معلوم ہے نا کہ میرے والدین دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔"

"ہاں تم بتا چکی ہو۔"

"لیکن یہ نہیں بتایا کہ میں یہاں اسکی کیوں رہتی ہوں۔ بس کبھی ان سے ملنے چلی جاتی ہوں اور ان سے کہاں بس اپنی ماں سے ملنے جاتی ہوں۔"

"والدے تعلقات خراب ہیں؟"

"وہ میرے سوتیلے والد ہیں۔ میرے والد کا تو بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

اپنے اس اقدام پر وہ آج تک بچھا رہی ہیں۔ میرے سوتیلے والد اچھے انسان نہیں ہیں۔ انہی کی ایک بے ہودہ حرکت کی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا تھا کہ ان سے علیحدگی اختیار کر لوں۔"

ان باتوں پر اِصبا نے افسوس کا اظہار کیا۔ "کوئی ضرورت نہیں افسوس کی۔" نیل منجید نے کہا۔

"میں تو اب اس زندگی کی عادی ہو چکی ہوں۔"

"اس وقت میں تم سے بات کر کے اتنا خوش ہوا ہوں کہ..... جی چاہ رہا ہے ہم ابھی کہیں گھومتے چلیں۔ رات تک گھومتے ہی رہیں۔ کسی اچھے سے ریسٹورانٹ میں کھانا کھائیں۔ پھر میں تمہیں یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

"خوب اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کون ہے وہ؟ کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرے گا؟ ابھی تم کہہ چکی ہو کہ وہ شاید تم سے شادی کے لیے تیار نہ ہو۔"

"ہاں، حالانکہ وہ مجھے چاہتا ہے۔"

"ابھی ہوئی باتیں کر رہی ہو تم! وہ تمہیں چاہتا ہے لیکن تم سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ اس لیے ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ نہیں جانتا۔"

"تو اسکی کیا بات ہے تم میں جسے جاننے کے بعد وہ تم سے شادی کرنا نہ چاہے؟"

"وہ کوئی بری بات تو بہر حال نہیں ہے لیکن بعض مرد..... بلکہ بیشتر مرد اسے پسند نہیں کرتے۔"

"ایسی کیا بات ہے..... مجھے بتانا پسند کرو گی؟"

"اب اس موقع پر میں تمہیں بتا ہی دوں تو ایک مستقل اچھن سے نجات مل جائے گی۔ مجھے بتاؤ اِصبا! ہمیں خاصا طویل عرصہ ہو گیا ایک جگہ ملازمت کرتے ہوئے۔ ہم کسی نہ کسی حد تک بے تکلف بھی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں جو کچھ دیکھا ہے، وہ میں پڑھ نہ سکی ہوں؟..... اس سلسلے میں عورت زیادہ حساس ہوتی ہے مرد کی نسبت۔"

اِصبا کچھ خوش ہوا۔ "اس شخص کا نام تو بتاؤ۔"

"صاف صاف کہلوانا چاہتے ہو..... کیا تم سمجھ نہیں؟" نیل منجید نے پشیمانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"سمجھ گیا ہوں۔ وہ میں ہی ہوں۔" اِصبا نے جذباتی ہو کر نیل منجید کا ہاتھ پکڑا لیکن پھر فوراً ہی "سوری" کہہ کر چھوڑ بھی دیا۔

"سوری کی ضرورت نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم زندگی بھر کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

"اوہ..... اوہ....." اس دن اِصبا کو معلوم ہوا کہ خوشی سے بھی انسان کی سانس چھل سکتی ہے۔ "میں تمہیں بہت چاہتا ہوں نیل منجید!"

"لیکن اس سے پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ میری فطرت نہیں کہ میں کسی کو دھوکا دوں۔"

"دھوکا؟"

"ہاں۔" نیل منجید نے کہا۔ "اپنے بارے میں کچھ چھپانا دھوکا ہی تو ہے۔"

"تو بتاؤ۔" اِصبا نے بے صبری سے کہا۔

ایسا لگنے لگا جیسے تم بہت فکر مند ہو گئی ہو۔"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے اِصبا! نیل منجید نے غور سے اِصبا کی طرف دیکھتے ہوئے منجید سے کہا۔ "دو لمبے کیاریا شادی کے لیے تیار ہو چکی ہے یا ہو جائے گی؟"

"اس سے ابھی میری کوئی بات نہیں ہو سکی لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ تیار ہو جائے گی۔ تم بھی جانتی ہو کہ زید کی طرف اس کا جھکاؤ بہت ہے۔ تم چھپرتی بھی رہی ہو اسے کہ وہ آخر کب شادی کرے گی۔ اتنی عمر تو ہو گئی ہے اس کی۔"

"محض چھپر چھاڑی تھی وہ..... میں منجید نہیں تھی۔ اس نے تو فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ کبھی تو تم نے بھی اسے مذاق میں چھیڑا ہے۔"

"میں بھی منجید نہیں تھا اور....." اِصبا مسکرایا۔ "تمہاری عمر بھی اتنی ہی ہو چکی ہے لیکن میں نے تمہیں بھی کبھی نہیں چھیڑا۔"

"مجھے تم نے کیوں نہیں چھیڑا؟" نیل منجید سے ہنسی۔ "تم کو میں نے اس لیے نہیں چھیڑا کہ تم بھی ریمائی طرح کا کوئی فیصلہ نہ سناؤ۔ اس سے مجھے دھچکا لگ جاتا۔"

"دھچکا..... کیوں؟"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ اِصبا مسکرایا۔ "میں تو بس یہ سوچتا رہا ہوں کہ شادی کے سلسلے میں تمہارا موڈ کیا ہے۔ میں اب تک اس بارے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر رہا ہوں لیکن آج جب یہ بات چھڑی گئی ہے تو میں پوچھ لیتا ہوں کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں؟"

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ بڑھاپا آنے تک شادی نہ کرنا عورت کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔"

"یعنی تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی ہو جائے.....؟"

"ہاں، میں ایسا چاہتی ہوں۔"

اِصبا نے اس طرح طویل سانس لی جیسے یہ جواب اس کے لیے اطمینان بخش ہو۔

"لیکن....." نیل منجید نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے ڈر ہے کہ میں جس سے شادی کرنا چاہتی ہوں، شاید وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہو۔"

"کون ہے وہ؟" اِصبا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "دفتر ہی کا کوئی شخص ہے..... میں جانتا ہوں اسے؟"

"تم نے تو مجھے اچھن میں ڈال دیا۔ آخر کیا سا موڈ ہو گا وہ؟"

"وہی تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" زید کی نظر اس کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔

"تو پھر چھوڑو۔" ریمانے اس سے ہاتھ چھڑایا۔

زید نے فوراً اس کی گردن میں اپنا ایک بازو محاکل کر دیا۔ "آج سے پہلے تم مجھے اتنی اچھی نہیں لگیں۔"

"زیادہ پی لگے ہوتا!" ریمانے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کے چہرے پر قد بڑے اچھن بھی پیدا ہو گئی تھی۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ زید نے اس کی گردن میں بازو ڈال دیا تھا۔

"کیا میری زبان میں لکنت ہے؟" زید نے پوچھا۔ "نہیں، لکنت تو نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے بہت زیادہ نشہ نہیں ہوا۔" زید نے کہتے ہوئے ریمانے کا سراپے چہرے کی طرف جھکا یا۔ اس وقت ریمانے اپنا سر پیچھے کرنے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہو زید!" اس کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

"آج میرے بہت قریب ہو جاؤ ریمانے!" اس مرتبہ زید کے لیے میں بھی لرزش تھی۔

"نہیں زید..... پلیز!"

لیکن اس مرتبہ زید نے ایک جھٹکے سے اس کا سراپے بالکل قریب کر لیا اور اس کے ہونٹوں نے ریمانے کے ہونٹوں سے کچھ کہہ بھی دیا۔

"پلیز زید!" ریمانے کے ہونٹ کاٹنے لگے۔ "جب یہ ملے ہو گیا کہ ہماری شادی ہو جائے گی تو پھر....."

زید نے ایک بار پھر اس کے ہونٹ بند کر دیے جس کے بعد ریمانے کو بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایک اجنبی احساس سے آشنا ہو گئی۔

☆☆☆

"خیریت تو ہے؟" نیل منجید اپنے گھر پر اچھے ہوئے لہجے میں اِصبا سے کہہ رہی تھی۔ "آج تم پہلی بار میرے گھر آئے ہو۔"

"ایک اطلاع دینا ہے تمہیں اور تمہارا بھائی دیکھنا ہے۔"

"ایسی کیا اطلاع ہے.....؟"

"زید نے ریمانے سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"



”وہ ناکام رہی تو ضروری نہیں کہ میں بھی ناکام رہوں۔“  
 نیلم نے ایک طویل سانس لی۔ ”اور اس کی پہلی شرط؟“  
 ”میں وہ مان لوں گی۔“  
 ”یعنی ماں نہیں ہوگی؟“

”ہاں۔“ ریمانے کہا۔ ”میں زید کی خاطر ماں بننے کی خواہش کا گنا گھونٹ دوں گی۔“  
 ”یعنی ایسی دوائیں استعمال کرو گی؟“

”ہاں۔“  
 ”لیکن شادی اس سے ضرور کرو گی؟“  
 ”ہاں۔ اگر میں تمہاری بات ماننے کے بارے میں سوچوں تو اب یہ ممکن نہیں۔“

”کیوں؟“  
 ”ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ اپنی شرط پہلی ہی رات کو پیش کر دے گا۔“

”ہاں۔“  
 ”تو وہ پہلی رات ہم گزار چکے ہیں۔“ ریمانے نظریں جھکا لیں۔

”کیا؟“ نیلم چونکی۔  
 ”ہاں۔“ ریمانے کہا۔ ”اس کا ایک سبب تو یہ کہ کل

ایک ہی بجی اس کے گھر پر۔ کل وہ نوشاہہ سے ٹون پر بات کر کے اتنا ڈسٹرب ہو چکا تھا کہ ابصار کے جانے کے بعد ہی اس نے جینی شروع کر دی تھی اور مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔“

”نئے کے عالم میں اس نے مجھے اپنے سنے سے لگا لیا۔ میں اس کی محبت میں جھتا تو رہی ہوں۔ اس کا ٹکس پا کر مجھے بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ میں ایک بیچے کے قریب اپنے گھر جاسکتی تھی لیکن جو کچھ ہو گیا، اس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ پہلی رات گزار چکی ہوں۔ اب یہ ممکن بھی نہیں رہا کہ میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کروں اور سچی بات یہ ہے کہ میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتی۔“

”آج دیر سے دفتر اسی لیے آئی کہ دیر تک سوئی رہی تھی۔ زید کے اب تک نہ آنے کا سبب بھی نیند ہی ہو سکتی ہے۔“

”ریمابوئی ہی اور نیلم دم پہ خود بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ ریمابوئی نے سب کچھ بتا دیا لیکن مجھے امید ہے کہ تم ابصار کو یہ باتیں نہیں بتاؤ گی۔ اگر بتا دیں تو مجھے اس کا سامنا کرنے میں دقت ہوگی۔“

”ویر چائے لے آیا۔ نیلم ہی پیالیوں میں چائے

”کیا تم ماں بننا پسند کرو گی شادی کے بعد؟“  
 ”بہت ہی غیر متعلق سا سوال کر بیٹھیں تم۔“  
 ”بہر حال۔۔۔۔۔ دنیا میں ایسی عورت شاید ہی ہو جو ماں بننے کی خواہش مند نہ ہو۔“

”تو کیا تم اس پر قادر ہو سکتی ہو کہ تم بیٹے ہی کی ماں بنو، بیٹی کی ماں نہ بنو۔“  
 ”یہ تو کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن تم نے پھر ایک عجیب سی بات کہی ہے۔“

”عجیب تو ہے لیکن غیر متعلق بات نہیں ہے۔“  
 ”کیسے؟“  
 ”شادی کی پہلی ہی رات تم اس سے ایک عجیب و غریب شرط سنو گی۔“

”کیا شرط ہوگی؟ اور تمہیں کیسے معلوم کہ وہ کوئی شرط پیش کرے گا؟“  
 ”یہ میں تمہیں شاید پھر کبھی بتا دوں۔“

”کیا تمہیں نوشاہہ نے کچھ بتایا ہے؟“  
 ”میں نے کہا نا، یہ میں پھر کبھی بتاؤں گی۔“  
 ”مگر وہ شرط کیا ہوگی؟ تمہیں ابھی بتانا پڑے گا۔“

”یہی کہ تم کسی لڑکی کو ہرگز جنم نہیں دو گی اور اگر ایسا ہو تو وہ موقع ملنے ہی اس لڑکی کا گنا گھونٹ کر مار دے گا۔ لڑکی کا باپ بننا اسے سخت ناپسند ہے۔ کیا یہ اس کے ساتھ ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ نہیں؟“

”یہ شرط رکھنا تو پاگل پن ہوگا۔“  
 ”اس لیے میں نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ بھی ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم بے تکلفانہ انداز میں بھی کسی کے قریب ہو گئیں تو جی اس کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس شخص کو مار ہی ڈالے۔“

”ریمانہس پڑی۔“ ”تمہاری دوسری بات تو بہت مضحکہ خیز ہے۔ پیشہ ور قاتلوں کے علاوہ کسی شخص کے دماغ میں قتل کرنے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔“

”نیلم چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”جلو شیک ہے، میں تمہاری دوسری بات ماننے لیتی ہوں لیکن پہلی بات غیر فطری ہے۔“

”اگر کسی کے دماغ میں کوئی نفسیاتی گرہ پڑ چکی ہو تو اس کے لیے کچھ بھی غیر فطری نہیں ہوتا۔“

”اچھا!“ ریمانے طویل سانس لی۔ ”میں اس کا علاج کراؤں گی۔“  
 ”یہ نوشاہہ نے بھی چاہا تھا۔“

میرے علاوہ ابصار نے بھی محسوس کر لی تھی کہ تمہارا جھکاؤ زید کی طرف رہا ہے۔ میں اپنی بات دہراؤں گی کہ میں تمہیں صرف چھیڑا کرتی تھی لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری شادی زید سے ہو۔“ نیلم بوٹی ہی چلی گئی۔ ”تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم بھی شادی نہیں کرو گی کیونکہ جس سے تم محبت کرتی ہو، وہ شادی شدہ ہے۔ کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے تمہارے اور میں سمجھ گئی تھی کہ تم زید کو چاہتی ہو اور کیونکہ وہ شادی شدہ ہے اس لیے تم نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا میں شک نہیں کہہ رہی ہوں ریمابوئی؟“

”آج شاید پہلی بار تم سنجیدگی سے بات کر رہی ہو، اس لیے میں بھی سنجیدگی سے جواب دوں گی کہ تم نے بالکل ٹھیک سمجھا تھا۔ میں اگر خواب بھی دیکھتی تھی تو خواب میں صرف اسی کو دیکھتی رہی ہوں۔“

”ان دنوں نوشاہہ اور زید میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ ابصار کا خیال تھا کہ یہ اختلافات دیر پا نہیں ہوں گے۔ وہ خود بھی زید سے اجازت مانگ رہا تھا کہ وہ نوشاہہ کے گھر جا کر اسے سمجھائے۔ میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ ان دونوں میں صلہ ہو جائے گی لیکن کل ابصار سے یہ سن کر میری جان نکل گئی کہ ابصار نے نوشاہہ سے قطع تعلق کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور وہ تم سے ہی شادی کا خواہش مند ہے۔“

”کل مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے۔“ ریمانے مسکرا کر کہا۔ ”کوئی بات ہوئی تھی اس کی تم سے؟“ نیلم نے چونک کر پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے شادی کے سلسلے میں؟“

”ہاں۔“  
 ”پھر تو تم نے اس کی بات مان لی ہوگی۔“ نیلم نے تیزی سے کہا۔

”یقیناً۔“ ریمانے کہا۔ ”یہ تو میرا خواب تھا۔“  
 ”اوگا ڈا!“ نیلم کے منہ سے نکلا۔ ”اپنا فیصلہ بدل دو ریمابوئی! تمہارے حق میں میں بہتر ہوگا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ بہتر کیوں ہوگا؟“ ریمابوئی کا لہجہ خشک ہو گیا۔

”ہم لوگوں میں یہ بات اکثر ہو چکی ہے کہ زید کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ بعض اوقات وہ عجیب سی باتیں یا حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ کیا تم وہ باتیں بھول گئیں؟“

”بالکل نہیں بھولی لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہوڑے بہت نفسیاتی مسائل ہر شخص کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

”زید کا معاملہ زیادہ گہمیر ہے۔“  
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

اور رات تمہیں خواب میں دیکھتے ہوئے گزرے گی۔“  
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ نیلم بھی خوش نظر آ رہی تھی۔  
 ”ایک بات تم نے نہیں بتائی۔“  
 ”کیا؟“

”کس سے ہوئی تھی تمہاری شادی اور طلاق تک نوبت کیوں پہنچ گئی؟“  
 ”طلاق کا سبب میری کوئی غلطی یا میری کوئی خرابی نہیں تھی۔“

”وہ تھا کوئی؟“  
 ”یہ باتیں اب چھوڑو ابصار! ذہنی اذیت ہوتی ہے مجھے!“  
 ابصار نے سوچا یہ بات وہ پھر بھی بعد میں معلوم کر لے گا۔

☆☆☆

دوسرے دن دفتر میں نیلم بڑی بے چینی سے ریمابوئی کا انتظار کر رہی تھی۔ ابصار دفتر میں نہیں تھا۔ گزشتہ دو دن سے دو ایک رپورٹس پر کام رہا تھا۔ اسی سلسلے میں مصروفیت تھی۔ اس نے بتا بھی دیا تھا کہ اس کی واپسی میں دیر لگ سکتی ہے یا شاید آج وہ دفتر آئی نہ سکے۔

اس نے یہ بھی بتایا تھا، زید کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ دفتر آئے گا لیکن وہ بھی اب تک نہیں آیا تھا۔ نیلم کی خواہش تھی کہ ریمابوئی سے پہلے دفتر آجائے۔ وہ اس سے بڑی رازداری سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی اس لیے ضروری سمجھ رہی تھی کہ وہ زید سے پہلے آجائے۔

آخر وہ ڈیڑھ گھنٹے دیر سے آئی لیکن نیلم کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ زید اس وقت بھی نہیں آیا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ ریمابوئی!“ اس نے ریمابوئی کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے جانے لگی۔

”بات کیا ہے نیلم!“ ریمانے حیرت سے پوچھا۔  
 ”اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گی۔“

ریمابوئی کا ذہن الجھا رہا۔ نیلم اسے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں لے گئی جہاں اس وقت زیادہ لوگ نہیں ہوتے تھے۔ جو لوگ تھے، نیلم نے ان سے کچھ فاصلے کی میز کا انتخاب کیا۔

ویر فوراً ان کے قریب آ گیا۔  
 ”چائے لے آؤ۔“ نیلم اس سے کہا۔ ”صرف چائے۔“

ویر چلا گیا۔ ریمابوئی نے نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میز پر تھے۔ نیلم نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے، پھر کہا۔ ”میں تمہیں اکثر چھیڑتی تھی کہ کب شادی کرو گی اور یہ بات



بنانے لگی۔ وہ گم سم سی تھی ریماکس ساری باتیں سن کر۔  
”سچ بتانا نیلم!“ ریمابولی۔

”کیا؟“

”تم تو نہیں چاہتی تھیں زید سے شادی کرنا؟“

”تم نے شاید یہ سمجھا ہے کہ میں نے تمہیں زید سے

ڈرانے کے لیے یہ ساری باتیں کی ہیں؟“

”یونہی بس خیال آگیا تھا، لیکن تم نے بڑے اعتماد

سے جواب دیا ہے۔ میں سو رہی تھی کہ تم سے۔“

نیلم نے چائے کی ایک پیالی ریماکس کی طرف بڑھائی

اور کہا۔ ”کیا میں امید کروں کہ تم زید کو نہیں بتاؤ گی؟“

”کیا نہیں بتاؤں گی؟“

”جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے۔ زید میرا بھی بہر حال

ایک اچھا دوست ہے۔ ٹھیک نہیں ہوگا اگر میرے اور اس

کے تعلقات خراب ہو جائیں۔“

”میں بھی نہیں چاہوں گی کہ دفتر کا ماحول خراب ہو۔“

”اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“

”اب تکلفات میں نہ پڑو۔ ہم جس طرح پہلے بے

تکلف رہے ہیں، اسی طرح اب بھی رہنا چاہیے۔“

”شادی کا ارادہ کب تک ہے؟“ نیلم نے چائے کا

ایک گھونٹ لیا۔

”کل جو کچھ ہو گیا، اس کے بعد تو ہماری شادی

جلد از جلد ہو جانی چاہیے۔ میں آج ہی اپنی والدہ سے بات

کروں گی۔ یقیناً وہ خوش ہو جائیں گی۔ والد بھی میرے

مسلسل انکار کی وجہ سے چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ وہ بھی

چاہیں گے کہ.....“ ریمابولی۔ ”وہ بھی چاہیں گے کہ میں

جلد از جلد ملوں۔“

”والدین کبھی اپنی بیٹی کو بوجھ نہیں سمجھتے لیکن جب لڑکی

کی عمر زیادہ ہو جائے تو ان کا فکرمند ہونا فطری بات ہے۔“

نیلم نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ایک بات

عجیب ہوئی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”کل ہی تم دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے اور کل

ہی ابصار سے میری بات ہوئی ہے۔“

”شادی کے سلسلے میں؟“ ریمابولی۔

”اور کیا بات ہوگی؟“

”ویری گڈ۔“ ریمابولی خوش ہو گئی۔ ”کیا اچھا ہوا اگر ہم

دونوں کی شادیاں ساتھ ساتھ ہوں۔“

”ہم ایک ہفتے کے اندر شادی کر لیں گے۔ شاید اس

سے پہلے بھی کر لیتے لیکن ابصار چاہتا ہے کہ آج کل وہ جو

رپورٹ تیار کر رہا ہے، اس کے بعد ہی شادی ہو۔“

”میرے والدین بھی میری شادی میں جلدی کریں

گے۔ انہیں کوئی تیاری تو کرنی نہیں ہے۔ میرا جہیز نہ جانے

کب سے تیار پڑا ہے۔“

”میرے معاملے میں جہیز کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم

دونوں بہت سادگی سے شادی کریں گے۔“

”کچھ بھی ہو، شادی ایک دن ہی کریں گے۔“

نیلم ہنس کر رہ گئی لیکن اس ہنسی میں بھی فکرمندی شامل

تھی جو ریمابولی کے سلسلے میں تھی..... اسے اندازہ تھا کہ ریمابولی

ابھی جذبات میں بہہ رہی ہے۔ اسے کچھ بھی سمجھانا، کسی

طرح بھی سمجھانا بے سود ہوتا مگر مستقبل میں اس کے لیے

پریشانی کھڑی ہو سکتی تھی۔ ماں بننے سے بچنے کے لیے

دواؤں کا استعمال ٹھیک تھا لیکن کسی وقت بھول چوک ہو جائے

تو نوبت ماں بننے تک آ ہی جاتی ہے۔

ریمابولی نے پیچکی تھی۔

”اب چلنا چاہیے۔“ نیلم نے کہا اور کچھ فاصلے پر

کھڑے ہوئے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

بل آنے سے پہلے ہی ریمابولی نے فون کی کھنٹی بجی تھی۔

کال اس کی ماں کی تھی۔

”خیریت؟“ ریمابولی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”توقع

نہیں تھی کہ آپ فون کریں گی۔ مجھے تو یاد نہیں کہ آپ نے

مجھے اس وقت فون کیا ہو جب میں دفتر میں ہوں۔“ پھر وہ

دوسری طرف کی کچھ بات سننے لگی۔ نیلم خاموشی سے اس کے

چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے ریمابولی کے چہرے پر

حیرت کا تاثر دیکھا۔ وہ بولی۔ ”لیکن کیوں؟..... خاص

بات؟..... وہ آپ مجھے فون پر بتا دیں۔“ کچھ سننے کے بعد

اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اچھا..... آتی ہوں۔“

اس نے فون بند کیا۔

”کیا بات ہے ریمابولی!“ نیلم بولی۔ ”ابھی کیوں بلایا

ہوگا انہوں نے تمہیں؟“

”صرف بلایا ہی نہیں ہے، یہ بھی کہا ہے کہ ایک ہفتے

کی چھٹی لے کر آنا۔“

”اوہو! ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”مجھے تو ایک ہی خیال آیا ہے۔“ ریمابولی مسکراتے

ہوئے کہا۔ ”کسی وجہ سے میرے والدین نے فوری طور پر

میری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی لیے ایک ہفتے کی چھٹی کی

بات کی ہے اور تو کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی کہ اتنے دن کی



چھٹی بلٹی پڑے۔

وینر بل آئی۔ اہل ادا کرنے کے بعد دونوں انھیں۔  
”نیلیم!“ ریمانے ریسٹورنٹ سے نکلے ہوئے کہا۔  
”اس سے تو مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اب رہی خواہش تو وہ تم پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم ابصار سے کہو تو کیا وہ اپنی رپورٹ مکمل کرنے سے پہلے شادی کے لیے تیار نہیں ہوگا؟“

”بات کروں گی اس سے۔“

”ضرور کرتا۔“

ریمان اپنی شادی کے خیال سے اتنی خوش تھی کہ دفتر میں داخل ہونے تک اسی بارے میں بات کرتی رہی۔ پھر وہ یہ کہہ کر اپنی میز کی طرف چلی گئی کہ چھٹی کی درخواست ٹائپ کر لے۔ نیلیم اسے چھوڑ کر ابصار کی میز پر پہنچی۔  
”کہاں تھیں؟“ ابصار نے پوچھا۔

”جائے پینے کے لیے ریمان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ تم اس وقت تک آئے نہیں تھے۔“

”ٹریلنگ جام میں بیٹھ گیا تھا۔ غیر معمولی طور پر بہت وقت ضائع ہو گیا۔ کیا بات ہے، اس وقت تم بہت سنجیدہ نظر آ رہی ہو؟“

”کل جب تم نے ان دونوں کی شادی کی بات کی تھی تو مجھے سنجیدہ نہیں ہوئی تھی کیا؟“  
”ہاں، ہوئی تو تھیں لیکن پھر ایسی باتیں چھڑ گئیں کہ میں تمہاری سنجیدگی کا سبب پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔ خیال ہی نہیں رہا تھا اس کا۔“

”اس وقت بھی میں اسی وجہ سے سنجیدہ ہوں۔ اس بارے میں ریمان سے ابھی بات بھی کر چکی ہوں۔ دوست ہوں اس کی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ وہ اپنی زندگی مشکلات میں ڈالے۔ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے ابصار!“

ابصار اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔  
”ہاں۔“ نیلیم نے زور دے کر کہا۔ ”ریمان کی شادی زید سے نہیں ہونی چاہیے۔“

”وجہ؟“  
”اب میں وجہ تمہیں آج ہی بتا دوں گی لیکن پہلے ایک کام اور کرنا ہے۔ یہ کوشش کرنا ضروری ہے کہ یہ شادی نہ ہو۔“

”اب کیا کوشش ہو سکتی ہے؟“  
”کسی طرح بھی نوشاہہ کو آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ زید کے پاس واپس لوٹ جائے۔“

”جب زید نا کام رہا تو ہم کیا کر سکیں گے نیلیم!“

”کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔“

”ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعد میں جب زید کو یہ بات معلوم ہوگی تو اس کا اثر ہمارے تعلقات پر پڑ سکتا ہے۔“

”نہیں بڑے گا۔“

”اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو؟“

”نوشاہہ کی واپسی زید کے لیے خوش گوار ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ نوشاہہ سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی۔ کیا بھول گئے کہ اس واقعے سے اس کے ذہن پر اتنا دباؤ پڑا تھا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا۔“

”لیکن اب وہ طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔“

”یہ جذباتی اور غصے کا فیصلہ ہے جو نوشاہہ کی واپسی سے تبدیل ہو سکتا ہے۔“ نیلیم نے کہا۔ ”اب تم باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ زید اب تک دفتر نہیں آیا ہے۔ کہیں وہ طلاق نامہ تیار کرانے کے لیے کسی وکیل کے پاس نہ چلا گیا ہو۔“

”یہ تو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“ ابصار نے کہا اور فوراً ہی اپنے موبائل پر زید سے رابطہ کیا۔

”ہاں ابصار!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔  
”میرے دفتر نہ آنے کی وجہ جانتا چاہتے ہو گئے؟“

”ہاں، یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔“  
”کل رات کچھ ایسا ہوا کہ میں بہت دیر تک جاگا۔ ابھی آنکھ کھلی ہے۔ ناشتا کر کے وکیل کی طرف جاؤں گا۔ میں یہ معاملہ آج ہی نمٹا دینا چاہتا ہوں۔ ویسے شام سے پہلے چکر لگاؤں گا دفتر کا۔“

”اچھا، بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔“ ابصار نے رابطہ منقطع کر دیا۔

نیلیم اس کے قریب ہو کر ابصار کی باتیں سنتی رہی تھی۔ جیسے ہی ابصار نے رابطہ منقطع کیا، وہ جلدی سے بولی۔ ”اب ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ نوشاہہ کو دو گھنٹے کے اندر اندر اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ زید کو گھر سے نکلنے میں گھنٹا بھر تو لگ ہی جائے گا۔ اس کے وکیل کا دفتر بھی اس کے گھر سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ پھر دونوں میں بات چیت ہوگی۔ اس کے بعد ہی ڈرافٹ بننے کی نوبت آئے گی جس میں ایک گھنٹے سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔“

ابصار کھڑا ہو گیا۔ ”اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو کیا یہ ریمان کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟“  
”میں اسے بہت کچھ سمجھا تو بچی ہوں۔ بعد میں زیادہ واضح طور پر بھی اسے بہت کچھ بتا سکوں گی۔“

سنگین خاتمہ

”ابھی کیا باتیں ہوئیں؟“

”کہا تو ہے کہ بتا دوں گی۔ بات لمبی ہے۔ ابھی میرا ذہن صرف نوشاہہ میں الجھا ہوا ہے۔“

وہ دونوں ریمان سے ملے بغیر ہی روانہ ہو گئے۔ کار ابصار کی تھی۔

”ذرا تیز چلاؤ۔“ نیلیم نے کہا۔

رفقار خاصی تھی لیکن نیلیم کے کہنے پر ابصار نے کچھ اور بڑھا دی۔

☆☆☆

نوشاہہ نے ان لوگوں کے ساتھ صرف ایک سال کام کیا تھا جبکہ یہ اس کی مالی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے والد ایک اچھے بڑے تاجر تھے۔

ان دونوں کا استقبال کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ تم دونوں کیوں آئے ہو۔“

”ان حالات میں ہونا بھی چاہیے۔“ نیلیم نے کہا۔  
”زید کو ظلم ہے اس کا؟“

”نہیں۔ وہ تو فیصلہ کر رہی چکا ہے۔“  
”عمل نہیں ہوگا اس پر!“ نوشاہہ خفیف سا مسکرائی۔

”اس نے فون پر بات کرتے ہوئے غصہ تو دکھایا تھا لیکن میں اب بھی اسے دھکیلے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ مجھ کو بہت چاہتا ہے۔ مجھ سے دور رہتا تو وہ گوارا کر لے گا لیکن مجھے طلاق نہیں دے گا۔“

”اس کی دوسری شادی؟“  
”وہ بھی میں صرف دھمکی سمجھتی ہوں۔“

”وہ اس وقت طلاق نامہ تیار کروانے کے لیے وکیل کے پاس جا رہا ہے۔“

”کیا؟“ نوشاہہ چونکی پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔ ”نہیں..... نہیں ہو سکتا۔“

”ابھی فون پر ابصار کی بات ہو چکی ہے۔“ نیلیم نے کہا، پھر ابصار سے بولی۔ ”ایک بار پھر فون کرو اسے۔ نوشاہہ کو بھی اس کا جواب سنا دو۔“

ابصار نے اپنا موبائل سنبھالا۔ اب نوشاہہ کے چہرے پر ابھرنے کا تاثر ابصار نے موبائل کا آئینہ آن کر دیا تاکہ زید کی آواز وہ بھی سن سکے۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ زید نے ہنس کر کہا۔ ”ابھی فون کر چکے ہو مجھے۔ شاید پون گھنٹا ہوا ہوگا۔“

”کسی خیال سے فون کیا ہے تمہیں۔ اب تم کہاں ہو؟“  
”تقریباً تیار ہو چکا ہوں۔ گھر سے نکلنے ہی والا ہوں۔“

”تمہیں بتایا تھا میں نے کہ میں وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔“  
”یعنی آج ہی طلاق نامہ نوشاہہ کو بھجوانا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“

”میں نے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے تمہیں کہ ایک آدھ دن اور رک جاؤ۔ ممکن ہے بہتری کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔“

”اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے ابصار!“ زید کی آواز آئی۔ ”میں دفتر آتا تو بتاتا تھا میں۔ کل ریمان سے بات ہو چکی ہے میری۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہے۔“

نیلیم اس وقت نوشاہہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ طلاق کے لفظ سے لے کر ریمان کا نام آنے تک اس کے چہرے کا رنگ پیکا پڑتا چلا گیا تھا۔

زید کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ ”میں اگر اس سے کہوں کہ میں آج ہی شادی کر لیتا چاہے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ بات اب اس حد تک بڑھ چکی ہے۔ کل وہ مجھ سے جسامتی طور پر بھی قریب ہو چکی ہے۔“

نیلیم نے اس وقت تک ابصار کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ابصار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نیلیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت نوشاہہ کا چہرہ حق پڑ چکا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم زید؟“ ابصار کی آواز دہلی دہلی سی تھی۔

”تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ میں تم سے اتنی بڑی بات جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں۔ اچھا اب میں فون بند کر رہا ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔ ساری تفصیل ملاقات پر بتاؤں گا۔“

دوسری طرف سے زید نے رابطہ منقطع کیا اور اپنی ٹائی کی ٹاٹ ٹھیک کرنے کے لیے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کوٹ پہنا اور کار کی چابی انگلی میں کھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بہت آسودہ نظر آ رہا تھا، جیسے نوشاہہ کی نسبت سے ساری تنخیاں بھلا چکا ہو۔ ریمان کی قربت نے اس پر ایسا فطرطاری کیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے تک اس نشے سے سرشار رہا تھا۔ نوشاہہ کی قربت اب اسے اتنی آسودگی نہیں دے پاتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ایک اچھے وکیل کے دفتر میں تھا۔ فون پر پہلے ہی اس سے بات ہو چکی تھی۔ وکیل نے بتا دیا تھا کہ آج اسے کسی کیس کے سلسلے میں عدالت نہیں جانا لہذا زید کی وقت بھی آسکتا ہے۔

وکیل کے دفتر کی میز چیاں ملے کرتے ہوئے اپنی



مسل نہیں ہوگا۔ والد سے بات کرنے کے بعد والدہ نے آنے کا اشارہ کیا۔  
مجھے فون کیا۔

☆☆☆

نوشابہ نے موبائل پر زید سے رابطہ کیا۔  
”معجزہ۔“ زید کی آواز آئی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم خود مجھے کسی فون نہیں کرو گی۔ جب سے مئی ہو، میں نے ہی تمہیں دوسرے فون کیا ہے۔“  
نوشابہ نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور بولی۔  
”کہاں ہو اس وقت؟“

”ایک کام سے نکلا ہوا ہوں۔“ زید نے کہا۔  
”کیوں؟“  
”ابھی مل مجھے ہے۔“

”عجب اتفاق ہے۔“ زید نے کہا۔ ”آج میں نے یہ دوسری ایسی کال ریسیو کی ہے کہ مجھے فوراً ملنے کے لیے کہا گیا۔ تم کہاں سے بول رہی ہو؟“  
”اپنے گھر سے۔“

”کوئی خاص معاملہ طے کرتا ہے؟“ زید کا انداز طنزیہ تھا۔ ”طلاق کے کاغذات میں آج تیار نہیں کر سکا۔ کچھ دوسرا کام آن پڑا تھا۔“  
”کب تک آسکتے ہو؟“

”ایک گھنٹہ تو لگے گا۔ کچھ ضروری کام نمٹانا ہوا آؤں گا۔“  
”میں انتظار کروں گی۔“ نوشابہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر گہری تنجید کی تھی۔ وہ ہلکنے لگی۔

آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اس نے باہر کی کار کے رکنے کی آواز سنی۔ اس کے اعصاب میں کچھ تناؤ آ گیا۔ اس نے انجن کی آواز سے سمجھ لیا تھا کہ وہ زید ہی کی کار ہے۔

ایک منٹ بعد ہی اس نے تیز تیز چلتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ پھر زید سامنے آ گیا لیکن سامنے آتے ہی چونک پڑا۔ ”تم؟“ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں۔“ نوشابہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔  
”تم نے تو مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔“

”کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ ابھی مجھے طلاق تو نہیں دی تم نے۔ طلاق ہو جاتی تو پھر یہ میرا گھر نہیں رہتا۔“

”میرا خیال تھا کہ تم اپنے والد کے گھر سے بول رہی تھیں۔“

”اپنے والد کے گھر کو میں اپنا گھر کیسے کہہ سکتی ہوں۔ میرا گھر تو یہی ہے جہاں میں تمہارے ساتھ برسوں رہی ہوں۔“

زید نے ایک طویل سانس لی پھر اپنے کپڑوں پر نظر

”افسوس ہوا سن کر۔“ زید نے کہا۔ ”لیکن ایک ہفتے کی چھٹی کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھائی سے مل کر ایک ہفتے کے اندر واپس آنا چاہتے ہیں۔ زیادہ دن رکنا شاید ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ تو اس میں ہماری شادی ملنے کی بات کہاں سے آگئی؟ ایک ہفتے بعد تم آئی جاؤ گی۔“  
”شادی ملنے کا سبب دوسرا ہے۔“ ریمان نے کہا۔  
”والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اب میری شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک چچا ٹھیک نہ ہو جائیں۔ والد میری شادی میں چچا کی شرکت چاہتی تھیں۔ تو ان کے تندرست ہونے میں اور پھر یہاں آنے میں سات آٹھ مہینے لگ سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ زید نے سر ہلایا۔ ”اس بات نے تمہیں واقعی پریشان کر دیا ہوگا۔ تم نے اپنی والدہ سے کیا کہا؟“

”میں کیا کہہ سکتی تھی ان سے۔۔۔۔۔ بس ایک ہی بات ذہن میں آئی کہ ہم آج ہی سول میرج کر لیں۔ میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ عدالت قریب ہے۔ اس سے پہلے کہ عدالت کا وقت ختم ہو جائے، ہمیں کورٹ میرج کر لیتا جاوے۔ میں میرج کا سرٹیفکیٹ اپنی والدہ کو دکھا دوں گی۔ اس طرح میرے نہ جانے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔“

زید مسکرایا۔ ”جب یہ حل تم نے سوچ لیا تھا تو اتنی پریشانی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ تم ہی نے کل کہا تھا کہ شادی دھوم دھام سے ہونا چاہیے ورنہ میں تو۔۔۔۔۔“

ریمان نے اس کی بات کاٹی۔ ”پریشانی یہ تھی کہ اگر تم سے رابطہ نہ ہو سکا اور عدالت کا وقت ختم ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ سیشن آج ہی کی کسی فلائٹ میں بک ہو جائیں۔“

”خیر!“ زید نے اطمینان سے کہا۔ ”عدالت کا وقت ختم ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ ہم ابھی شادی کر لیتے ہیں۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“

”یقیناً۔“ ریمان اس ملاقات کے دوران میں پہلی بار مسکرائی۔

”کچھ بیوگی؟ میں نے تو تمہارے انتظار میں ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔“

”اگر وقت ہے تو کچھ منگوا لو۔“

”وقت تو کافی ہے۔“ زید نے کہا اور وٹر کو قریب

سے کہا کہ چاک ایک ضروری کام آ پڑا ہے اس لیے وہ اب کل آئے گا۔

”کل میں اس وقت عدالت میں ہوں گا۔“ وکیل نے کہا۔ ”دوکیں ہیں کل میرے۔ کل آپ تیسرے پہر کے بعد آئیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ زید نے کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی کار کے قریب پہنچ گیا۔

دس منٹ بعد وہ اس ریسٹورنٹ میں تھا جس کا نام ریمان نے بتایا تھا۔

ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ شادی رک جائے؟ اس کے اچھے ہوئے دماغ میں یہ بات اس وقت تک گونجی رہی جب تک ریمان نہیں آگئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جلدی میں اسے اپنا حلیہ درست کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ہو۔ لپ اسٹک بھی ہلکی ہو چکی تھی۔

زید بولا۔ ”میں تم سے فون پر بات کرتے ہوئے زیادہ نہیں الجھا تھا لیکن تمہاری حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ آخر کیا ہو گیا۔“

”ہاں زید! میں ڈر رہی ہوں۔ بہت جلدی تھی مجھے!“

”آخر ہوا کیا ہے کہ۔۔۔۔۔“

ریمان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں دفتر میں تھی جب وہاں میری والدہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے نہ صرف فوراً گھر آنے کے لیے کہا کہ بلکہ ایک ہفتے کی چھٹی لینے کی بھی بات کی۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ اب کسی وجہ سے والدین میری شادی فوراً کرنا چاہتے ہیں ورنہ چھٹی لینے کی اور کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس وقت میری خوشی خاک میں مل گئی جب میں گھر پہنچی۔“

”وہ کیوں؟“ زید نے فوراً پوچھا۔

”میرے والد کے چھوٹے بھائی امریکا میں رہتے ہیں۔ ان کا فون آیا تھا مئی کے پاس۔۔۔۔۔ چچا کا ایکسٹرنٹ ہو گیا ہے اور اتنا شدید ہوا کہ انہیں تندرست ہونے میں کم از کم چھ ماہ لگیں گے۔ والدہ نے سب سے پہلے تو یہ اطلاع والد صاحب کو فون پر دی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے فوراً امریکا جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ جلد از جلد ملنے والی فلائٹ میں تین مہینے بک کر واپس آئیں۔ یعنی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ہم ایک بار امریکا جا چکے ہیں۔ ویزے کا کوئی

جیب میں پڑے موبائل کی گھنٹی سنائی دی۔

”کیا پھر ابصار کے پیٹ میں درد اٹھا ہے؟“ اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے موبائل نکالا اور پھر اسکرین پر نظر پڑے ہی مسکرا دیا۔

”اسے اب کبھی لمبے بھی میرے بغیر چین نہیں آسکتا۔“ اس نے دوبارہ بڑبڑاتے ہوئے موبائل کان سے لگایا اور زینے پر ہی رک گیا۔

”ہاں ریمان!“ وہ بولا۔ ”یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہوگا کہ طلاق نامہ تیار کروالیا میں نے یا نہیں؟ میں تمہارے سوال کرنے سے پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں اس وقت اپنے وکیل کے دفتر کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔“

”مجھے کچھ اور کہنا ہے زید!“ ریمان کی آواز آئی۔ ”تم مجھ سے فوراً ملو۔“

”کیا ہو گیا؟“ زید کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

”ملنے پر بتاؤں گی۔“

”وکیل سے کام کروا کے مل لوں گا۔“

”نہیں۔ یہ کام پھر کبھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کوئی ایسا کام آ پڑا ہے جو آج ہی کرنا ضروری ہے؟“

”آج نہیں، ابھی۔“ ریمان نے زور دے کر کہا۔

”ایسا کیا ہو گیا جان من؟“

”ہماری شادی مل سکتی ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم!“ زید نے تیزی سے کہا۔

”ابھی تم وکیل کے دفتر کی سیڑھیوں پر ہونا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”مجھے علم ہے تمہارے وکیل کا دفتر کہاں ہے۔“ ریمان نے کہا اور پھر ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام لیا جو وکیل کے دفتر سے بہ مشکل دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

”یہ تو یہاں سے بہت قریب ہے۔“

”اسی لیے اس کا نام لیا ہے میں نے۔ میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔ میں چھ مہینے منٹ لگیں گے۔ انتظار کر لینا میرا۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں اپنے گھر پر ہوں۔ اچھا بس۔۔۔۔۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

زید نے طویل سانس لے کر موبائل بند کرتے

ہوئے جیب میں ڈالا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے ہی اسے خیال آیا کہ وکیل تو اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے دوبارہ موبائل نکالا اور وکیل سے رابطہ کر کے اس



ڈالی جس پر کچڑی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔  
 ”ان چھینٹوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ نوشاہہ بولی۔  
 ”جیسے تم سے بات کرتا ہے، ان چھینٹوں سے نہیں۔“  
 ”اچھا۔“ زید ہنسا۔ ”تو آؤ بیٹھو، کرو بات۔“ وہ خود بھی آگے بڑھ کر بیٹھ گیا۔ نوشاہہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔  
 ”فیصل کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”وہ اپنے نانا کے پاس ہے، میں اکیلی آئی ہوں۔“  
 ”اچھا!“ زید نے طویل سانس لی۔ ”کیا بات کرنے آئی ہو؟“

”صرف دو باتیں۔“ نوشاہہ نے کہا۔ ”اب میں واپس آگئی ہوں۔ مطلب یہ کہ بہنیں رہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ تم دوسری شادی نہیں کرو گے۔“  
 ”تم نے فون پر کہا تھا کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”وہ میں نے اس یقین سے کہا تھا کہ تم صرف دھمکی دے رہے ہو۔ تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے کہ اس بارے میں سوچو گے بھی نہیں۔ مجھے منانے کی کوشش جاری رکھو گے اور آخر میں ایک شرط پر میں واپس بھی آ جاؤں گی۔“

”وہ شرط کیا ہے۔۔۔ کیا ہوگی؟“  
 ”ایک نہیں بلکہ دو شرطیں۔“ نوشاہہ نے کہا۔ ”ایک تو یہ کہ فیصل اب نانا ہی کے پاس رہے گا۔ میں وہیں جا کر اس سے مل آ یا کروں گی۔ تم بھی جا کر اس سے مل سکتے ہو لیکن میرے ساتھ ہی چلو گے۔“

”یہ شرط تو میں نہیں مان سکتا۔ یہ بات۔۔۔ بلکہ بے لگی بات آخر تم نے سوچ کیسے لی اور کیوں سمجھ لیا کہ میں یہ شرط مان جاؤں گا؟“

”یہ تو ماننا پڑے گی تمہیں!“ نوشاہہ نے زور دے کر کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔“  
 ”خطرہ؟“ زید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کیسا خطرہ؟“

”تم اسے مار ڈالو گے۔“  
 ”میں اسے مار ڈالوں گا؟“ زید حیرت سے بولا۔  
 ”پاکل ہوگئی ہو کیا؟“

”پاکل تو تم ہو زید!۔۔۔ کئی بار کوشش کر چکی ہوں کہ تم اپنا نفسیاتی علاج کرو۔ تمہارے ذہن میں یہ بات نہ جانے کیسے جم گئی ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے تم اسے مار سکتے ہو۔“  
 ”یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں یہ بات

مذاق کہا کرتا تھا۔“  
 ”میں نہیں مان سکتی اور تمہیں میری یہ شرط ماننی ہوگی کہ فیصل اب اپنے نانا ہی کے پاس رہا کرے گا۔“  
 ”میں یہ شرط نہیں مانوں گا۔“ زید نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
 ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں فیصل کے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی؟“  
 ”ہاں۔“

”میرا خیال تھا کہ تمہیں مجھ سے شدید محبت ہے۔ تم میری یہ بات مان لو گے لیکن تمہارے نہ ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں غلط فہمی کا شکار رہی ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اور جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا تو میرے دل میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ شاید نہ رہے۔“ نوشاہہ کی آواز بھرا گئی۔ ”میں نے ابھی یہاں آنے کا فیصلہ بہت غلط میں کیا تھا، پھر بھی سوچا تھا کہ یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتے ہو۔ اس لیے میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ اگر تم نے میری شرط نہ مانی تو بھی میں اب یہیں رہوں گی۔“

”طلاق کے بعد اس کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔“  
 ”تم مجھے طلاق نہیں دے گے۔“ اس مرتبہ نوشاہہ کے لہجے میں جارحیت تھی۔

”مجھے یہ قدم اٹھانے سے کون روک سکتا ہے؟“  
 ”اس صورت میں تم جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہو گے۔“

”اچھا!“ زید طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”طلاق دینا اتنا بڑا جرم ہوگا؟“

”طلاق دینا جرم نہیں ہوگا۔ تمہارا جرم اس گھر کے پائیس بارش میں دفن ہے۔“

زید کو خاصا ذہنی جھٹکا لگا۔ ”تم اس حد تک جاؤ گی؟“  
 ”جب تم کسی حد تک بھی جاتے نظر آؤ گے تو پھر مجھے بھی ہر حد تک جانا پڑے گا۔“ غصے سے زید کی مٹھیاں جھنجھکیں۔

”بہنیں مجھے بھی اسی وقت قتل کرنے کا فیصلہ نہ کر بیٹھنا۔ میرا قتل تمہیں فوراً ہی جیل میں پہنچانے کا سبب بن جائے گا۔ یہاں آنے کی غلت کے باوجود میں مدفن لاش کے بارے میں لکھ کر نہیں محفوظ کر آئی ہوں۔ اگر میں نے روزانہ یہاں سے اپنے گھر فون نہ کیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ اس صورت میں میری وہ تحریر پولیس تک پہنچادی جائے گی۔“

سنگین خامتہ

ان باتوں کی وجہ سے زید کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا جسم شل ہونے لگا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔  
 ”وہ قتل میں نے تمہاری محبت میں ہی کیا تھا۔ اس کی وہ باتیں میں برداشت نہیں کر سکا تھا جو اس نے تمہارے بارے میں کی تھیں۔“

”تو اب میری محبت ہی کی وجہ سے تمہیں میری شرط بھی مان لینا چاہیے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ میں تمہارا علاج کسی ماہر نفسیات سے کراؤں گی اور جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو فیصل بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے گا۔ ہماری زندگی پہلے ہی کی طرح خوشگوار ہو جائے گی۔“

زید ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹپکنے لگا۔  
 اب اس کے دل میں نوشاہہ کے لیے ذرا بھی محبت نہیں رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ اب نوشاہہ سے نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔

اس مسئلے کا کیا حل ہو۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا اور ٹپکل رہا تھا۔ نوشاہہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ دس منٹ گزر گئے۔

”کب تک سوچو گے زید؟“ نوشاہہ بولی۔  
 ”زید اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم ان معاملات میں حق بجانب ہو یا نہیں۔ آخر میری سمجھ میں آ گیا کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن میری بھی ایک بات تمہیں گوارا کرنا ہوگی۔ وہ بات میری مجبوری ہے۔“

”کیا مجبوری ہے تمہاری؟“  
 ”میں شادی کر چکا ہوں۔“  
 نوشاہہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت بلندی سے نیچے گری ہو۔ اس نے تو زید کے پاس واپس آنے میں جلدی اسی لیے کی تھی کہ زید کو دوسری شادی کرنے کا وقت نہ مل سکے۔  
 ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ نوشاہہ کی آواز کانپ گئی۔  
 ”میں تمہیں میرج سرٹیفکیٹ دکھا سکتا ہوں۔“  
 ”عدالت کی شادی؟“

”ہاں۔“ زید نے جواب دیا۔ ”جب تم نے مجھے فون کیا، اس سے ذرا ہی پہلے ہماری شادی ہو گئی تھی۔“  
 ”اگر یہ سچ ہے تو۔۔۔ عدالتی شادی جتنی جلدی کی جاسکتی ہے، اتنی ہی جلدی ختم بھی کی جاسکتی ہے۔“  
 ”میں اس لڑکی کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کر سکتا جس نے میری محبت میں شادی سے پہلے ہی اپنا آپ مجھے سونپ دیا ہو۔“

”وہ والدہ نے حمل کا ثبوت دیا تھا۔ والد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نہ جوانی میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں لیکن والد کا پارہ چڑھتا ہی رہا۔ انہوں نے مجھے ایسی ایسی سناٹیں کہ پھر پھر پارہ بھی چڑھ گیا۔ میں نکل آئی گھر سے اور اب تمہاری طرف آ رہی ہوں۔ مجھے یہ اطمینان تو ہے کہ تم بہر حال اب میرے ہو۔ میں اتنے غصے میں نکلی تھی کہ میں



نیلیم اسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔

☆☆☆

دوسری صبح ریمیا کی آنکھ کھلی تو زید اس کے پہلو میں نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ روم سے آئی ہوئی، پانی کے گرنے کی مدد آواز سنی۔

نہا رہا ہے..... ریمیا کو خیال آیا اور پھر اس کے ذہن میں گزری ہوئی رات کی باتیں گونجنے لگیں۔ زید بہت رونا ٹپک باتیں کرتا رہا تھا۔ ریمیا نے نوشاہہ کے بارے میں بات کرنی چاہی تو زید نے کہا تھا۔

”اب آئندہ بھی تم اس کا نام بھی نہ لینا۔“

ریمیا نے بے چوں و چرا اس کی بات مان لی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس معاملے میں زید کا موڈ خراب ہو۔ اس نے محتاط ہو جانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس سے پہلے نیلیم کی ایک بات سچ ثابت ہو چکی تھی۔ زید نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ اسے بیٹی کا باپ بننا پسند نہیں۔

نوشاہہ کے معاملے میں جو واقعہ ہو چکا تھا، اس کا اسے افسوس تھا۔ وہ واقعی زید سے شادی نہ کرنی اگر زید نے نوشاہہ کو طلاق دینے کا قطعی فیصلہ نہ کیا ہوتا۔

زید ہاتھ روم سے نکلا۔ ”جاگ گئیں؟“ وہ مسکرایا۔

”جی نہیں۔“

”صبح بخیر زید! ریمیا بستر سے اٹھی۔

”اب تم بھی جلدی سے غسل کر لو تو ناشا کیا جائے۔“

”تم نہ ٹھس جانا بچن میں!“ ریمیا نے کہا۔ ”ناشا میں

ہی تیار کروں گی۔“

”چلو شیک ہے۔ تو بس جلدی سے غسل کر لو۔“

”اب میں الارم لگا کر سویا کروں گی تاکہ تم سے پہلے

اٹھ کر ناشا تیار کروں تاکہ دفتر پر دفتر پہنچا جاسکے۔“

”دفتر.....“ زید کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر بولا۔ ”تم

غسل تو کرو۔“

ریمیا ہاتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں

ناشتے کی میز پر تھے۔

”دفتر جانے میں آج دیر ہو جائے گی۔“ ریمیا نے

گھڑی دیکھ کر کہا۔

”آج ہم چھٹی کریں گے۔“ زید نے کہا۔ ”تم نے

پریس کر کے کل کے ہی کپڑے پہن لیے ہیں۔ آج دس بارہ

جوڑوں کی شاٹنگ کر لینا۔ سینئر لیڈ بھی اور جو تم ضروری سمجھو۔“

”آتے ہی تم پر بوجھ بن گئی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔“

”وہ کیا؟“

”ایک تو یہ کہ میں آج ہی ریمیا سے کورٹ میرج کر چکا ہوں۔“

ابصار اور نیلیم چونک گئے۔ ابصار نے موبائل کا اسکرین کھول دیا تھا اس لیے نیلیم بھی اس کی آواز سن رہی تھی۔

”دوسرے یہ کہ نوشاہہ بھی آئی تھی۔“ زید نے دوسرا جملہ کہا۔

”یہ تو ریمائی صورت حال بن گئی ہوگی۔“ ابصار نے تیزی سے کہا۔

”ہاں۔“

”تجربہ؟“

”ریمیا کا رویہ بہت تھا لیکن نوشاہہ تھے سے اکھڑ گئی تھی۔ ریمیا تو چاہتی تھی کہ وہ دونوں ہی میرے ساتھ رہیں

لیکن نوشاہہ نے اسے بہت برا بھلا کہہ ڈالا اور وہ اپنی اپنے والد کے گھر چلی گئی۔ ریمیا بہت افسردہ ہے۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ تفصیلات میں نہیں کل کسی وقت بتاؤں گا۔“

”دفتر میں؟“

”جہاں بھی موقع ملا۔“

”تفصیل جاننے کے لیے آج کی رات بے چینی میں گزرے گی۔“

دوسری طرف سے مزید کچھ کہہ کر بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

نیلیم بولی۔ ”سب کے کرائے پر پانی پھر گیا۔“

”ایک خاص بات تمہیں اس کی تم نے؟“ ابصار بہت

سنجیدہ نظر آیا۔

”نہیں تو..... کیا بات؟“

”اس کے لہجے میں وہ دوستانہ انداز نہیں تھا جو ہمیشہ

ہوتا تھا۔ اکھڑ پن اور اجنبیت بھی اس کے انداز میں۔“

نیلیم غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی، پھر بولی۔

”کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو گیا کہ تم یا ہم دونوں نوشاہہ کے

گھر گئے تھے اور اسے کچھ باتیں بتائی تھیں؟“

”ہوسکتا ہے۔“ ابصار نے پُر خیال انداز میں سر

ہلایا۔ ”لیکن یہ بات اسے نوشاہہ نے تو نہیں بتائی ہوگی۔“

”تو پھر اس کا لہجہ خشک ہونے کا سبب کچھ اور ہوسکتا ہے۔“

”ملاقات ہو تو زیادہ بہتر اندازہ ہوسکتا ہے یا شاید وہ

خود ہی مجھ سے اس بات کی شکایت کرے۔“

”ریمیا سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔“

”خیر!“ ابصار طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

”جو ہوگا، سامنے آئی جائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔“

”اب بھی ہے۔“ نیلیم نے نظریں جھکا کر کہا۔

”کیونکہ اس کی وہ بیوی میں ہی تھی ابصار!“

ابصار نے ایک طویل سانس لی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جب تم نے یہ ساری باتیں بتانا شروع کی

تھیں، سچی میرے ذہن میں یہ خیال کھلبلا گیا تھا کہ تم دوسری

لڑکی کا حوالہ دے کر دراصل اپنی ہی کہانی سنارہی ہو۔“

”یہ کیسے سمجھ گئے تم؟“

”چھٹی حس کہہ لو اسے۔“

”تمہیں یہ جان کر کیا لگا کہ میں بھی تمہارے دوست

کی بیوی رہ چکی ہوں۔“

”اس سے میرے لیے کیا فرق پڑسکتا ہے نیلیم کہ تم

اس کی بیوی تھیں یا کسی اور کی۔ یہ تم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ

تم مطلقہ ہو۔“

”اب..... یعنی جب ہم شادی کر لیں گے تو تم زید

کے سامنے کیسا محسوس کرو گے؟“

”میں اس پر بھی غلط نہیں کروں گا کہ تم مجھے اس

بارے میں بتا چکی ہو اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھ سے اس

بارے میں بات نہیں کرے گا۔“ ابصار نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”خیر! یہ بات تو سمجھ میں آئی کہ تم نے جو کچھ بھی کیا،

ریمیا کی بھلائی کے لیے کیا، لیکن ابھی یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ

نتیجہ کیا نکلا۔“

”وہ تو زید سے ہی معلوم ہوگا یا ریمیا اور نوشاہہ سے۔“

”اچھا اب آخری بات۔“ ابصار نے کہا۔ ”ہماری

شادی کب ہوگی؟“ اس نے شوخ نظروں سے نیلیم کی

طرف دیکھا۔

”نوشاہہ کا معاملہ معلوم ہو جائے، ایک یہ انجمن تو ختم

ہو، پھر ہم جب چاہیں شادی کر لیں گے۔“

”فون کرو زید کو۔“

”ہاں، کیا تو جاسکتا ہے۔ فون کرنے کا جواز بھی

ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وکیل سے مل کر، طلاق نامہ

تیار کروا کے دفتر کا چکر تو لگائے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ اسی

بارے میں بات کی جاسکتی ہے۔“

”تو کرو!“

ابصار نے اپنا موبائل نکال کر زید سے رابطہ کیا۔

”ہاں ابصار!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”تم

شاید پوچھنا چاہتے ہو گے کہ میں دفتر کیوں نہیں آیا؟“

”ہاں اسی لیے فون کیا تھا۔“

”دراصل معاملات کچھ سمجیر ہو گئے تھے۔“

”اور ابھی تو مارکیٹ بھی نہیں کھلی ہوگی۔“

”سمجھا رہے ہیں کھلیں گے گھر سے۔“

”جب ٹھیک رہے گا۔“

”ناشا کر کے کچھ دیر لان میں ٹھہریں گے۔ دیکھوں تو

کیا حال ہے لان کا۔“

”کیا مانی نہیں ہے؟“

”چھ سات دن سے بیمار تھا۔ ابھی چوکیدار نے آکر

بتایا کہ گزشتہ شام اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ چوکیدار کو بھی یہ

اطلاع کسی سے ابھی ملی ہے۔ میں اسے جنازے میں شرکت

کے لیے چھٹی دے دیتا لیکن اسی نے بتایا کہ کل رات ہی

اس کی تدفین ہو چکی ہے۔“

”اوہ..... کیسا مانی تھا؟ میرا مطلب ہے کام اچھا

کرتا تھا یا۔“

”کام تو اچھا کرتا تھا۔ بہر حال اب دوسرا مانی تو رکھنا

ہی پڑے گا، لیکن کچھ دن بعد رکھوں گا۔ میں لان میں کچھ

تبدیلی کرانا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ لان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہو

اور مانی نہیں رکھو گے؟ تو کیا خود کو گھر سے تبدیل ملی؟“

”مانی کا کام نہیں ہوگا جو میں کروانا چاہتا ہوں۔“

”کیا کروانا ہے؟“

”تمہیں نہیں کھینے کا بہت شوق ہے نا؟“

”ہاں۔ چھٹی کے دن ضرور جاتی ہوں۔“

”حق مانی لان خاصا بڑا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ وہاں

ایک ٹینس کورٹ بنوایا جائے۔“

”اقتی زیادہ جگہ ہے لان میں؟“

”بہت زیادہ جگہ تو نہیں ہے لیکن شوقیہ طور پر چھوٹا

کورٹ بھی بنوایا جاسکتا ہے۔ میں ٹینس بہت شوق سے دیکھتا

ہوں لیکن کھیلنا نہیں جانتا یہاں تم سے سیکھ لوں گا۔ شام کو ہم

دونوں ٹینس ٹینس کھیل کریں گے۔“

”واہ!“ ریمیا قہقہے

انہی باتوں میں ناشا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ

دونوں عقبی لان میں گئے۔ ریمیا نے ایک طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک ہی جگہ پودوں کا جھنڈ بڑی

خوب صورتی سے بنایا گیا ہے۔“

”مانی خود ہی سب کچھ کرتا رہتا تھا۔“

”یہ جگہ معلوم ہوتا ہے کھودی گئی ہے۔ یہاں مانی کچھ

اور بنانا چاہتا ہوگا لیکن..... تم نے ابھی بتایا نا کہ وہ کچھ دن

سے بیمار تھا۔“



”ہاں۔ میں اسی حصے میں ٹینس کورٹ بنواؤں گا۔“  
 زید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب بتاؤ، کیا اس کے لیے مالی رکھنے کی ضرورت ہے؟“  
 ”اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا تا کہ تم کیا بنانا چاہتے ہو۔“ ریمنا بھی مسکرائی۔ ”لیکن مالی کی ضرورت تو ہے۔ لان کے باقی حصوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کچھ دن سے ان کی دیکھ بھال نہیں ہوئی۔“  
 ”ٹینس کورٹ بننے کے بعد ہی سب ٹھیک کر دیا جائے گا مالی رکھ کر۔“

”یہ تیل بھی مرچا رہی ہے۔“  
 ”کہنا نا جان من! ٹینس کورٹ بننے کے بعد یہ سب ٹھیک کر دیا جائے گا۔“  
 اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے وہ خاصی دیر تک لان میں ٹپکتے رہے، پھر گھر میں لوٹے۔ زید نے کہا۔ ”ایک کپ چائے اور ہو جائے۔ اس کے بعد چلتے ہیں بازار۔“  
 ریمنا نے کچن کا رخ کیا۔ چائے پینے کے بعد وہ دونوں گھر سے روانہ ہوئے۔ شاپنگ میں ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ پھر انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔  
 گھر کی طرف واپس آتے ہوئے زید نے کہا۔ ”تم اپنا استعفا آج ہی لکھ لیتا۔ صبح دفتر جاؤں گا تو لیتا جاؤں گا۔“  
 ریمنا چوگی۔ ”کیا مطلب؟“  
 ”اب تم ملازمت نہیں کرو گی۔“  
 ریمنا کو یاد تھا کہ نوشابہ نے بھی شادی کے بعد فوراً ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اس کی ملازمت بھی زید نے ہی چھڑوائی ہوگی۔

”گھر پر ایسی پڑی کیا کروں گی؟“ وہ بولی۔  
 ”گھر میں انسان اپنے لیے بہت سے مشغلے کر سکتا ہے۔ گانے سنو، فلمیں دیکھو، وڈیو گیمز کھیلو۔ انٹرنیٹ بھی استعمال کرو۔ فیس بک پر بھی اچھا وقت گزر سکتا ہے۔ اپنی دوستوں کو بھی بلا سکتی ہو۔ خود بھی کسی دوست سے ملنے جا سکتی ہو۔ ارے ہاں! ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ کل تمہارے لیے نئی کار بھی آجائے گی۔“  
 ریمنا ہنسی۔ ”کیا کیا کرو گے میرے لیے؟“  
 ”کسی فلمی ہیرو کی طرح میں آسمان سے تارے تو ذکر لانے کی بات تو نہیں کروں گا۔“ زید نے ہنس کر کہا۔ ”باقی سب کچھ کرنا ہے تمہارے لیے۔“  
 ”شادی تو ہماری ایسے ہی ہوئی۔ جو بے تکلف دوست ہیں، انہیں تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ ان کی شکایت

دور کرنے کے لیے ان کی ایک دعوت تو کرنی چاہیے۔“  
 ”وہ تو کی ہی جائے گی۔ معلوم تو ہو جائے گا سب کو۔ میں تمہارا استعفا لے کر تو جاؤں گا ہی۔ سوالات تو مجھ سے ہی شروع ہوں گے اور میں یہ بات کسی سے چھپانا بھی نہیں چاہتا۔ کوئی جرم تو نہیں کیا ہے ہم نے!“  
 ”میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے میری محبت مل گئی۔“ ریمنا نے کہا اور اپنا سر زید کے شانے پر رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆  
 اسی دن ابصار نے زید کو پھر فون کیا۔ زید نے ہنس کر کہہ دیا۔ ”شادی کر کے کیا ایک دن کی چھٹی بھی نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال کل یعنی طور پر آؤں گا۔ چاہو تو سب کو بتا دینا کہ ریمنا سے میری شادی ہوئی ہے۔ اب وہ ملازمت بھی نہیں کرے گی۔ کل میں اس کا استعفا لے کر آؤں گا۔“  
 اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن زید اس کا استعفا لے کر دفتر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ہی ریمنا کے موبائل پر نیلم کی کال آئی۔

”میں کل ہی سے..... بے چین تھی تم سے باتیں کرنے کے لیے لیکن اس خیال سے فون نہیں کیا کہ تمہارے ساتھ زید بھی ہوگا۔“  
 ”ہاں۔ کل کے بعد سے اب تک ہم دونوں ساتھ ہی رہے ہیں۔ زید کے دفتر جانے کے بعد اب اکیلی ہوئی ہوں۔“  
 ”زید کو یہاں دیکھنے کے بعد ہی تمہیں فون کیا ہے۔“  
 ”میں خود بھی تم سے کچھ باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ زید نے میرے لیے کارلی ہے۔ آج ہی کسی وقت آجائے گی۔ کل تم سے دفتری اوقات میں ہی ملنے آؤں گی لیکن کسی اور جگہ!“

”نئی کار کے لیے مبارک باد!“  
 ”تھینکس ڈیر!“  
 ان دونوں میں مختصر بات ہوئی۔  
 ریمنا کے لیے نئی کار آگئی۔ اس شام بھی انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ نئی کار کی ڈرائیونگ ریمنا ہی نے کی۔ زید اس کے برابری سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ دفتر میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ وہ کسے کیا جواب دیتا رہا تھا۔  
 اس کے اگلے دن تین بجے ریمنا کی نیلم سے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوئی جو دفتر سے خاصا دور تھا۔ ملاقات کا وقت اور ریسٹورنٹ کا تعین فون پر کر لیا گیا تھا۔  
 ”شکایت ہے مجھے تم سے۔“ ریمنا نے چھوٹے ہی

## سنگین خاتمہ

کہا۔ ”نوشابہ کو تم نے ہی بتایا ہوگا کہ میں اور زید شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔“  
 ”کیا یہ تمہیں نوشابہ نے بتایا ہے؟“ نیلم نے عجیبگی سے پوچھا۔  
 ”اس نے دانستہ نہیں بتایا۔ بس ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا اس کے منہ سے جس سے یہ بات ظاہر ہو گئی۔ زید کا خیال ہے کہ یہ بات نوشابہ کو ابصار نے بتائی ہوگی۔“  
 ”لیکن دفتر میں اس نے ابصار سے کچھ نہیں کہا۔“  
 ”وہ اس بات کی وجہ سے تعلقات میں کمی نہیں لانا چاہتا ہوگا۔“

”یہی بات ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اس کے مزاج کے خلاف ضرور ہے۔ وہ بہت معمولی باتوں پر لوگوں سے خفا ہو جاتا ہے۔“  
 ”خیر، اسے چھوڑو۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں زید کے لیے سب کچھ برداشت کر لوں گی لیکن تم نے چاہا کہ ہماری شادی نہ ہو۔“

”میں چاہتی تھی کہ تم مستقبل میں پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں تمہاری بھلائی چاہتی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بہت جذباتی ہو رہی ہو اس لیے میں تمہیں کچھ بھی بتاؤں زید کے بارے میں، تم شادی کر کے ہی مانو گی۔ اسی لیے میں نے چاہا تھا کہ نوشابہ واپس چلی جائے تو تم زید سے شادی نہیں کر سکو گی۔ خیر! اب تو جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب میری دو ایک باتیں اور سن لو میں تمہیں زید کے مزاج سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ تم وہ غلطیاں نہ کرو جو زید کے مزاج پر گراں گزریں گی۔ اب یہ میں نہیں جانتی کہ تم میری باتوں پر اعتبار کرو گی یا نہیں۔“

”اب تو کر لوں گی۔“ ریمنا نے کہا۔ ”تمہاری ایک بات بالکل سچ ثابت ہو چکی ہے۔ زید کو لڑکی کا باپ بننا گوارا نہیں۔“  
 ”اسے اور بھی کئی چیزیں گوارا نہیں۔“  
 ”وہ بھی مجھے بتا دو نیلم! میں ہر بات کا خیال رکھوں گی۔ میں زید کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔“  
 ”کن کن باتوں کا خیال رکھو گی ریمنا!“  
 ”ہر بات کا خیال رکھوں گی۔ میں نے کہا نا، میں زید کو کھونا نہیں چاہتی۔“  
 ”ایک وعدہ کرو، حالانکہ تم ایک..... اچھا خیر،



”جہنم ختم کر دیا ہو تو وہ لاش اس کے علم میں آگئی ہو۔“  
 ”زید تو یہ بات اسے ہرگز نہیں بتا سکتا۔ کہیں ایسا تو  
 نہیں کرنا ہوتا ہے شادی کرنے کے بعد بھی اس نے کوئی گناہ  
 کیا ہو؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

نیلیم کو پھر تینس کورٹ کا خیال آ گیا تھا جو زید بنواتا چاہتا تھا۔ وہیں اس نے ایسی جگہ بھی دیکھی تھی جو کھد کر بند کی گئی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ وہاں بھی کوئی لاش دفن ہو جسے ہمیشہ کے لیے چھپانے کے لیے زید وہاں تینس کورٹ بنواتا چاہتا ہو؟

یہ خیال اس کے دماغ میں تو آیا لیکن اس نے نیلیم سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔

”نو شاہ کے پاس تم ابصار کے ساتھ گئی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”دو تین دن کے بعد خیال آیا ہے ہمیں اس کا؟“

”یہ دن تو تمہاری محبت کی سرشاری میں گزر گئے۔“

”تو کچھ دن میں وہ سرشاری ختم ہو جائے گی؟“

”کیسی باتیں کرنے لگے تم زید؟“ ریمہ اپنی جگہ سے اٹھ کر زید کے پہلو میں جا بیٹھی۔ ”دو تین صدیاں بھی میری سرشاری ختم نہیں کر سکتیں۔ بس وہی ابجھن اس لیے ہوئی کہ آج میں ذرا دیر کے لیے سو گئی تھی والدہ خواب میں نظر آئی تھیں۔ وہ دونوں امریکا سے واپس آ جا عیں اور والدہ سے ایک بار بات ہو جائے تو یہ ابجھن بھی ختم ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“  
”یہ شب زید کو بھی ہوا ہے۔“  
”وہ تو ہوگا۔ مجھے اس سلسلے میں تشویش ہے۔ البصار کے لیے بھی زید کے دل میں گہر پڑ گئی ہوگی۔“  
”تم نے مجھ سے پہلے اس قتل کی بات کسی کو نہیں بتائی؟“  
”نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں۔ اگر وہ میری وجہ سے قانون کی زد پر آیا تو میں ممکن ہے کہ ضمانت پر رہا بھی ہو جائے۔ اس صورت میں وہ میری جان کا بھی دشمن ہو جائے گا۔ اب مجھے سوچنا ہوگا کہ البصار کو کس طرح سمجھاؤں کہ وہ زید کے معاملے میں محتاط رہے۔ کیا جواز پیش کروں گی اس کا۔ یہ تو شاید مناسب یا ممکن نہیں کہ میں اسے بھی قتل کے بارے میں بتا دوں۔“

”صرف میری خاطر تم دونوں نے یہ پریشانی مول لی ہے۔ میں تم دونوں کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

فیلم کچھ نہیں بولی۔ اب وہ بھی پریشان نظر آنے لگی تھی۔

”کون آرہا ہے..... کون تھا؟“ ریمانے پوچھا۔

”ڈی ایس پی ہے ایک۔ اشرف نام ہے۔“

”پولیس!“ ریمانہ کچھ بھڑایا ہوا تھا۔

☆☆☆

اسی دن گھر پر ریمیا اور زید شام کی چائے پی رہے تھے۔ زید نے کہا۔ ”میں نے بات کر لی ہے۔“

”کیا!“ ریمیا اس طرح چونگی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

”تم تو پریشان ہو گئیں!“ زید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پولیس میں بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں میرے۔ ان لوگوں کو اگر کسی سلسلے میں کچھ معلومات درکار ہوتی ہیں تو یہ اکثر مختلف جرنلسٹوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ اچھے جرنلسٹوں کو پولیس سے زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔“

زید نے اسے غور سے دیکھا، پھر بولا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تم کل سے مختلف نظر آ رہی ہو۔ میں دوبارہ محسوس کر چکا ہوں کہ تم کسی خیال میں گم ہو جاتی ہو۔“

”وہ..... وراثت..... والدین آج بہت یاد آ رہے ہیں۔“ ریمانا نے بات بتائی۔

تمہیں یہ بات بتانے بیٹھی ہے۔“  
 ”یعنی..... یعنی کمرہ..... تم.....“ رہا ہکلا گئی۔  
 ”نوشاہے پہلے اس نے تم سے شادی کی تھی؟“  
 ”ہاں۔“ نیلم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اور پھر اس  
 شخص کی لاش اپنے عقبی لان میں دفن کر دی گئی۔ بعد میں اس  
 جگہ پودوں کا ایک جھنڈ بھی بڑی خوب صورتی سے بنوایا

تھا۔ خوب صورتی سے جھنڈ بنانا اس کے ہالی کا کمال تھا۔“

رہا کو ایسا محسوس ہوا جیسے خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا ہو۔ وہ ایک دن پہلے ہی عقبی لان میں پودوں کا ایک جھنڈ دیکھ چکی تھی۔

”میں ابصار کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔“ نیلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن یہ باتیں نے اسے بھی نہیں بتائی۔“

”نفل کسے کیا تھا؟“

رہا کو اس ٹینس کورٹ کا خیال آیا جو زید اپنے گھر کے لان میں بنوانا چاہتا تھا جس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ وہ گھر میں ہی ٹینس کھیلا کرے۔

نیلم نے مزید کہا۔ ”اگر کسی مرد نے تمہاری تعریف کر دی تو کچھ قیامت ہی آجائے گی۔“

”..... تو..... میرے اختیار کی بات نہیں کہ کسی کو اپنی تعریف کرنے سے روکوں۔ میں زید کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہوں لیکن مجھے کیا معلوم کہ کوئی شخص کب میری

”کلب میں کوئی ملا تھا۔ وہ اور زید ایک دوسرے کے دوست تو نہیں تھے لیکن ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس شخص نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ وہیں کے اثرات تھے جو اس نے میری تعریف کر دی۔ یورپ کے لوگ تو کسی سے اپنی بیوی کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ کسی سے اپنی بیوی کی تعریف سن کر لوگ برا مان جاتے ہیں۔ بس یہ نہیں ہوتا کہ وہ تعریف کرنے والے کو قتل کر دیں۔ زید کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہے۔“

”اگر میں پودوں کا وہ جھنڈ کھدوا دوں؟“  
”تو تمہیں وہاں ایک انسانی خنجر ملے گا، یا شاید صرف ہڈیاں ملیں کیونکہ اس شخص کو دفن ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد زمین میں دبی ہوئی لاش کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔“  
”تم نے مجھے بڑی خوف ناک بات بتائی ہے۔“

”تم وہ جھنڈ کھدا نہیں سکتیں۔“ نیلم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”زیر تمہیں ایسا کرنے ہی نہیں دے گا۔ وہ تم سے کہے گا کہ اتنی خوب صورت چیز کیوں تباہ کرنا چاہتی ہو۔“

”اس سے طلاق تم نے لی تھی یا اس نے وہی تھی؟“  
جواب میں نیلم نے اسے بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو  
ابصار کو بتانا چاہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”نوشتہ پر تو مجھے حیرت  
ہے کہ اس نے ایک طویل عرصہ زید کے ساتھ گزار لیا۔ نہ  
جانے کیا کچھ برداشت کیا ہوگا اس نے تم شاید نہ رسکو۔“  
”وہ کیا تھیں ہیں؟“ ریمانے پریشانی سے پوچھا۔  
”اب مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔“ ریمانے کہا۔  
”نوشتہ نے زید کے کمرے سے جاتے وقت اسے دھکی دی  
تھی۔ کہا تھا کہ اگر زید نے اسے طلاق دی تو وہ بھی بھر کچھ  
بھی کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہو سکتا  
ہے کہ وہ لاٹھیاں مار ڈالے گی؟“  
”یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس نے بوزوں کا



ہو جائے گا۔" ریمہ کھڑی ہو گئی۔  
 "اچھا، جو تمہارا دل چاہے کرو۔" زید نے ہنس کر کہا۔  
 ☆☆☆  
 ریمہ دوسرے دن شام کو گھر سے نکلی تھی۔ اسے بچن کے لیے کچھ خریداری کرنی تھی مگر شہر روز اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں کچھ خاص چیزیں نہیں تھیں۔ ان میں دو ایک ایسی چیزیں بھی تھیں جو نوشاہہ استعمال ہی نہیں کرتی ہوگی لیکن ریمہ جو دو ایک خاص ڈشز بناتی تھی، ان کے لیے دو چیزیں ضروری تھیں۔ سب کچھ خریدنے میں ایک گھنٹہ لگا پھر وہ واپسی کے لیے اپنی کار میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی کھنکھائی۔ اسکرین پر اس نے نیلم کا نام دیکھا۔  
 "ہیلو!" اس نے رسلبرسکی۔ "کیا بات ہے نیلم!"  
 "تم کہاں ہو؟" نیلم کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔  
 "کیوں؟ کیا بات ہے؟"  
 "گھر پر ہونا؟"  
 "نہیں۔ کچھ خریداری کرنی تھی۔" ریمہ نے جواب دیا۔ "مارکیٹ میں ہوں، بلکہ روانہ ہو رہی ہوں۔ کار میں بیٹھ چکی ہوں۔ آخر کیا بات ہے؟ تم گھبرائی ہوئی کی لگ رہی ہو۔"  
 "تم نے آج مجھے اور البصار کو اچانک کھانے پر بلایا ہے؟ یعنی ابھی؟"  
 "نہیں تو۔"  
 "اوہ گاڈ!" نیلم کے منہ سے نکلا۔  
 "یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے تمہیں اور البصار کو....."  
 "میں بتاتی ہوں۔" نیلم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی کار اسٹارٹ کر کے اپنے گھر روانہ تو ہو۔ جلدی پہنچنا ہے تمہیں گھر۔ تم کار چلاؤ۔ میں بتاتی ہوں۔"  
 ریمہ نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا اور کار حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔ "ہاں اب بولو..... میں روانہ ہو چکی ہوں۔"  
 "میں آج دفتر نہیں آتی تھی۔ والدہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ کمرہ پرانی میں نہیں رہتیں۔ میں انہیں دیکھنے چلی گئی تھی۔ ابھی گھر لوٹی ہوں۔ یہاں مجھے البصار کا پرچہ ملا ہے۔"  
 "البصار کا پرچہ تمہارے گھر پر؟" ریمہ نے حیرت سے کہا۔  
 "البصار ہی کے گھر پر۔ اب یہی میرا گھر ہے۔ اچھے ہوئے حالات کے باعث ہم دونوں بھی اچھے ہوئے تھے۔ سوچا یہ تھا کہ کسی ہوٹل میں تمام دوستوں کو جمع کر کے تقریب کے دوران اعلان کریں گے کہ ہم دونوں نے شادی کر لی

آرچر اور ایڈ فورڈریمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 "غلط سمجھ رہے ہیں آپ۔" زید بول پڑا۔ "یہ میری دوسری بیوی ہیں۔ میں جن کی بات کر رہا ہوں، وہ آج کل اپنے والدین کے پاس کئی ہوئی ہیں۔"  
 "تو کیا....." ڈی ایس بی اشرف بولا۔  
 زید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ سوچے۔ طلاق کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ بس کچھ دن کے لیے اپنے والدین کے ساتھ وقت گزارنے چلی گئی ہیں۔ وہی کچھ بتا سکتی ہیں مسٹر بیرٹن کے بارے میں۔ کیسینو میں ان سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی۔"  
 آرچر اور ایڈ فورڈ نے کچھ سوالات اور کیے۔ زید اطمینان سے ان کے جوابات دیتا رہا۔ ریمہ نے سکون محسوس کیا۔ فوری طور پر اسے خیال آیا تھا کہ کہیں بیرٹن کا قاتل بھی زید تو نہیں۔  
 دس منٹ تک سوال و جواب کے بعد آرچر نے کہا۔  
 "ہم آپ کی بیوی سے بھی ملنا چاہیں گے۔ ہمارا مطلب ہے وہ جو آپ کے ساتھ بیٹرس کئی تھیں۔"  
 "کسی وجہ سے وہ فوری طور پر یہاں نہیں آسکتیں۔"  
 زید نے کہا۔ "میں آپ کو ان کا پتا دے دیتا ہوں۔ وہاں جا کر ہی آپ ان سے مل سکتیں گے۔"  
 "کوئی حرج نہیں۔ ہم چلے جائیں گے۔"  
 زید نے انہیں نوشاہہ کے والد کے گھر کا پتا دے دیا۔ اس دوران میں زید نے ان کی تواضع کی۔ انہوں نے صرف ایک ایک ڈرنگ لی۔  
 ان لوگوں کے جانے کے بعد ریمہ بولی۔ "میں تو ڈر گئی تھی کہ نہ جانے کیا معاملہ ہے..... اب نوشاہہ انہیں نہ جانے کیا بتائے۔"  
 "جو جانتی ہوگی، وہی بتا دے گی۔ تم مت سوچو اس بارے میں۔"  
 "چلو نہیں سوچتی۔" ریمہ نے مسکرانے کی کوشش کی ورنہ نیلم سے بات کرنے کے بعد اس کے وجود سے مسکراہٹ کا سفر شاید غائب ہی ہو گیا تھا۔  
 "اب آج سے ریٹائرمنٹ باڑی ختم..... اب میں کچن سنبھالوں گی۔"  
 شادی کے بعد سے اب تک وہ ریٹائرمنٹ میں ہی کھانا کھاتے رہے تھے۔  
 "اب تو خاصا وقت ہو گیا ہے۔ کل سے سنبھالنا۔"  
 "ابھی تو خاصا وقت ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں سب

مجھ سے ملے آیا ہے تو نوشاہہ کبھی اس کے سامنے نہیں آئی۔"  
 "تو میں بھی اندر چلی جاؤں گی۔"  
 "نوشاہہ خود ہی نہیں آئی تھی ڈرائنگ روم میں۔ میں نے اسے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ تم سے بھی نہیں کہوں گا کہ چلی جاؤ۔ بیٹھو اطمینان سے۔"  
 زید نے بڑے اطمینان سے باتیں کی تھیں لیکن ریمہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔  
 آدھے گھنٹے سے بھی کچھ کم وقت میں نہ صرف ڈی ایس بی اشرف وہاں موجود تھا بلکہ اس کے ساتھ دو یورپین بھی تھے۔ تین پولیس کا فٹبیل بھی ان کے ساتھ آئے تھے لیکن انہیں باہر چپ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔  
 "مائی سز۔" زید نے تعارف کرایا۔ "اور یہ ہیں میرے کرم فرماؤ ڈی ایس بی اشرف۔" وہ انگریزی میں بولا تھا تا کہ یورپین بھی سمجھ سکیں۔  
 ڈی ایس بی اور ریمہ میں رکی جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر ڈی ایس بی نے یورپین کا تعارف کرایا۔ "یہ مسٹر آرچر ہیں۔ اور یہ مسٹر ایڈ فورڈ۔ آج ہی فرانس سے آئے ہیں۔"  
 "اوہ!" زید مسکراتا رہا۔ "ابھی کچھ ہی دن پہلے میں فرانس سے آیا ہوں۔"  
 "یہ اسی لیے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ وہاں ایک اہم شخص مسٹر بیرٹن کا قاتل ہو گیا تھا۔ یہ اسی کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ قاتل کے بعد کی چند فلائش میں کتنے غیر ملکی بیٹرس سے اپنے وطن گئے ہیں۔ اس قاتل کے سلسلے میں ان سب سے پوچھ گچھ کی جائے گی کہ شاید ان کی کسی بات سے قاتل کا کوئی سراغ مل سکے۔"  
 "یا انہی میں سے کوئی قاتل ہو؟" زید نے ہنس کر کہا۔  
 ڈی ایس بی ہنسا۔ "اب یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات کے دل میں کیا ہے۔ یہ تو یہی بتا سکتے ہیں۔"  
 آرچر اور ایڈ فورڈ مسکراتے لگے۔ ادھر نیلم کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔  
 "آپ نے شاید مسٹر بیرٹن کا نام تو سنا ہوگا؟"  
 آرچر بولا۔ "ان کی کوئی نہ کوئی خبر دوسرے تیسرے دن اخبار میں آتی رہتی تھی۔"  
 "آپ مسٹر بیرٹن اسکاٹ کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟"  
 "جی ہاں وہی۔"  
 "ان سے میری ایک ملاقات ہوئی تھی ایک کیسینو میں۔" زید نے کہا۔ "البتہ میری بیوی انہیں جانتی تھیں۔ جب وہ وہاں زیر تعلیم تھیں تو مسٹر بیرٹن ان کے کلاس فیلو تھے۔"

"یہ..... کیا بات ہوئی۔" ریمہ نے کہا۔ "مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا زید نے۔ اس نے البصار کو اس وقت فون کیا ہوگا جب میں مارکیٹ روانہ ہوئی تھی۔"  
 "یہ اور خطرناک بات ہے۔ اس نے البصار کو تنہائی میں بلایا ہے۔ خدا خیر کرے۔ تم جلدی گھر پہنچو، میں بھی روانہ ہوئی ہوں بلکہ روانہ ہو چکی ہوں۔ یعنی گھر سے نکل آئی ہوں اور کار کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ تم کس مارکیٹ میں ہو؟"  
 ریمہ نے مارکیٹ کا نام بتایا۔  
 نیلم بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم دس منٹ میں پہنچ جاؤ گی۔ مجھے بھی پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔ ایک بات اور بتا دوں۔ پرچے کے آخر میں البصار نے وہ وقت بھی لکھا ہے جب اس نے پرچہ لکھا تھا۔ وہ وقت اب سے بارہ منٹ پہلے کا ہے۔ وہ تمہارے گھر پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ تم جلدی پہنچو ریمہ! وہاں نہ جانے کیا کل عمل جائے۔"  
 ریمہ نے نیلم کی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔  
 "تم نے البصار کو یہ نہیں بتایا تھا کہ زید ایک قاتل بھی کر چکا ہے؟"  
 "نہیں۔" نیلم نے جواب دیا۔ "میں نے تم سے کہا تھا تا کہ یہ بات میں البصار کو بھی نہیں بتا سکتی۔ تمہارے سامنے بس زبان پھسل گئی تھی میری۔ اب اس وقت میں سمجھتا رہی ہوں۔ اگر البصار کو بتا دیتی تو وہ محتاط رہتا۔"  
 "دعا کرو کہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ میں بہت تیزی سے کار چلا رہی ہوں۔ میرے سامنے تو زید کوئی زیادتی نہیں کرے











نیلیم سے پہلے ابصار بول پڑا۔ ”کم از کم میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا ہوگا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس نے مجھے بلا کر میرا کیا حال کیا تھا۔ اب بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔“

”ہوں۔“ ڈی ایس پی کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ ”تو میں بتا رہا تھا کہ گیٹ پر پہنچتے ہی مجھے ہنگلے سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ پھر میں پولیس والوں کے ساتھ یہاں بے تحاشا ہی گھس پڑا اور یہاں میں نے جو کچھ دیکھا، وہ بھی میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔“ ڈی ایس پی نے اب ابصار کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا بیان ہے کہ آپ نوشاہہ صاحبہ سے اس کی صلح کروانا چاہتے تھے اور کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر ان کے گھر چلے گئے تھے اس لیے وہ آپ کی جان لینے پر تل گیا تھا۔“

”جی۔“ ابصار نے آہستہ سے کہا۔

”میری تحقیقات کے مطابق آپ اس کی پہلی بیوی ہیں یا نہیں۔ آپ میرے منہ سے یہ بات سن کر اس کا اعتراف بھی کر چکی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کچھ محسوس نہیں کیا؟“

”کم از کم اس حد تک تو محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی کا قاتل ہوگا۔“ نیلیم نے جواب دیا۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اسے اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھنی ہوگی ورنہ اسے اعانت جرم میں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور اسے سزا بھی مل سکتی ہے۔

ڈی ایس پی پھر کچھ سوچنے لگا تھا کہ نیلیم پھر بول پڑی۔ ”ریماء کے سلسلے میں آپ کیا کریں گے؟“

”انہیں گرفتار تو کیا جائے گا۔ مقدمہ تو چلے گا ان پر لیکن آپ نے جو حالات بتائے ہیں، ان کی روشنی میں تو نتج کی جاسکتی ہے کہ عدالت انہیں کوئی سزا نہ دے۔“

”اس حالت میں اسے گرفتار کریں گے؟“ نیلیم کی آواز بھر گئی۔

”ممکن ہے اتنی دیر میں اس نے سنبھال لے لیا ہو۔“

”ابھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر انہیں گرفتار کر کے ہاسپٹل اسی لیے نہیں بھیجا ہے ابھی کہ شاید وہ سنبھل جائیں اور میں یہیں ان کا بیان لے لوں۔ آئیے چل کر دیکھتے ہیں۔“

ڈی ایس پی کے ساتھ وہ دونوں بھی اٹھے۔ پھر وہ جس کمرے میں داخل ہوئے، وہ زید کا بیڈروم تھا۔ ریماء بستر پر چٹ لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل ساٹ تھا۔

”ریماء!“ نیلیم نے اسے پکارا۔

ریماء نے آہستگی سے سر اٹھا کر ان تینوں کی طرف

دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان میں سے کسی کو بھی نہ پہچانتی ہو۔

”ریماء!“ نیلیم نے اس کے قریب جا کر اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”میں نیلیم ہوں ریماء!“

ریماء اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھی کوشش نہیں کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیلیم نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ابصار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی وقت ایک کانشیل نے اندر آ کر اطلاع دی۔

”سر! ایک صاحبہ آئی ہیں۔ ایک بڑی عمر کی خاتون اور ایک مرد بھی ان کے ساتھ ہیں۔ وہ اپنا نام نوشاہہ بتا رہی ہیں اور روتی بھی جا رہی ہیں۔“

نیلیم نے ہی فون پر نوشاہہ کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ اب ساری عمر رونا ہی نوشاہہ کا مقدر بن چکا تھا۔ اس کے دل سے زید کی محبت ختم نہیں ہوئی تھی۔

ریماء کو پولیس اسی وقت اپنے ساتھ لے گئی۔ اسی رات پودوں کا جھنڈ بھی کھود ڈالا گیا تھا اور وہاں سے بھی ایک لاش ملی تھی۔

”ہمارا کام اب بھی ختم نہیں ہوا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”اب یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ ان دونوں کو کیوں قتل کیا گیا تھا اور وہ کون تھے۔“

لان سے کوئی تیسری لاش نہیں ملی تھی۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ عدالت نے ریماء کو کسی بھی قسم کی سزا نہیں دی تھی۔

عدالت سے ہی نیلیم اور ابصار اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس کے والدین کو بھی اس کی اطلاع اس وقت دے دی گئی تھی جب وہ امریکا سے لوٹے تھے۔ حالات جان کر ماں کا جگر تو گویا پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہ ریماء کی زندہ لاش اپنے گھر لے گئے تھے۔ نیلیم اور ابصار کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ریماء کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ سکتے۔

نیلیم اور ابصار بھی خاصے دن تک اس کے لیے افسردہ رہے۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ نوشاہہ کے لیے بھی..... اس کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ اپنا خاص وقت زید کی قبر پر گزارا کرتی تھی۔

ریماء بھی خود فراموشی کی کیفیت سے کبھی باہر نہیں آسکی۔